میرزا ادیب

نام کتاب ——— ساتواں چراغ

مصنف ——— محرز ادیب

طبع اوّل ——— ۱۹۸۳ء

تعداد ——— ایک ہزار

مطبع ——— خورشید پرنٹرز لمیٹڈ، اسلام آباد

ناشر ——— زاہد ملک

قیمت ——— ۴۰/- روپے

پیش لفظ

میرزا ادیب کی شخصیت اور فن کے کئی پہلو ہیں۔ ان کی تصانیف کی فہرست طویل ہے۔ افسانہ، ڈرامہ، تنقید، ترجمہ اور کالم نگاری میں انہوں نے اُردو ادب کی گراں بہا خدمات سرانجام دی ہیں۔ اور اپنی زندہ روح، متحرک ذہن اور وسیع تخیل کے ساتھ ادب کی دنیا میں گراں بہا اضافے کئے ہیں۔ انہوں نے بہت سی اصنافِ سخن کی روایات کو آگے بڑھایا ہے اور انہیں وسعت، گہرائی اور تنوع سے آشنا کرایا ہے۔

میرزا ادیب کے اکثر افسانوں میں زندگی کی سچائی اور فن کے خلوص کی تاثیر نظر آتی ہے۔ ان کے ہاں زندگی اور فن میں باہمی ربط کچھ یوں ملتا ہے کہ افسانہ اور زندگی کو ایک دوسرے سے الگ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ زندگی کی حقیقتیں افسانہ کو دلکش بناتی ہیں، اُدھر افسانہ مثبت قدروں کی ترویج کا ایک مؤثر ذریعہ بنتا ہے۔ وہ جیتے جاگتے کرداروں اور معاشرتی قدروں کو خوبصورت پیرائے میں بیان کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک سب سے اہم چیز زندگی سے وابستگی ہے۔ جس معاشرے کا وہ عکس پیش کرتے ہیں، وہ ہمارے چاروں طرف پھیلا ہوا نظر آتا ہے۔ زیرِ نظر مجموعے "ساتواں چراغ" کے کم و بیش تمام افسانے زندگی اور فن کے حسین امتزاج کا خوبصورت مرقع ہیں۔ تاہم "امانت" "ریڑھی" "بندگلی کا مسئلہ" "عنایت بی بی کا افضال" میں ہمیں زندگی کی حقیقتیں اپنی پوری جزئیات کے ساتھ دھڑکتی نظر آتی ہیں۔

میرزا ادیب کے افسانوں کا پس منظر، انسانی فطرت اور معاشرتی زندگی کے ایسے مظاہر ہیں جو صرف گہرے مشاہدے سے فنکار کے تجربے کا جزو بن سکتے ہیں۔ ایک دو افسانوں سے قطع نظر، انہوں نے اپنی کہانیوں میں خیالی یا تصوراتی دنیا بسانے کی بجائے ٹھوس اور

زندہ حقیقتوں سے سروکار رکھا ہے۔ اور ان حقیقتوں کا ادراک انہوں نے اپنے عہد کے معاشرے سے حاصل کیا ہے۔ وہ صرف ان حقائق کو اپنے افسانے کا موضوع بناتے ہیں۔ جن سے ان کا قریبی تعلق ہوتا ہے۔ اور جن کا مشاہدہ انہوں نے قریب سے کیا ہوتا ہے۔ ان کے افسانے "سائرہ" "علیا کی گلی" اور "کاغذ کی ناؤ" فنی تقاضوں کو بھی پورا کرتے ہیں۔ اور حقیقتوں کے ادراک میں بھی نمایاں کردار ادا کرتے ہیں۔ "سائرہ" میں 'سائرہ' اور بڑے میاں دونوں مصلحت آمیز جھوٹ کا ارتکاب کرتے ہیں۔ مگر معصومیت کا یہ عالم ہے کہ دونوں پر بے اختیار پیار آنے لگتا ہے۔

میرزا صاحب نے متوسط گھرانوں کے ماحول اور مسائل سے ہمیں روشناس کرایا ہے اور اپنے پڑھنے والوں میں یہ احساس پیدا کیا ہے۔ کہ ان گھرانوں میں سانس لینے والی زندگی میں تنوع بھی ہے اور دلکشی بھی۔ اس میں معاشرت، اخلاق اور رومان کے بے شمار مظاہر اور عکس موجود ہیں اس ماحول میں انہوں نے حسرت و یاس کے مرقعے تلاش کئے ہیں اور ان میں اپنے دل کی تڑپ کسک اور درد و غم کی تاثیر شامل کر کے دوسروں کو بھی اپنا مونس و غمخوار بنایا ہے۔ ان کے افسانے جہاں ایک طرف متوسط طبقے کی معاشرتی اور خانگی زندگی کے مبصرانہ مرقعے ہیں۔ وہاں دوسری طرف فن کے حسن و جمال اور سحر کاری کے دل نشیں نمونے بھی ہیں۔ وہ معاشرتی زندگی کی پیچیدگیوں میں ایسے موضوع نکال لیتے ہیں، جنہیں دوسرے غیر اہم سمجھ کر چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ معمولی سے معمولی موضوع میں فطرتِ انسانی کے ایسے مظاہر دیکھتے ہیں کہ زندگی کی معمولی سی حقیقت بھی بڑی اہم معلوم ہوتی ہے۔ انہیں یہ بھی احساس ہے کہ زندگی کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا گوشہ بھی ایسا نہیں جس میں اچھے افسانے کے امکانات پوشیدہ نہ ہوں۔ موضوع کے انتخاب میں بھی ان کے یہاں بڑا تنوع ہے۔ ان کا موضوع ایک ہی وقت میں فرد بھی ہے اور معاشرہ بھی۔ داخلی کیفیتیں بھی ہیں اور خارجی مظاہر بھی۔ "گریٹ مین" "اس کی خاطر" "درویش" چند ایسے افسانے ہیں، جو قاری کے ذہن پر لازوال تاثر مرتب کرتے ہیں۔

کردار نگاری کے فن میں بھی میرزا صاحب کو مکمل دسترس حاصل ہے۔ انہوں نے

اپنے کرداروں کا مطالعہ اور مشاہدہ بڑی باریک بینی اور شدت سے کیا ہے اور اس مشاہدے اور مطالعے کے بحران میں سے ہر ایک کو اپنے تخیل میں بسایا اور فکر سے نکھارا اور اور اونچا کیا ہے۔ انہوں نے عموماً روایت اور جدت کو پوری طرح ہم آہنگ کرنے کو اپنا فنی مسلک بنایا ہے۔ ان کے افسانوں میں جدت اور روایت دونوں کے ڈانڈے ملتے ہیں۔ دونوں کو حیات ابدی ملتی ہوتی معلوم ہوتی ہے۔

میرزا ادیب پوری کوشش سے اپنی بات کے اظہار کے لئے اچھے سے اچھا اسلوب تلاش کرتے ہیں۔ مشاہدہ میں وہ جزئیات کی جستجو میں کامیاب دکھائی دیتے ہیں۔ ان کا فن ان کی شخصیت کے انفرادی اور امتیازی عناصر کے رچاؤ سے پیدا ہوتا ہے۔ اور اس طرح ان کے منفرد فکری، تخیلی، جذباتی انداز اور موضوع و فن میں پوری طرح فکری ہم آہنگی نظر آتی ہے۔ "ایک منزل کئی راستے" ان کا شاہکار افسانہ ہے اور فن کے تمام تقاضے پورے کرتا ہے۔ ان کا اسلوب حد درجہ شگفتہ ہے اور رومانیت کی ہلکی سی چاشنی تحریر کا لطف دو بالا کرتی ہے۔ افسانہ "گریٹ مین" میں نوراں کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

"شاید وہ (نوراں) اس تاریکی میں کسی ایسی کرن کی تلاش میں تھی جو اس کی آنکھوں کے راستے دل میں اتر جائے۔"

"اپنے افسانے" سائرہ "میں بوڑھے کے بارے میں یوں لکھتے ہیں:

"نہ تو طلوعِ آفتاب سے پہلے جہاں تہاں بکھرے ہلکے اُجالوں سے اسے کوئی دلچسپی تھی، نہ غروبِ آفتاب کے بعد بلندیوں سے اُترتے ہوئے شفق آلود دھندلکوں کو وہ پُرشوق نظروں سے دیکھتا تھا۔"

ایک اور افسانے "ایک منزل، کئی راستے" میں اُن کے قلم کی جولانیاں ملاحظہ ہوں:

"راشد نے کرسی پر بیٹھ کر مریضہ کی طرف غور سے دیکھا۔ لڑکی کیا تھی۔ سنگ مرمر سے ترشی ہوئی ایک گڑیا تھی۔ سیاہ زلفیں رخساروں کو چھو رہی تھیں۔ اس طرح آہستہ آہستہ سانس لے رہی تھی کہ تنفس کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا۔"

"کاغذ کی ناؤ" میں سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمایئے:

"فصیحہ خاموش تھی۔ اس کے ہونٹ ایک لرزشِ خفی سے آہستہ آہستہ کانپ رہے تھے۔ اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں اور پلکوں پر سائے سے لرزتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔"

مرزا ادیب کے ہاں گاہے گاہے پُراسرار قسم کے کرداروں سے بھی پالا پڑتا ہے۔ افسانہ "ساتواں چراغ" میں ہم اس قسم کی عبارت سے دوچار ہوتے ہیں:

"پانچویں جمعرات کو جب اس نے چراغ جلا کر مزار کے پہلو میں رکھا اور مدھم روشنی میں دُعا کے لئے ہاتھ پھیلائے تو اسے یکدم احساس ہوا کہ ایک سایہ اس کے قریب حرکت کر رہا ہے۔ اور اس احساس کے باوجود اس کے لرزتے ہونٹ ہلتے رہے۔"

"دونوں ہاتھ پھیر کر وہ مڑی۔ اس نے دیکھا کہ ایک جلتا ہوا چراغ مزار کے دوسرے پہلو کی طرف جھکا جا رہا ہے اور دوسرے ہی لمحے میں اسے ایک دُھندلا سا چہرہ دکھائی دینے لگا۔ جس کے گرد دوپٹہ لپٹا ہوا تھا۔"

میرزا ادیب نے روایت، مشاہدہ، تخیل اور تصور کی دکھائی ہوئی روشنی میں نئے نئے جہاں آباد کئے ہیں۔ ان کے افسانوں میں زندگی کے ساتھ ایک ربط اور تعلق پیدا کرنے کی جو نمایاں خواہش ہے۔ وہ ان کے افسانوں کے عنوان اور موضوع کے انتخاب سے ظاہر ہے۔ ان کے ہر افسانے میں قدم قدم پر زندگی کی جھنکار سنائی دیتی ہے۔ ان افسانوں کے دامن میں آنسوؤں کے موتیوں کی بھی ویسی ہی کثرت ہے جو مسرت و شادمانی کے پھولوں کی۔ ان کے افسانوں میں زندگی کے ہر ہلکے سے ہلکے تنفس کی جھنکار سنائی دیتی ہے۔ انہوں نے انسان کے دل میں جھانک کر اس کے ہر چھوٹے بڑے راز کی غمازی کی ہے۔ ان افسانوں میں مشاہدہ، احساس اور فکر کی مکمل ہم آہنگی موجود

ہے۔ فنی انہماک اور توجہ کے ساتھ ساتھ بیان کی لطیف شعریت کا بڑا صحیح امتزاج ہے۔ ان کی مصوری میں فکر کی گہرائی، تخیل کی رنگینی اور موضوع کی سادگی اور نزاکت پوری طرح ہم آہنگ ہیں۔

کرنل غلام سرور (ستارۂ امتیاز ملٹری)

امانت

دسمبر کے آخری ہفتے میں بینکوں کا کام بہت بڑھ جاتا ہے۔ سٹاف کو سات آٹھ آٹھ بجے تک مصروفِ کار رہنا پڑتا ہے اور ضمیر احمد تو بنک کا برانچ مینجر تھا۔ اس کے عہدے کا تقاضا تھا کہ اپنے سٹاف کے ساتھ بیٹھے اور ہر کام اپنی نگرانی میں کرائے۔ اس کی بیوی رضیہ کو اس کا بخوبی علم تھا تاہم وہ پانچ چھ بجے ہی شوہر کو ٹیلیفون کر کے جلدی آنے کی تاکید کر دیتی تھی کہ بچے اس کے آنے سے پہلے سو نہ جائیں۔ بچے پانچ بجے سے باپ کا انتظار کرنے لگتے تھے۔ اس روز بھی رضیہ نے یہ جاننے کے باوجود کہ اس کے شوہر کا جواب کیا ہوگا اس سے آنے کا وقت پوچھ لیا۔

"بھئی جلدی کیونکر آسکتا ہوں؟ بے پناہ کام ہے۔ آج تو نو بجے آنا بھی بڑا مشکل ہے۔" ضمیر نے یہ اطلاع دے کر بیوی کو مایوس کر دیا۔ رضیہ ریسور رکھنے ہی والی تھی کہ ضمیر نے پوچھا: "آج کی کوئی خاص خبر؟"

"خبریں کیا ہوں گی؟ بچے بار بار پوچھتے ہیں ابو کب آئیں گے۔ اور تو کوئی خبر نہیں۔ ڈاک سے تین خط آئے ہیں۔"

"کس کس کا ہے؟"

"ایک کا ہینڈ رائٹنگ تو پہچانتی ہوں۔ آپ کے بھائی جان کا ہے۔ دوسرے میں دکاندار کا غالباً بل ہوگا۔ پرسوں شاپنگ کی تھی نا؟ اور تیسرے لفافے کے کونے میں الطاف امجد لکھا ہے۔ معلوم نہیں یہ صاحب کون ہیں۔

"کیا نام بتایا!" ضمیر کی آواز میں بے تابی سی تھی۔

"الطاف امجد!"

"میں آرہا ہوں!" اور ضمیر نے ٹیلیفون بند کر دیا۔

رضیہ نے اس لفافے کو غور سے دیکھا جس کی اطلاع پاکر اس کا شوہر چھ بجے ہی گھر پہنچ رہا تھا۔ بالکل عام لفافہ تھا ــــــ پتہ بھی عام انداز سے لکھا گیا تھا۔ البتہ خط بھیجنے والے نے کونے میں اپنا نام لکھ دیا تھا جو بالعموم نہیں لکھا جاتا۔

"کیا بات ہے اس کے اندر؟ یہ الطاف امجد کون ہے؟" جب سے اس کی شادی ہوئی تھی اپنے شوہر کے تمام احباب میں اس نام کا کوئی شخص اس کے علم میں نہیں آیا تھا۔ اسے اپنے شوہر پہ کامل اعتماد تھا۔ اس نے اپنی کوئی بات بھی کبھی اس سے چھپائی نہیں تھی، تو پھر یہ الطاف امجد کہاں سے آگیا! یہ ہے کون؟

وہ لفافہ ہاتھ میں لئے ٹیلیفون کے قریب ہی کھڑی رہی اور اس کے بچے تھوڑی دور پلنگ پر بیٹھے چپ چاپ ہوم ٹاسک میں مصروف رہے۔ تینوں بچے کنکھیوں سے ماں کو دیکھ لیتے تھے اور پھر اپنی اپنی کاپیوں پر جھک جاتے تھے۔

بوڑھی ملازمہ چراغ بی بی رات کے کھانے کے لئے میز صاف کر رہی تھی اور یہ دیکھ کر حیران ہو رہی تھی کہ اس کی مالکن نے ٹیلیفون پر کیا خبر سنی ہے کہ پریشان سی نظر آرہی ہے۔

ضمیر جب بھی گھر آتا تھا، دن یا رات کا کوئی بھی وقت ہو سیٹی ضرور بجاتا تھا، یہ اس کی پرانی عادت تھی۔ سیٹی کی آواز سن کر تینوں بچے اور ان کی ماں اس کے خیر مقدم کے لئے تیار ہو جاتے تھے، مگر اس روز کمرے کا دالان کھلا اور ضمیر اندر آگیا۔

رضیہ نے پہلی ہی نظر میں بھانپ لیا کہ اس کا شوہر کسی ہیجانی کیفیت میں گرفتار ہے۔

بچوں نے جو باپ کو آتے دیکھا، تو جھٹ قلم، کاپیاں، کتابیں چھوڑ چھاڑ کر ابو ابو کہتے ہوئے اس سے لپٹ گئے۔ بس ننھا رشید پرے کھڑا رہا۔ یہ اس کا معمول تھا، کیونکہ ضمیر آتے ہی خود اسے گود میں اٹھا لیتا تھا، مگر اس روز رشید اپنی جگہ ہی پر کھڑا رہا اور باپ نے اس پر سرسری سی نظر بھی نہیں ڈالی۔

"خط کہاں ہے الطاف امجد کا؟"

رضیہ اسے گھور گھور کر دیکھ رہی تھی۔ بولی: "کیا اس میں کوئی بہت بڑا راز ہے؟" اس کی پیشانی شکن آلود ہوگئی تھی۔

"نہیں اس میں کوئی راز نہیں ـــــ البتہ اس سے ایک کہانی وابستہ ہے" ضمیر نے کہا اور بیوی کے ہاتھوں کی طرف اس توقع سے دیکھنے لگا کہ ابھی یہ خط اسے مل جائے گا، مگر یہ دونوں ہاتھ خالی تھے۔

"خط، رضیہ!"

"خط آپ کے نام ہے۔ آپ ہی کو ملے گا لیکن آج یہ آپ کا رویہ! میں کچھ سمجھ نہیں سکی۔" رضیہ نے سر کو جھٹکا دے کر ماتھے پر آجانے والی لٹ کو پیچھے ہٹایا اور رشید کو غور سے دیکھا۔ ضمیر کو اپنی غلطی کا احساس ہوگیا اور اس نے بچے کو گود میں اٹھالیا۔ معذرت کے انداز میں کہا "رضیہ، بھئی۔۔۔۔"

"کہہ تو رہا ہے، خط آپ کا ہے۔ میں کون ہوتی ہوں اس کے بارے میں پوچھنے والی ـــــ یہ لیجئے" اور رضیہ نے میز پر سے ٹیلیفون ڈائرکٹری ہٹا کر تینوں خط اپنے شوہر کی طرف بڑھا دیئے اور خود چپ چاپ ایک طرف کھڑی رہی۔

"رضیہ! ضمیر نے سنجیدگی کے ساتھ کہنا شروع کیا "شیکسپیئر کے کردار ہیملٹ نے اپنے فلسفی دوست سے کہا تھا کہ اس آسمان اور زمین میں بعض ایسی چیزیں بھی ہیں جن کا ذکر تمہارے فلسفے میں نہیں ملتا۔ کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جو بظاہر بڑی معمولی معلوم ہوتی ہیں مگر ان کی تہہ میں انسانی دل کے کچھ بڑے گہرے راز چھپے ہوتے ہیں۔"

رضیہ نے اس خیال سے کہ اس کے شوہر نے اس کی مسکراہٹ کا بڑا مانا ہے، رونی صورت بنالی اور شوہر سے مخاطب ہوکر بولی:

"آپ درست کہتے ہیں، بہرحال کھانا کھایئے!"

سب کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ کھانا خاموشی سے کھایا گیا۔ رضیہ جب بھی اپنے شوہر کی طرف دیکھتی تھی، اسے اس کے چہرے پر ایک اندرونی اضطراب کے واضح اثرات نظر آجاتے تھے۔

ضمیر کھانے کے بعد دو تین سگریٹ پیتا تھا۔ بچوں سے دن بھر کی روداد سنتا تھا اور پھر انہیں کچھ لطیفے سنا کر ہنساتا بھی تھا۔ یہ اس کا روزمرہ کا معمول تھا لیکن اس وقت وہ کچھ کہے بغیر اٹھا اور اوپر کے کمرے میں جانے کے لیے سیڑھیاں طے کرنے لگا۔ اوپر اس کا خاص کمرہ تھا جس میں اس کا ذاتی سامان ترتیب دیا گیا تھا۔

تینوں بچے اندازہ لگا چکے تھے کہ آج کوئی خاص بات ہونے والی ہے۔ وہ چند منٹ وہیں بیٹھے رہے۔ ماں نے انہیں اپنے اپنے بستر پر چلے جانے کے لئے کہا اور وہ اس کی ہدایت پر عمل کرنے لگے۔

رضیہ نے یونہی ایک رسالہ اٹھا لیا اور اس کی ورق گردانی کرنے لگی۔ آدھ گھنٹہ بیتا۔ ایک گھنٹہ گزر گیا۔ ضمیر خواب گاہ میں نہ آیا۔

"یہ اوپر کیا کر رہے ہیں؟" رضیہ نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ ایک مبہم سی پریشانی اس کے دماغ میں رینگنے لگی تھی۔

"رضیہ!" اوپر سے آواز آئی۔

"جی"

"ذرا اوپر آؤ!"

اس نے کمرے کے اندر قدم رکھا، تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ کمرے میں جتنے سوٹ کیس تھے ان سب کے کپڑے باہر بکھرے پڑے تھے اور باوجودیکہ وہ دسمبر کا مہینہ تھا، ضمیر پسینے میں شرابور دکھائی دے رہا تھا۔

"یہ آپ نے کیا کر دیا ہے؟" رضیہ نے سوال کیا۔

"میرا کوئی ٹرنک نیچے تو نہیں؟" ــــــ ضمیر نے اس کے سوال کو نظر انداز کر کے استفسار کیا۔

"نہیں تو ـــــ یہی چار سوٹ کیس ہیں آپ کے۔"

"ایک ٹرنک بھی تھا۔ پرانا، کالے رنگ کا۔ وہ کہاں ہے؟ کیا تم کو خبر نہیں وہ ٹرنک میرا ہے۔ اس میں میں نے اپنے کچھ کپڑے رکھے تھے۔ کہاں ہے وہ؟"

رضیہ کچھ سوچنے لگی۔

"بتاتی کیوں نہیں ہو۔؟"

رضیہ نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا "پرانے مکان سے اس مکان میں آنے سے پہلے کچھ بے کار چیزیں ادھر اُدھر بانٹ دی تھیں۔"

"ادھر اُدھر بانٹ دی تھیں! کیا مطلب؟"

"پرانی اور بے کار چیزوں کی کیا ضرورت تھی ـــــ مکان میں ان کی گنجائش بھی کہاں تھی۔"

"میں پوچھتا ہوں ـــــ میرا وہ ٹرنک کہاں ہے؟"

ضمیر عام طور پر اپنے جذبات کو قابو میں رکھتا تھا۔ بلند آواز سے بولنا اس نے کبھی مناسب نہیں سمجھا تھا، مگر آج جیسے ساری احتیاطوں کا دامن اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ "کہاں ہے وہ ٹرنک؟" وہ دوبارہ گرجا۔

رضیہ نے دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھا: "اس میں سے نئے کپڑے نکال لئے تھے۔"

"اور وہ کمبل؟"

"ٹرنک چراغ بی بی کے حوالے کر دیا تھا۔"

"اس میں کمبل بھی تھا؟"

اب رضیہ کے لہجے میں بھی کسی قدر خفگی در آئی۔ "مجھے کیا پتہ تھا کہ یہ پرانا کمبل آپ کو اس قدر عزیز ہے۔ میں نے اسے بے کار سمجھا تھا۔ بتا دیا ہوتا، تو میں سینے سے لگا کر رکھتی۔"

ضمیر نے تیز نظروں سے بیوی کو دیکھا۔ "جب میں نے اسے اپنے ٹرنک میں محفوظ کر رکھا تھا،

تو یہ میری بدمذاقی نہیں تھی۔ مغفوظا وہی چیز کی جاتی ہے جس کی ضرورت ہو۔ تم مجھ سے پوچھ نہیں سکتی تھیں؟"

"آپ بھی تو کمال کرتے ہیں۔" رضیہ کی آواز بھی بلند ہو گئی تھی۔

"کیا کمال کرتا ہوں؟"

ایک پرانی بے کار شے پڑی تھی جسے کبھی استعمال نہیں کیا گیا تھا میں نے یہی سوچا کہ گھر میں بے کار جو پڑی ہے، تو کسی غریب ہی کے کام آجائے۔ اس لئے دوسرے پھٹے پرانے کپڑوں کے ساتھ اسے بھی نوکرانی کو دے دیا۔ کیا میں نے پہلے کبھی ایسا نہیں کیا تھا؟ پہلے کوئی کپڑا آپ سے پوچھے بغیر نوکرانی یا کسی اور کو نہیں دیا تھا؟ اس مرتبہ خاص طور پر آپ سے پوچھنے کی کیا ضرورت تھی؟"

ضمیر کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ رضیہ سیڑھیوں کی طرف جانے لگی۔

"سنو! مجھے یہ کمبل واپس ملنا چاہیئے۔" ضمیر نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

رضیہ نے ایک لمحے کے لئے رک کر اپنے شوہر کو دیکھا۔ وہ پوری سنجیدگی سے یہ الفاظ کہہ رہا تھا۔ وہ نیچے اترنے لگی۔ ایک ایک سیڑھی پر رکتی ہوئی ضمیر کا آخری فقرہ ایک کانٹے کی طرح اس کے ذہن میں چبھنے لگا تھا۔ یہ نہیں کہ تیرہ برس کی ازدواجی زندگی میں شوہر کے ساتھ اس کے اختلافات نہیں ہوئے تھے۔ کئی بار ہوئے تھے اور تلخ کلامی کی وجہ سے انہوں نے کئی کئی روز تک ایک دوسرے سے گفتگو بھی نہیں کی تھی، مگر اس سے پہلے کبھی اسے یہ احساس نہیں ہوا تھا کہ ان کے درمیان جھگڑا کسی سطحی سی بات پر ہوا ہے اور اس بار تو وہ شوہر کی اس ناقابلِ برداشت زیادتی کی وجہ سمجھ ہی نہیں سکتی تھی۔

"ایک پرانا کمبل کسی کو دے دیا۔ اس میں میں نے جرم کیا کیا ہے؟" یہ سوال اس کے دل و دماغ پر کچوکے لگا رہا تھا۔

وہ نیچے آئی۔ بچوں کی خوابگاہ میں جھانک کر دیکھا۔ کمرے کا بلب جل رہا تھا اور وہ سو چکے تھے۔

اس نے بتی بجھا دی۔ کمرے کے باہر صحن کی بتی روشن تھی اور یہ بتی ساری رات جلتی رہتی تھی۔ وہ اس بتی کے نیچے کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہاں کافی سردی تھی۔ ہوا کے ٹھنڈے جھونکے چل رہے تھے مگر نہ جانے اسے اپنے اندر ایک بیزار کن تپش کیوں محسوس ہو رہی تھی۔ جیسے جیسے وہ اپنے شوہر کے رویے پر غور کرتی جاتی تھی، یہ تپش بڑھتی جاتی تھی۔

"اب وہ ادپر کیا کر رہے ہیں؟" اچانک اس کے ذہن میں یہ سوال ابھر آیا۔ کیا پھر سامان کو اُلٹ پلٹ کر رہے ہیں؟"

اس کے اندر ایک خواہش نے سر اٹھایا کہ اوپر جا کر دیکھے اور وہ اس خواہش کو ضبط نہ کر سکی۔ کمرے سے روشنی باہر آ رہی تھی اور اس کونے میں جہاں قدِ آدم سیف پڑا تھا، اس کا شوہر کھڑا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ سیف پر رکھا ہوا تھا۔ رخ دیوار کی طرف تھا، اس نے مڑ کر فرش پر نظر ڈالی "رضیہ اندر آجا!"

رضیہ یہ سوچ کر پریشان ہو گئی کہ انہیں اس کی موجودگی کا علم کیونکر ہو گیا ہے۔

"آجاؤ رضیہ!"

ضمیر نے دوبارہ کہا اور جب رضیہ نے اندر قدم رکھا، تو اس نے فرش پر اپنا سایہ دیکھ لیا وہ اب سمجھی کہ جب وہ کمرے کے دروازے پر کھڑی تھی، تو اس کا سایہ اندر فرش پر پھیل گیا تھا۔

ضمیر نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے شانوں پر رکھ دیے "میں جانتا ہوں تمہارے دل پر کیا گزر چکی ہے۔ غالباً میرا رویہ تمہارے لئے ایک معما بن گیا ہے"

"غالباً نہیں یقیناً" رضیہ نے شوہر کو مخاطب کئے بغیر کہا۔

"بیٹھ جاؤ" اور یہ کہہ کر اس نے بیوی کو اس آرام کرسی میں بٹھا دیا۔ جس میں بیٹھ کر وہ چھٹی کے دن کوئی کتاب یا رسالہ پڑھا کرتا تھا۔ اس نے دوسری کرسی آرام کرسی کے برابر کھسکائی اور خود اس میں دھنس گیا "رضیہ! میں نے تم سے کہا ہے کہ اس لفافے کے ساتھ ایک کہانی وابستہ ہے اور یہ کہانی میں تمہیں سنائے دیتا ہوں۔ سنو گی؟"

رضیہ کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔اس نے کوئی جواب دینے کی ضرورت محسوس نہ کی۔
"کم و بیش تیس برس گزرے میں ایک ہوسٹل کے کمرے میں اپنے بچپن کے دوست نواز احمد کے ساتھ رہتا تھا۔ہم دونوں کو ایک دوسرے سے بڑی محبت تھی اور اس محبت کی ایک بڑی وجہ یہی کمبل تھا۔"

"کمبل؟"

"ہاں کمبل ——— ہم دونوں غریب والدین کے بیٹے تھے مشکل سے گزر اوقات ہوتی تھی۔ تم پوچھنا چاہتی ہو گی کہ ہماری محبت میں کمبل نے کیا کیا تھا! بتاتا ہوں۔ہمارے پاس صرف یہی ایک کمبل تھا اور یہ میرا نہیں، میرے روم میٹ یعنی نواز احمد کا تھا۔یہ ہم دونوں کا ایک طرح سے مشترکہ اثاثہ بن گیا تھا اور وہ یوں کہ جب بھی کسی کو اپنے گھر جانے کی ضرورت پڑتی تھی۔ تو وہ بلا تکلف یہ کمبل ساتھ لے جاتا تھا اور واپسی پر ساتھ لے آتا تھا۔ایک بار مہینہ یہی دسمبر کا تھا۔گھر سے خط آیا کہ اباجی کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔میں پریشان ہو گیا اور فوراً گھر روانہ ہونے کی تیاری کر لی۔ہوسٹل سے باہر نکل کر تانگے میں بیٹھنے والا تھا کہ نواز بھاگا بھاگا آیا، اس نے کمبل اٹھا رکھا تھا جسے میں پریشانی میں بھول گیا تھا۔"تمہارا رفیقِ سفر!" اس نے کمبل میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

میں نے کمبل لے لیا اور تانگہ چل پڑا، جب تک تانگہ اس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہو گیا وہ وہیں سردی میں کھڑا رہا۔

گھر پہنچا، تو اباجی کی طبیعت کافی خراب ہو چکی تھی اور انہیں ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا تھا۔ میں مزید چھٹیوں کے لئے عرضی بھیجتا رہا اور اسی طرح پندرہ روز بیت گئے۔اس کے بعد اباجی سنبھل گئے اور میں گھر سے نکل پڑا۔

رضیہ نے سر جھکا رکھا تھا اور دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں اس کے رخساروں سے مس کر رہی تھیں۔نفیس نے بات آگے بڑھائی؛ "ہوسٹل پہنچا تو معلوم ہوا، میری عدم موجودگی میں نواز احمد

کے والد کا تبادلہ کراچی ہوگیا ہے اور وہ گھر کے لوگوں کے ساتھ وہاں چلا گیا ہے۔ پھر، اس کے خط کا انتظار کرنے لگا۔ اس کا خط ملا جس میں اس نے یہ اطلاع دی کہ شاید انہیں ملک سے باہر جانا پڑے اور یہ اس کا آخری خط تھا۔"

رضیہ نے اپنے شوہر کے اضطراب سے اندازہ لگا لیا کہ اس کا اندرونی ہیجان جو کسی حد تک دب گیا تھا، پھر عود کر آیا ہے۔ وہ اٹھا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ رضیہ اسے کبھی کرسی کے قریب آتے اور پھر اس سے دور جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

کچھ دیر بعد ضمیر اپنی کرسی کے پاس آ کر ٹھہر گیا اور دکھ بھری آواز میں بولا، وقت گزرتا گیا اور مجھے اس کی کوئی خبر نہ ملی۔ رضیہ! میں اس کا کمبل لے آیا تھا اور اسے واپس کرنا چاہتا تھا۔ دنیا میں جو بھی اس واقعے کو سنے گا وہ یہی کہے گا کہ یہ بات نہایت معمولی قسم کی ہے۔ میرا دوست اس بے کار، پرانے فرسودہ کمبل کو کیا کرے گا، لیکن میرے دل میں ایک چبھن ہے۔ میں اسے اپنے دوست کی امانت سمجھتا رہا ہوں اور بدستور سمجھتا ہوں۔ مجھے یہ امانت واپس کر دینی چاہیئے۔ اسی لئے اسے اپنے کپڑوں کے ساتھ حفاظت سے رکھ چھوڑا تھا کہ ایک دن ایسا ضرور آئے گا، جب میں یہ امانت لوٹا دوں گا۔"

"اور یہ خط؟" رضیہ نے سوال کیا۔

یہ خط؟ بتاتا ہوں۔ میں کبھی کبھی کچھ دوستوں کو خط لکھ کر نواز کے بارے میں پوچھتا رہتا تھا۔ سوائے ایک کے سب نے جواب دیا تھا کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ ملک چھوڑ گیا ہے۔ کہاں، یہ کسی کو بھی معلوم نہیں تھا۔ اس شخص نے جس کا نام الطاف امجد ہے کبھی کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ میں اس کی طرف سے بالکل مایوس ہو گیا تھا کہ اب چار پانچ سال بعد اچانک اس کا خط آگیا ہے اور اس نے بتایا ہے کہ نواز جو کبھی نواز احمد تھا، آج شیخ نواز احمد کے نام سے راولپنڈی میں مقیم ہے۔ گورنمنٹ کنٹریکٹر ہے اور بہت خوشحالی کی زندگی گزار رہا ہے۔ تم سمجھ سکتی ہو، اب میں اس کی امانت لوٹا سکتا ہوں، لیکن ـــــــ؟"

رضیہ مضطرب دکھائی دینے لگی تھی "آپ نے کبھی مجھے یہ بات بتائی تھی؟"

رضیہ کا سوال معقول تھا اور ضمیر کو اس کا جواب دینے میں دقت ہو رہی تھی "بھئی میں نے تو بس یہ سوچا تھا کہ امانت محفوظ ہے۔"

"لیکن بتائے بغیر کیسے محفوظ رہ سکتی تھی؟" رضیہ نے کہا۔

"خیر جو کچھ ہو گیا سو ہو گیا ــــ اب بتاؤ کہ کیا کیا جائے۔ جس طرح بھی ہو، چراغ بی بی سے وہ کمبل واپس لے لو۔"

ضمیر نے یہ کہنے کے بعد اس کا ردعمل اپنی بیوی کے چہرے پر ڈھونڈنے کی کوشش کی اور ردعمل اس کی توقع کے خلاف تھا۔

"آپ خود سوچئے کیا یہ کوئی مناسب بات ہو گی؟ بوڑھیا کیا کہے گی؟ جس طرح آپ سوچ رہے ہیں، دوسرے نہیں سوچ سکتے۔ اس چیز کو مت بھولئے کہ وہ نوکرانی ہے اور میں اسے کمبل دے چکی ہوں۔"

ضمیر کے اندر وہ جھنجھلاہٹ جو دب سی گئی تھی، پھر بیدار ہو گئی "اچھا مت مانگو۔ میں خود مانگ لوں گا۔ اسے نیا کمبل مل جائے، تو پرانا کمبل لوٹانے میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے، بلکہ وہ تو خوش ہو جائے گی۔"

رضیہ نے اپنی اندرونی کشمکش پر قابو پا لیا تھا "سو جائیے جا کر۔" وہ بولی۔

"سو جاؤں!"

"ہاں آپ جو کچھ چاہتے ہیں، ہو جائے گا۔" یہ کہہ کر رضیہ سیڑھیوں کی طرف جانے لگی چند منٹ کے بعد ضمیر بھی نیچے اترنے لگا۔

بنک جانے سے پیشتر ضمیر نے بیوی کو تاکید کر دی کہ چراغ بی بی جب آئے تو سب سے پہلے اس سے کمبل واپس لینے کی کوشش کرنا اور اسے معقول رقم دے دینا۔ رضیہ نے اقرار کیا۔ بڑھیا روزانہ اس وقت آ جاتی تھی، جب ضمیر اور اہل خانہ یا تو ناشتہ کر چکے ہوتے تھے یا کر رہے ہوتے

تھے، لیکن اس روز وہ دیر سے آئی۔

"اماں!" رضیہ نے اسے مخاطب کیا اور چراغ بی بی نے سمجھا کہ اس کی مالکن دیر سے آنے کی وجہ پوچھ رہی ہے۔ بولی "نواسا رات بیمار ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر کے پاس لے گئی تھی۔"

"اماں! میرے پاس بیٹھ جاؤ!"

چراغ بی بی پریشان ہو گئی اور اس کے سامنے کھڑی رہی۔

"بیٹھو اماں! ایک بات کرنی ہے تم سے۔"

چراغ بی بی بیٹھ گئی، تو رضیہ نے اپنے پرس میں سے دس دس کے پانچ نوٹ نکالے اور انہیں اس کی دائیں ہاتھ کی کہنی کے پاس رکھ دیا۔ یہ کہنی اس نے میز پہ لگا رکھی تھی۔

"بات بہت معمولی ہے ـــــ میں نے تمہیں ایک کمبل دیا تھا۔ اماں یاد ہے نا؟"

بڑھیا نے اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔

"اس کی جگہ یہ روپے لے لو ان سے نیا کمبل خریدا جا سکتا ہے۔ اس سے بہتر اور اچھا"

بڑھیا شاید کچھ سمجھ نہیں سکی تھی یا سمجھتی تھی کہ وہ اپنی مالکن کی بات غور سے نہیں سن سکی۔

"وہ کمبل اصل میں کسی کی امانت تھی جو صاحب کو واپس کرنا تھی مجھے اس کا پتہ نہیں تھا لے آتی ہو گھر سے؟ روپے لے لو۔"

بڑھیا نے روپے نہیں اٹھائے۔ بولی "بی بی! میں کیا کروں مجھے کیا خبر تھی کہ یہ کسی کی امانت ہے۔"

"تو کیا کیا ہے تم نے اس کا؟"

"کرنا کیا تھا بی بی! پتہ ہوتا، تو نہ دیتی۔ پچھلی جمعرات کو میرا چھوٹا بھائی یوسف آیا تھا۔ میں نے اسے دے دیا۔"

رضیہ کرسی سے اٹھ بیٹھی، اسے کچھ کہنے کے لئے مناسب الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ چراغ بی بی کہنے لگی: "اس کی جرابوں کی دکان ہے صبح سویرے دکان پر بیٹھ جاتا ہے، سردیوں کے دن

ہاں۔ میں نے کہا یوسف! یہ کمبل بی بی نے مجھے دیا ہے۔ تم لے لو۔"

"تو تم نے اپنے بھائی کو دے دیا ہے۔" رضیہ کے لہجے میں بے تابی نمایاں تھی۔

"بی بی تم نے مجھے دے دیا تھا نا"

رضیہ سمجھ گئی کہ اماں کیا کہنا چاہتی ہے۔ یہ کہنا چاہتی ہے کہ جب تم نے کمبل دے دیا تو وہ میری چیز تھی جسے چاہتی دے دیتی۔

چند منٹ کے بعد ہی ضمیر نے ٹیلیفون کیا اور جب رضیہ نے اسے بتایا کہ وہ تو جہلم کے ایک دکاندار کے پاس ہے۔ تو اس نے کہا اماں سے اس کے بھائی کا پتہ پوچھ لو۔

رضیہ ٹیلیفون بند ہونے کے بعد بھی ریسیور ہاتھ میں لئے میز کے پاس کھڑی رہی۔ اسے یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوتی تھی کہ ملازمہ سے اس کے بھائی کا پتہ پوچھے تاکہ اس سے کمبل واپس لیا جائے۔

پچاس کے نوٹ وہیں پڑے تھے۔ اماں نے اٹھائے نہیں تھے۔ نوٹ دیکھ کر اس کے اندر اپنی توہین کا احساس اُبھر آیا۔ ملازمہ سے اس معاملے میں ایک لفظ تک نہ کہا اور نوٹ واپس اپنے پرس میں رکھ لئے۔

جس وقت اماں معمول کے مطابق جانے لگی تو اس نے دو تین بار میز کی طرف دیکھا۔ رضیہ نے اسے کنکھیوں سے دیکھا مگر کچھ بولی نہیں اور اماں چلی گئی۔ رضیہ بچوں سے باتیں کرنے میں مشغول ہو گئی۔

ضمیر ساڑھے سات بجے گھر آ گیا اور کپڑے تبدیل کئے بغیر اس نے پوچھا۔

"کہیں یہ اماں جھوٹ تو نہیں بول رہی؟"

"مجھے کیا خبر!" رضیہ نے بے اعتنائی سے جواب دیا۔

یہ الفاظ ضمیر کو چبھے اور اس کی پیشانی پر شکن پڑ گئی۔ "ٹھیک طور پر اس سے پوچھا ہوتا۔"

"تو کیا میں نے غلط طور پر پوچھا تھا؟"

ضمیر نے بیوی کے رویّے کا کچھ زیادہ خیال نہ کیا بولا : "میرا مطلب ہے اسے پیسے دے دیئے ہوتے ۔"

"دیئے تھے، لیکن اس نے کمبل اپنے بھائی کو دے دیا ہے۔ جھوٹ بولنے کی اسے ضرورت کیا تھی ؟ پچاس روپے مل رہے تھے ۔ وہ پرانا کمبل تو کوئی پانچ روپے میں بھی نہ خریدے ۔"

"یہ تو درست کہا ہے تم نے اس کے بھائی کا پتہ کیا ہے ؟"

"آپ جہلم جائیں گے ؟"

"ظاہر ہے وہ کمبل دینے کے لئے کرایہ خرچ کر کے لاہور نہیں آئے گا۔"

رضیہ باورچی خانے کی طرف جانے لگی ۔

ضمیر بولا : "میں ابھی کھانا نہیں کھاؤں گا ۔"

وہ جاتے جاتے رک گئی ۔ اپنی توہین کا وہ احساس جو دب گیا تھا، یکایک ایک چنگاری بن گیا ۔ تنک کر بولی "کیا آپ کو اس کا خیال نہیں آتا کہ ایک پرانا، فرسودہ، میلا کچیلا بیہودہ کمبل واپس لینے کے لئے آپ جہلم جائیں گے ــــ ایک بہت معمولی دکاندار کی دکان پر" ضمیر خاموش رہا ۔

"کیا نہیں گئے، آپ اس سے، خدارا کچھ تو سوچئے ! سوچئے کیوں نہیں آپ !"

رضیہ نے ایک ہی سانس میں یہ سارے الفاظ کہہ دیئے ۔

ضمیر کا رویّہ ابھی تک بدلا نہیں تھا ۔ اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے گویا ہوا : "پتہ پوچھ لیا تھا ؟"

"نہیں"

"نہیں ــــ ؟ تم نے پتہ نہیں پوچھا ــــ ؟ میں نے تاکید کی تھی ــــ" اب ضمیر برافروختہ ہو گیا تھا ۔

"آخر کیا کہتی اس سے ؟"

"اس کے بھائی کا پتہ پوچھتیں اور کیا کہتی ؟"

"اگر آپ کو اتنا ہی خیال ہے تو ایک قیمتی کمبل خرید کر اپنے دوست کو دے دیں!"

ضمیر کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا: "کیا بے معنی اور بے کار بات کرتی ہو۔ میں امانت واپس کرنا چاہتا ہوں اور تم مجھے قیمتی کمبل خریدنے کا مشورہ دے رہی ہو۔ مجھے بتاؤ کہ تم نے اماں چراغ بی بی سے اس کے بھائی کا پتہ کیوں نہیں پوچھا؟"

رضیہ جس کا یہ حال تھا جیسے اس نے کوئی بھیانک خواب دیکھا ہو، آہستہ آہستہ کمرے سے باہر نکلنے لگی۔ ضمیر نے گرجتی ہوئی آواز میں کہا: جواب دے کر جاؤ!

"میں نے پتہ نہیں پوچھا" رضیہ نے جاتے جاتے کہہ دیا۔

بچے باپ کی بلند آواز سے جاگ اٹھے تھے اور خوفزدہ نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے ضمیر نے ایک لمحے کے لئے انہیں دیکھا اور جلدی سے باہر چلا گیا۔

رضیہ کو رات کے وقت شوہر کے آنے کا کوئی علم نہ ہو سکا۔ وہ تنہا روتے روتے سو گئی تھی صبح جب بیدار ہوئی، تو ضمیر کا پلنگ خالی تھا۔ اس نے باہر آکر دیکھا گیراج میں گاڑی بھی نہیں تھی۔ وہ پریشان ہو گئی: "اللہ انہیں کیا ہو گیا ہے۔ انہیں کیا ہو گیا ہے میرے اللہ!" وہ کئی منٹ دالان کے کنارے ہوا کے سرد جھونکوں میں کھڑی رہی اور پھر یہ سوچ کر کہ بچے باہر نہ آجائیں۔ اندر چلی گئی۔

سورج نکل چکا تھا، مگر اس کی حرارت میں ابھی شدت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ جہلم کے ایک بازار میں ضمیر کی کار ایک معمولی سی دکان کے سامنے رک گئی۔

بازار کی کچھ دکانیں کھل چکی تھیں اور کچھ ابھی بند تھیں اور وہ دکان جس کے قریب ضمیر کی کار کھڑی تھی، ابھی بند تھی۔ ضمیر گاڑی سے باہر نکل آیا تھا اور اس بند دکان کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ چند منٹ اور گزرے ہوں گے کہ ادھیڑ عمر کا ایک شخص میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس دکان پر آیا اور دکان کھولنے لگا۔ ضمیر اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا تھا۔ جب دکان کے دونوں پٹ کھل گئے اور دکاندار دکان کے اندر جا کر جھاڑو دے آیا، تو یکایک اس کی نگاہ ضمیر پر پڑ گئی اور جلدی سے بولا:

"باؤجی آپ" وہ تھڑے سے نیچے اتر آیا۔
"ہاں، کیا تم چراغ بی بی کے بھائی ہو؟"
دکاندار کے ڈھیلے پھیل گئے "جی ۔۔۔ جی ۔۔۔ کیا ہوا میری بہن کو" اس نے جیسے سانس روک کر پوچھا۔
"کچھ نہیں ہوا بھئی! یوسف ہو نا تم؟"
"جی، جی، فرمائیے جی۔ میری بہن نے بھیجا ہے نا آپ کو؟ اللہ خیر کرے!"
ضمیر اس کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف لے گیا "تم مجھے جانتے ہو۔"
"جی ہاں، آپ کو یاد نہیں رہا۔ ایک دفعہ بہن سے ملنے آپ کے گھر گیا تھا۔"
اچھا تو سنو! وہ کمبل جو تمہاری بہن نے تم کو دیا ہے، اصل میں کسی کی امانت تھا۔ میری بیوی یہ بات نہیں جانتی تھی۔ اس نے چراغ بی بی کو دے دیا۔ تم جانتے ہو امانت ۔۔۔ امانت ہوتی ہے۔ جانتے ہو نا، کیوں یوسف؟"
"جی۔ جی جانتا ہوں جی" یوسف نے جواب دیا۔
"تم اس کی جگہ نیا کمبل خرید لو، یہ لو" ضمیر نے جیب سے دس دس کے کئی نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیئے۔ یوسف نے دو تین لمحے توقف کیا، پھر نوٹ لے لئے اور انہیں کرتے کی جیب میں رکھتے ہوئے بولا "وہ گھر میں ہے جی!"
مجھے جلد واپس جانا ہے، تکلیف کر سکو تو بڑی مہربانی ہوگی۔"
یوسف نے ساتھ والی دکان کی طرف دیکھا۔ دکان ابھی کھلی نہیں تھی۔
"یہ آجائے تو جاؤں گا جی" یہ کہہ کر دکاندار صفائی میں معروف ہو گیا۔
ضمیر کھڑا رہا۔ اتنے میں ساتھ والی دکان کا مالک آ گیا۔ یوسف بولا،
"حسن یار! یہ باؤجی آئے ہیں۔ بس تھوڑی دیر لگے گی ہیں۔ بس ابھی آیا!"
حسن نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"گھر دور ہے یا نزدیک؟" ضمیر نے پوچھا۔

"نزدیک ہی ہے جی۔ بس پہنچے کے پہنچے۔" وہ دکان سے اتر کر ایک طرف روانہ ہو گیا۔ ضمیر یوسف کے ساتھ چلنے لگا۔ آدھ فرلانگ کے بعد ایک معمولی سے یک منزلہ مکان کے سامنے رُک گیا اور بہت اپنائیت سے بولا "میں دروازہ کھولتا ہوں۔"

"نہیں بھئی۔ میں بیٹھوں گا نہیں۔ بنک میں میرا انتظار ہو رہا ہے۔"

"اچھا جی" کہہ کر یوسف اندر چلا گیا۔

ضمیر گلی کی نکڑ پر تنہا کھڑا تھا۔ ادھر سے جو بھی گزرتا تھا اسے حیرت سے ضرور دیکھ لیتا۔ اس قسم کا تجربہ اس سے پہلے اسے کبھی نہیں ہوا تھا۔ وہ اپنے اندر ایک ایسی الجھن محسوس کر رہا تھا جو لحظہ بہ لحظہ بڑھتی جا رہی تھی۔

کئی منٹ گزر گئے۔ پھر اندر سے ایک مردانہ اور ایک زنانہ آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ان آوازوں سے غصہ اور زجر و توبیخ کا اظہار ہو رہا تھا۔ اس پر کچھ لوگ تماشا دیکھنے کیلئے مکان کے دروازے کے سامنے کھڑے ہو گئے۔

"کیا بات ہے باؤ جی؟" ایک شخص نے پوچھا۔

"مجھے کیا خبر؟" ضمیر نے بیزار ہو کر جواب دیا۔

اس شخص کی نظریں پوچھ رہی تھیں تو تم یہاں کیوں کھڑے ہو۔

آدھ گھنٹے کے بعد یوسف باہر آ گیا اور نادم سا ہو کر بولا "باؤ جی! کمال ہو گیا ہے؟"

ضمیر کے ساتھ اور بھی لوگ جو وہاں ٹھہر گئے تھے۔ یوسف کو گھور گھور کر دیکھنے لگے۔

"آؤ باؤ جی!" یوسف نے ضمیر کا ہاتھ پکڑا اور اسے ایک طرف لے گیا۔ "باؤ جی، کیا ہے؟" ضمیر نے پوچھا۔

"میری نامراد بیوی نے کمبل اپنے بھانجے کو دے دیا ہے۔ رات وہ آیا تھا مجھ سے پوچھا بھی نہیں۔"

"تو اب؟"

"باؤجی یہ اوّل نمبر جوار رہا ہے۔ گھر پر نہیں ہوگا۔ میں اس کے دو تین ٹھکانے جانتا ہوں۔ مل جائے گا باؤجی۔ گھبراؤ نہیں۔ جائے گا کہاں کمبل لے کر؟"

ڈیڑھ گھنٹہ تک یوسف ضمیر کو گلیوں میں لئے لئے پھرا۔ کئی دکانداروں سے اس کے بارے میں پوچھا۔ کسی نے کہا صبح اس نے بلّے کی دکان سے لسّی پی تھی۔ کسی نے اطلاع دی وہ کچھ دیر پہلے یہیں سے گزر رہا تھا۔ یوسف ضمیر کو اس کے گھر پر بھی لے گیا، مگر بے سود۔

دوپہر ہونے والی تھی اور ضمیر چل چل کر تھک گیا تھا۔ اسے یہ فکر بھی ستا رہی تھی کہ وہ بنک سے ہو کر نہیں آیا تھا۔ معلوم نہیں وہاں کیا مسائل در پیش ہوں۔ بالآخر یوسف اسے واپس اپنی دکان پر لے آیا اور وہاں آ کر بولا "باؤجی! آپ کو کمبل چاہیئے نا؟"

"تو اور کس کام کے لئے وقت ضائع کر رہا ہوں؟" ضمیر نے غصّے سے کہا۔

"مل جائے گا۔ آج شام نہیں، تو کل کسی وقت ضرور آ جاؤں گا۔ گھبراؤ نہیں باؤجی!"

ضمیر اچھا کہہ کر اور اسے فوراً کمبل پہنچانے کی تاکید کے ساتھ کرائے کے لئے بیس روپے دے کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ گاڑی وہ بڑی بے دلی سے چلا رہا تھا وہ سیدھا بنک ہی میں پہنچا۔ عملے نے اسے پریشان دیکھا، تو ہر رکن کسی قدر پریشان ہو گیا۔ بال بکھرے ہوئے، چہرہ گرد آلود اور آنکھوں میں مایوسی کے سائے سے لہراتے ہوئے۔ اس کی ایسی حالت اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی تھی۔ ہر شخص خیر تو ہے، کے استفسار کے ساتھ اس کے پاس آنے لگا۔

"کوئی ایسی بات نہیں۔ ایک مسئلہ ہے۔ حل ہو جائے گا۔" وہ ہر پوچھنے والے کو قریب قریب یہی جواب دیتا۔

شام کے وقت جب گھر آیا، تو اس کی بیوی اور بچے صحن میں کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ اس کی ہیئت کذائی دیکھ کر ہر فرد خوفزدہ ہو گیا۔ اس نے بچوں سے رسمی انداز میں حال چال پوچھا اور اوپر چلا گیا۔ ساتھ ہی رضیہ اوپر آ گئی۔ بولی "کہاں چلے گئے تھے آپ؟"

"تم نہیں جانتیں؟"

"جانتی ہوں، لیکن کم از کم اطلاع دے کر تو جاتے، کیا بنا، کیا ہوا؟"

ضمیر نے محسوس کیا کہ اس کی بیوی، جس نے اس کا تیرہ برس ساتھ دیا تھا اور جس کا اس پر سب سے زیادہ حق تھا، ایک گہری بے اعتمادی کی کیفیت میں گرفتار ہے۔ اس کے چہرے پر وہ شادابی نہیں جو ایک لمبی رفاقت اپنے ساتھ لاتی ہے۔ سوچنے لگا کیا وہ اس سے بدظن ہو گئی ہے کیا اس کے ذہن میں بدگمانیاں بڑھ رہی ہیں۔

"کیا بنا؟ ــــ کیا ہوا؟ یہ الفاظ جیسے رضیہ کی پیشانی پر چسپاں ہو کر رہ گئے تھے اور مسلسل سلگ رہے تھے۔ ضمیر نے کوشش کی کہ اس واقعے کی سنگینی یا بوریت کو بہت حد تک کم کر دے چنانچہ کہنے لگا "اماں چراغ بی بی کا بھائی لے آئے گا"

"کمبل نا؟" یہ الفاظ رضیہ نے ایسے لہجے میں کہے تھے کہ طنز کی کڑواہٹ ضمیر محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا۔ بگڑ کر بولا: "ہاں کمبل!"

"شکر ہے خدا کا۔ میں ایک بھاری مصیبت سے نجات ملے گی۔ کھانا لگایا جا رہا ہے۔ آیئے!"

"آتا ہوں" ضمیر نے کہا۔ اسے اپنے کمرے میں کوئی کام نہیں تھا مگر وہ بیوی کے ساتھ نیچے اترنے کے لئے آمادہ نہ ہو سکا۔ شاید رضیہ پر یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ اس نے اس کے آخری فقرے کا بہت برا مانا ہے۔

کھانا قریب قریب خاموشی کے عالم میں کھایا گیا۔ رضیہ نے نہ اس سے پوچھا کہ جہاں وہ گیا تھا وہاں اس پر کیا بیتی اور نہ ضمیر نے خود اسے کچھ بتایا۔ بچے باپ کو کنکھیوں سے دیکھتے رہے اور کھانا کھاتے رہے۔

یوسف نے وعدہ کیا تھا کہ وہ دوسرے روز ہی کمبل لے کر لاہور آجائے گا، مگر تین روز گزر گئے اور وہ نہ آیا۔ رضیہ نے اپنے شوہر کی بڑھتی ہوئی پریشانی کا اندازہ لگایا اور اماں کو کرایہ دے کر اس کے بھائی کے پاس بھیج دیا۔ ضمیر کو اس کا علم نہیں ہوا۔

چوتھے روز وہ بنک جانے کے لئے کپڑے بدل کر نیچے آیا، تو رضیہ نے اسے دیکھ کر اس کا ارادہ بھانپ لیا۔ بولی: "اماں آج نہیں تو کل ضرور آجائے گی۔"

"تم نے اسے بھیجا ہے؟"

"کیا کرتی؟ میں نے اسے بڑی تاکید کی تھی کہ ہر حال میں کل شام تک آجائے۔ آج ضرور آجائے گی۔"

شاید وہ ___! ضمیر کے لہجے میں تذبذب تھا۔

"آپ کی امانت آپ کو مل جائے گی۔ یہی چاہتے ہیں نا آپ؟"

ضمیر نے اپنی بیوی کے فقرے کی نشتریت محسوس کرلی۔ تلخ لہجے میں بولا: "رضیہ میں تمہیں سمجھا نہیں سکتا۔"

"مجھے کچھ سمجھنے کی ضرورت بھی نہیں۔" رضیہ نے دوٹوک جواب دے دیا۔

ضمیر نے کچھ اور کہنا سننا مناسب نہ سمجھا۔ باہر نکل کر گاڑی سٹارٹ کرنے لگا۔

بنک میں کام کرتے وقت ضمیر کے ذہن میں بار بار یہ سوال چبھنے لگتا تھا کہ اماں کمبل لے آئے گی یا نہیں۔ یوسف نے کہا تھا کہ اس کی بیوی کا بھائی جواری ہے اور جواری سے ہر قسم کی توقع کی جا سکتی ہے۔

○

منگل کی صبح تھی۔ اماں چراغ بی بی کو جہلم گئے چار روز گزر چکے تھے۔

"اب تک تو اسے ہر حال میں آجانا چاہئے تھا" ضمیر نے ناشتہ کرتے وقت کئی بار سوچا۔ رضیہ بچوں کو ناشتہ کروا کر سکول کے لئے تیار کر رہی تھی۔ ضمیر بنک میں جلدی پہنچ جانا چاہتا تھا۔ اس نے بچوں کو گاڑی میں بٹھایا اور انہیں ان کے سکولوں تک پہنچا کر خود بنک چلا گیا۔ بارہ بجے تک کام کا اس قدر ہجوم رہا کہ وہ ایک لمحے کے لئے بھی فراغت نہ پا سکا۔ ساڑھے بارہ بجے روزمرہ کے معمولات کا سلسلہ شروع ہو گیا، تو اس نے گھر فون کیا اور اس سے پیشتر کہ وہ کچھ کہے رضیہ کی آواز آئی: "اماں آ گئی ہے۔" اور یہ کہہ کر اس نے ٹیلیفون بند کر دیا۔

"رضیہ نے پہلے کبھی ایسا رویہ اختیار نہ کیا تھا! آج کل اسے کیا ہو گیا ہے؟" اس نے سوچا اور گھر جانے کے لئے تیار ہونے لگا۔

"کہاں ہے اماں؟" اس نے گھر پہنچتے ہی بیوی کو مخاطب کیا۔

"اوپر" رضیہ کا بہت مختصر جواب تھا۔

"اماں اوپر ہے؟"

"نہیں" رضیہ کپڑے گن کر دھوبی کو دے رہی تھی وہ اپنے کام میں بری طرح مصروف تھی۔ ضمیر اوپر چلا گیا میز کے اوپر خاکی رنگ کے کاغذ میں لپٹی ہوئی کوئی چیز پڑی تھی۔

"تو گویا وہ کمبل لے آئی ہے!" اور اس نے عجلت تمام کاغذ الگ کر دیا۔ ایک خوشنما کمبل اس کے ہاتھوں میں تھا۔ ایک دم اس کے دل و دماغ میں سوئیاں سی چبھنے لگیں "رضیہ! رضیہ!" وہ گرجا اور ساتھ ہی دروازے میں سے رضیہ داخل ہو گئی بولی: "چیخئے مت آگئی ہوں فرمایئے!"

"میرے ساتھ یہ مذاق ——! یہ وہ کمبل ہے جو تم نے اماں کو دیا تھا؟"

"نہیں"

"پھر یہ کیا ہے؟"

آپ دیکھ نہیں رہے کمبل ہے۔ وہ کمبل اماں نہیں لائی۔ لا سکتی بھی نہیں۔ میں ایک بڑی مصیبت سے نجات پانے کے لئے یہ کمبل بازار سے لے آئی ہوں۔"

"رضیہ" ضمیر نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کے شانوں کو اس طرح جنبش دی کہ اس کا رنگ پیلا پڑ گیا اور جب اس نے ہاتھ ہٹائے تو وہ ڈگمگانے لگی۔

"میرے ساتھ یہ مذاق! —— شرم تو نہیں آئی" وہ اور بھی اونچی آواز میں گرجا۔

رضیہ چپ چاپ کھڑی رہی اور پھر اس انداز سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی کہ اس کا سارا جسم کانپنے لگا: "میں کیا کرتی؟ آپ نے گھر کو جہنم بنا دیا ہے۔ سارا اطمینان تباہ کر دیا ہے۔"

"مگر اس حرکت کی کیا ضرورت تھی؟"

"یہ بھی لوٹایا جا سکتا ہے۔"

"یہ امانت نہیں ہے۔"

"اس سے تو بہتر ہی ہے۔"

"رضیہ!" ضمیر نے ایک بار پھر اپنے ہاتھ اس کے شانوں کی طرف بڑھائے۔ رضیہ جھٹ پیچھے ہٹ گئی، مگر دوسرے ہی لمحے اس کے قریب آگئی۔ جھلا کر بولی:

"شانوں کی طرف نہیں، گردن کی طرف ہاتھ بڑھائیے ـــــ میں حاضر ہوں ـــــ!"

ضمیر نے اسے شعلہ بار نظروں سے دیکھا۔ کمبل زور سے دیوار پر دے مارا اور کھٹ کھٹ نیچے اتر گیا۔

وہ سڑک پر چلا جا رہا تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے! ایک زہر آلود لہر بار بار اس کے دل و دماغ میں سے گزر جاتی تھی اور اپنے پیچھے اپنا اثر چھوڑ جاتی تھی۔

پندرہ بیس منٹ بعد ضمیر کی کار جہلم کی طرف چلی جا رہی تھی۔ ایک کار سے اس کا تصادم ہوتے ہوتے بچا۔ ایک ٹرک سے بھی یہی حادثہ پیش آنے والا تھا کہ خوش قسمتی سے ٹرک کے ڈرائیور نے سپیڈ پر یک لخت کنٹرول کر لیا اور ضمیر کے اناڑی پن کو کئی لمحے کوستا رہا۔

یوسف اپنی دکان پر موجود نہیں تھا۔ ایک اور شخص اس کی جگہ گاہکوں سے نپٹ رہا تھا۔

"یوسف کہاں ہے؟" ضمیر نے پوچھا۔

"وہ بیمار ہے۔ گھر پر ہے۔"

ضمیر اس کا گھر دیکھ چکا تھا۔ گاڑی کو مقفل کیا اور اس کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہاں پہنچ کر آواز دی، تو ایک عورت نے دروازے پر آ کر پوچھا: "کون ہے؟"

"یوسف سے کہہ دو۔ لاہور سے ضمیر بابو آیا ہے۔"

عورت اسے اندر لے گئی۔ یوسف چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ رسمی گفتگو کے بعد ضمیر نے اس سے کمبل کے بارے میں دریافت کیا۔

"باؤ میں کیا کروں؟ اکبر کا بچہ بتاتا ہی نہیں کہ کہاں رکھا ہے۔ باؤ بڑا جوار رہا ہے۔"

یوسف کے منہ سے یہ لفظ نکلے ہی تھے کہ اس کی بیوی کو جیسے آگ لگ گئی "جوار رہا ہے تو اپنے گھر سے تمہارا کچھ لے تو نہیں گیا۔ جوار رہا ہے جوار رہا ہے۔ بس کہے دیتی ہوں آدمی کی عزت اپنے ہاتھ میں ہوتی ہے!"

یوسف اٹھ بیٹھا۔ ضمیر کو خدشہ تھا کہ یہاں ایک نیا ہنگامہ برپا ہو جائے گا۔ اس نے یوسف کا ہاتھ پکڑا اور کہا "ذرا باہر چلو مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔"

اس طرح وہ ہنگامہ تو ٹل گیا، لیکن اب بھی ضمیر بدستور پریشان تھا۔

باؤ جی! وہ مل جائے تو اس کا کچومر نکال دوں گا، تم نے کیوں تکلیف کی؟ ــــ میں کمبل شہر میں پہنچا دوں گا۔"

"یوسف! یہ بتاؤ تمہیں زیادہ تکلیف تو نہیں ہے؟" ضمیر نے اس سے پوچھا۔

"ہے باؤ جی!"

ضمیر سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر پرس نکالا "یہ لو پھل وَل کھا لینا!"

ہاتھ میں نوٹ لے کر یوسف کی آنکھیں چمک اٹھیں "باؤ جی! اتنی دور سے آئے ہو۔ موٹر کار کہاں ہے؟"

"تمہاری دکان کے پاس۔"

"باؤ جی! اکبر کا گھر کافی دور ہے۔"

"تو تانگے میں بیٹھ کر چلے جاتے ہیں" ضمیر نے کہا۔ یوسف نے رضامندی ظاہر کی اور وہ تانگے میں بیٹھ گئے۔ پون گھنٹے کے بعد کہیں تانگہ ایک چھوٹے سے مکان کے سامنے رکا۔ یوسف جلدی سے اترا اور اس مکان کے اندر چلا گیا۔ کئی منٹ کے بعد باہر آ کر اس نے بتایا "وہ گھر میں ہے نہیں۔ کمبل بھی نہیں ہے۔ بیچ کھایا ہے اس نے ــــ پکا جوار یا ہے باؤ جی! نیرا اسے تلاش کرتے ہیں، آیئے!"

تانگہ ایک گھنٹے تک مختلف مقامات پر رکتا رہا۔ آخر وہ ایک دودھ والے کی دکان پر رکا، تو یوسف چھلانگ مار کر نیچے اترا اور اس نے بنچ پر بیٹھے ہوئے۔ پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس ایک نوجوان کو پکڑ لیا۔ ضمیر نے سمجھ لیا کہ یہی اکبر ہے۔ اس نے تانگے سے اتر کر یوسف کو اشارہ کیا کہ اسے چھوڑ دو۔ یوسف کی گرفت ہلکی پڑ گئی، تو وہ اس کے قریب گیا اور بہت نرمی سے بولا: "اکبر! مجھے اس کمبل کی بڑی ضرورت ہے۔ وہ امانت تھی میرے پاس ــــ دے دو میرے بھائی!"

اکبر نے آنکھیں جھکا لیں، یوسف بولا: "باؤ! اس نے بیچ کھایا ہے اس کو۔"

"تم چپ رہو یوسف! میں خود بات کر رہا ہوں ــــ دیکھو اکبر! اگر ایسا ہے ــــ کسی کو دے دیا ہے، تو میں اس کی دوگنی قیمت ادا کر دیتا ہوں۔ جتنی رقم چاہیے لے لو۔" ضمیر نے جیب سے پھر پرس نکال لیا۔

"کچھ نہ دو باؤ۔ یہ" یوسف نے مداخلت کی۔ ضمیر نے خشمناک نظروں سے اسے دیکھا اور وہ اپنا فقرہ مکمل نہ کر سکا۔

اور تو کوئی بات نہیں اکبر! یہ امانت ہے اور تم کو خبر ہے نا کہ امانت۔"

اکبر نے سر ہلا کر کہا: "میں جانتا ہوں۔ باؤ جی!"

"لو یہ رقم رکھ لو ــــ کب لاؤ گے؟"

اکبر دو تین لمحے خاموش رہا۔ پھر کہنے لگا: "پیسے پاس رکھیے میں نے جو کچھ لیا ہے، وہ اسے دے دوں گا۔ کمبل آپ کو گھر پہ پہنچ جائے گا۔"

"جھوٹ بکتا ہے یہ، کمبل گھر پہ پہنچائے گا۔" یوسف یہ لفظ کہے بغیر نہ رہ سکا۔

"یوسف! تم خاموش رہو!" اور وہ اکبر کی طرف مڑا: "اکبر! یہ لے لو۔ بولو کب لاؤ گے کمبل؟"

اکبر نے نوٹ لے لئے۔ یوسف جلدی سے بولا: "باؤ! قیامت تک کمبل نہیں ملے گا۔ مجھ سے لکھوا لو۔"

"یوسف تم چپ نہیں ہو گے!" ضمیر نے ڈانٹ پلائی۔

"جناب! میں دن کا وعدہ نہیں کر سکتا۔ کل، پرسوں کمبل خود لے کر آجاؤں گا۔ مجھے آپ کا پتہ معلوم ہے!"

ضمیر نے دیکھا کہ اکبر کے لفظوں سے خلوص مترشح تھا اور اسے یقین ہو رہا تھا کہ اکبر جھوٹ نہیں بول رہا۔

ضمیر نے گھر پہنچ کر بیوی سے کہا: "رضیہ! کل یا پرسوں ایک شخص آئے گا۔ اپنا نام اکبر بتلائے گا۔ میں بنک میں ہوں، تو فوراً خبر کر دینا!"

"اچھا۔" رضیہ کا جواب تھا۔

"بھولنا بالکل نہیں!"

"اچھا۔"

O

اکبر نے کہا تھا، پرسوں میں کمبل لے آؤں گا، مگر تین دن بیت گئے تھے اور وہ نہیں آیا تھا۔ ضمیر کی بے تابی بڑھتی جا رہی تھی، یوسف کے الفاظ گرم ریت کے ذروں کی طرح اس کے دل و دماغ کو چبھنے لگے تھے۔ سوچتا۔۔۔ "اس نے درست کہا تھا۔ یہ اکبر جواری ہے اس نے روپیہ جوئے میں ہار دیا ہوگا!" اتنا کچھ کرنے اور روپیہ ضائع کرنے کے بعد بھی وہ اسی منزل پر تھا جس منزل پر اپنے ٹرنک میں کمبل نہ ملنے پر تھا۔

O

پانچویں روز صبح کے وقت شیشے کے سامنے کھڑا شیو کر رہا تھا کہ اس کا لڑکا اوپر آیا اور اسے اطلاع دی: "ابو! ایک آدمی آیا ہے۔"

"اکبر؟" اس نے اضطراب کے عالم میں بیٹے سے پوچھا، لیکن لڑکا کوئی جواب نہ دے سکا۔ اس نے جلدی جلدی بلیڈ رخساروں پر پھیرا۔ تولیے سے چہرہ پونچھا اور نیچے چلا گیا۔

دروازے پر اکبر کھڑا تھا جس نے اخبار کے کاغذوں میں کوئی چیز چھپا رکھی تھی۔ ضمیر خوش ہو کر بولا: "لے آئے؟"

"ہاں جی"

ضمیر نے لے تا بانہ ہاتھ بڑھا دیے۔۔۔ ذرا کاغذ ہٹا کر دیکھا۔ بھورے رنگ کا دری پرانا کمبل تھا۔ اس نے اکبر سے کہا! "آؤ اندر چل کر بیٹھو!"

"نہیں جی، ذرا جلدی جانا ہے"

"تو ذرا ٹھہرو۔" ضمیر کمبل کو سینے سے لگائے ہوئے اندر گیا اور بلند آواز میں بولا: "رضیہ! رضیہ!"

رضیہ باورچی خانے میں دودھ ابال رہی تھی۔ بچے کتابیں اپنے اپنے بیگ میں ڈال رہے تھے۔ انہوں نے باپ کو اس طرح چلاتے ہوئے دیکھا، تو کتابیں چھوڑ چھاڑ اس کی طرف بھاگے۔ رضیہ بھی آ گئی۔

"رضیہ! یہ دیکھو، وہ ۔۔۔ کمبل!"

"مبارک ہو۔" رضیہ نے ایسے لہجے میں جواب دیا جس سے کوئی خوشی، کوئی اطمینان ظاہر نہیں ہوتا تھا۔

"وہ باہر کھڑا ہے ۔۔۔ جو یہ لایا ہے۔ میرا پرس اوپر ہے۔ کچھ روپے دے دو!"

رضیہ نے الماری میں سے اپنا پرس نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ ضمیر نے پیکٹ میز کے اوپر رکھ دیا اور پرس لے کر باہر چلا گیا اور اکبر کی طرف دیکھ کر بولا۔ "شکریہ! بہت بہت شکریہ یہ لو تمہارا انعام!" اور پرس میں سے کچھ نوٹ نکالے اور اکبر کو دے دیئے۔

اندر آ کر ضمیر نے جلدی جلدی دو ٹوسٹ کھائے، ایک پیالی چائے کی پی اور کمبل کے پیکٹ کو بغل میں داب کر باہر جانے لگا۔ رضیہ بچوں کو کرسیوں پر بیٹھنے کی ہدایت کر رہی تھی جو پریشان سے ہو کر باپ کو دیکھ رہے تھے۔

"بینک سے فون آئے گا۔ تم مناسب جواب دے دینا۔ آج میں وہاں نہ جا سکوں گا۔" ضمیر نے کہا۔ رضیہ نے سمجھ لیا تھا کہ اس کا شوہر سیدھا پنڈی جا رہا ہے۔

بچے چپ چاپ کھڑے تھے اور ان کی کتابیں ابھی تک میز پر بکھری ہوئی تھیں۔

"کتابیں سنبھالو!" رضیہ نے بچوں کو حکم دیا اور بچے کتابوں پر جھک گئے۔ ضمیر دروازے میں سے نکل رہا تھا۔

O

ضمیر جب لگژری کوچ سے نیچے اترا تو دھوپ پھیل چکی تھی۔ اس نے جیب سے الطاف احمد کا لفافہ نکالا اور اپنی منزلِ مقصود کا پتہ دیکھا۔

مری روڈ، پٹرول پمپ سے کچھ آگے، کوٹھی کے باہر شیخ نواز احمد گورنمنٹ کنٹریکٹر۔ اس نے اشارہ کر کے ایک ٹیکسی رکوالی۔ ڈرائیور کو پتہ بتایا اور ٹیکسی کے اندر بیٹھ گیا۔

ٹیکسی جا رہی تھی اور اس کے دل و دماغ پر ایک ایسی کیفیت طاری تھی جس کا تجربہ وہ اپنی زندگی میں پہلی بار کر رہا تھا۔ وہ اپنے خیالوں میں ایک ایسا چہرہ دیکھ رہا تھا جس پر بیک وقت معصومیت بھی تھی، پیار بھی اور گہری ہمدردی بھی۔ اس چہرے پر پیشانی کے نیچے جو آنکھیں جھکی جھکی سی تھیں، ان سے ایک عجیب معصومانہ مسکراہٹ پھوٹ رہی تھی۔

یہ چہرہ اس کے روم میٹ نواز احمد کا تھا۔ وہ سوچنے لگا "اب نہ جانے اس کے چہرے میں کتنی تبدیلی آ چکی ہوگی اور جب وہ مجھے اچانک دیکھے گا اور میں اسے کمبل دکھاؤں گا جو ہماری مشترکہ محبت کی یادگار ہے جو میرے پاس اسکی امانت ہے، تو وہ کیا کرے گا۔ اس کی کیا حالت ہوگی۔ کس طرح بے تابانہ ——— مجھ سے چمٹ جائے گا!

اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

ٹیکسی ایک جگہ پہنچ کر رک گئی تھی، مگر ضمیر اپنے خیالوں میں ڈوبا ہوا تھا۔

"سر! وہ سامنے شیخ صاحب کی کوٹھی ہے!"

ضمیر ٹیکسی سے اترا۔ ڈرائیور کو کرایہ ادا کیا اور ایک طرف جانے لگا۔

کوٹھی کے دروازے کے پہلو میں نیم پلیٹ پر ابھرے ہوئے لفظوں میں لکھا تھا: شیخ نواز احمد گورنمنٹ کنٹریکٹر۔

کمرے کے اندر سے آوازوں کا ایک طوفان باہر آ رہا تھا۔ ان آوازوں میں بلند قہقہے بھی تھے اور برتنوں کی کھنکھناہٹ بھی۔ ایک شخص، جو وضع قطع سے نوکر نظر آ رہا تھا، چائے دانی لئے اندر جا رہا تھا۔ ضمیر نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک لیا۔ "شیخ صاحب سے کہو، لاہور سے ضمیر خان آیا ہے!"

نوکر اندر چلا گیا۔ ایک منٹ بعد اس نے باہر آ کر کہا "چلے جائیے!"

ضمیر نے پیکٹ بائیں بغل سے نکال کر دائیں بغل میں داب لیا۔ اندر صوفوں اور کرسیوں پر بہت سے لوگ بیٹھے ہنس رہے تھے۔ چائے پی رہے تھے۔ زور زور سے باتیں کر رہے تھے۔

"شیخ نواز احمد!" ضمیر نے دروازے پر رُک کر کہا۔

بیک وقت کئی ہاتھ ایک لحیم و شحیم آدمی کی طرف اُٹھے جو تنہا کوچ پر بیٹھا تھا۔

"کون صاحب!" لحیم و شحیم آدمی نے پوچھا۔

"نواز احمد ــــ آپ؟"

"جی فرمائیے!"

ضمیر نے حیرت سے گوشت کے اس ڈھیر کی طرف دیکھا۔

"میں ضمیر خاں ہوں۔"

"ضمیر خاں ــــ کون ضمیر خاں؟"

شیخ صاحب کی آنکھوں سے اجنبیت جھلک رہی تھی۔

"ضمیر خاں ــــ ایڈوانہ ہوسٹل میں ہم نے ڈیڑھ سال اکٹھے بسر کیا تھا ــــ ایک ساتھ!"

شیخ صاحب اسے گھور گھور کر دیکھنے لگے تھے۔ ذرا دیر رُک کر بولے "معاف کیجئے ــــ میں ــــ خیر بتائیے کیسے آنا ہوا؟"

ضمیر نے محسوس کیا کہ برف کا ایک بھاری تودہ اس کے سر پر آ گرا ہے۔ شیخ صاحب اسی انداز سے اسے دیکھ رہے تھے۔

"آپ کو یاد ہوگا۔ اپنا کمبل چھوڑ کر آپ چلے گئے تھے۔ یہ میرے پاس رہ گیا تھا۔ آپ کی امانت تھا ـــ آج ـــ"

ضمیر نے پیکٹ بغل سے نکال کر کہا۔

"لاحول ولا ـــ اس تکلف کی کیا ضرورت تھی" شیخ صاحب کی آنکھیں جیسے اس کی حماقت پر مسکرا رہی تھیں۔ "غلام احمد! صاحب سے لے لو!"

اپنے مالک کا حکم سن کر نوکر نے ضمیر سے پیکٹ لے لیا۔ "بیٹھیں گے نہیں؟" شیخ صاحب نے اکتائے ہوئے انداز میں پوچھا۔

"جی نہیں شکریہ" اور ضمیر باہر آ گیا ـــ اس کا تعاقب قہقہوں نے کیا جو اندر بلند ہو گئے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا گیا۔ کوٹھی سے باہر آ گیا۔ اسے چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آ رہا تھا اور برف کے تودے لگاتار اس کے سر پہ گر رہے تھے۔

ساتواں چراغ

گرمی ہو یا سردی۔ شمالی پہاڑی کی بلندیوں سے سرد ہوائیں مسلسل نیچے اترتی رہتی تھیں۔ کبھی تو بڑی بوجھل ہوتیں اور کبھی نسبتاً ہلکی، یہ ہوائیں جب بھی اس بے آب و گیاہ علاقے میں سے گزرتی تھیں تو کہیں بھی ٹھہرنے کا نام نہیں لیتی تھیں کیونکہ کوئی دیوار، درختوں کی کوئی قطار ان کے راستے میں حائل نہیں ہو سکتی تھی۔ برابر آگے بڑھتی چلی جاتیں اور گو باباصاحب کے مقبرے تک پہنچتے پہنچتے ان کی رفتار کبھی کبھی مدھم بھی پڑ جاتی تھی تاہم جس وقت بھی وہ اس مقبرے کی بوسیدہ دیواروں سے ٹکراتی تھیں تو دیکھنے والے کو فوراً یہ احساس ہو جاتا تھا کہ یہ دیواریں فی الفور زمین بوس ہو جائیں گی، مگر برسوں سے ہواؤں کا یہ عمل جاری تھا اور مقبرے کی یہ کمزور دیواریں بدستور اپنی اپنی جگہ پر کھڑی تھیں۔ یہ ضرور ہے کہ ان میں کہیں کہیں رخنے پڑ گئے تھے اور ہواؤں کے جھونکے ان رخنوں میں سے گزر کر ٹوٹے پھوٹے مزار کو چھوتے ہوئے آگے نکل جاتے تھے۔

"یہ باباصاحب کون تھے؟ ان کی یہ ابدی قیام گاہ کب تعمیر ہوئی تھی اور ان دیواروں نے کب سر اٹھایا تھا؟۔ ان باتوں کا کسی کو بھی علم نہیں تھا۔

"باباصاحب کے مقبرے سے ڈیڑھ میل دور جنوب کی جانب ایک چھوٹا سا گاؤں جی جی پور کے نام سے ضرور آباد تھا لیکن اس گاؤں کا بوڑھے سے بوڑھا آدمی بھی ان سوالوں کا جواب دینے سے قاصر تھا۔

اس گاؤں کو آباد ہوئے نصف صدی سے زیادہ مدت نہیں بیتی تھی۔ اس سے پہلے یہاں پانی ہی پانی تھا۔ پھر جب اس پانی کو مصرف میں لانے کے لئے ایک قریبی نہر میں منتقل کر دیا گیا

تو دلدلی علاقہ سورج کی تمازت سے سوکھ کر اس قابل ہو گیا کہ یہاں لوگ کچے پکے مکان بنا سکیں اور ارد گرد دیہات میں رہنے والوں نے میلوں پھیلی ہوئی اس زمین کو دیکھا جہاں وہ آسانی سے مکانات تعمیر کر سکتے تھے۔ کھیت بنا کر فصلیں اگا سکتے تھے تو وہ ادھر آنے لگے اور چند ہی سال میں یہاں اچھی خاصی آبادی ہو گئی۔

اس گاؤں کا نام جی جی پور کیسے پڑا؟ اس سلسلے میں گاؤں کے پرانے لوگ بتاتے تھے کہ جب ان میں سے کسی نے سب سے پہلا مکان بنایا تو یہاں ایک جھونپڑی میں ایک بوڑھا شخص رہتا تھا جو بالعموم نیم عریاں حالت میں دکھائی دیتا تھا۔

اس شخص نے بتایا کہ وہ بابا صاحب کا مرید خاص تھا۔ چنانچہ وہ دن کا سارا وقت تو اپنی جھونپڑی ہی میں بسر کرتا تھا اور جیسے ہی شام کی تاریکی فضاؤں میں پھیلنے لگتی تھی۔ بابا صاحب کے مزار پر چلا جاتا تھا اور تمام رات وہیں گزار دیتا تھا۔

بابا صاحب کو ماننے والے لوگ مزار پر کچھ نہ کچھ نذر نیاز چڑھاتے رہتے تھے۔ یہ شخص اس میں سے تھوڑا سا حصہ وصول کر کے باقی زائرین ہی میں بانٹ دیتا تھا اور یوں اس کے لیے قوت یا موت کا سامان مہیا ہو جاتا تھا۔

گاؤں کا نام اسی شخص کی نسبت سے مشہور ہوا تھا۔ اس کا حقیقی یا پیدائشی نام کیا تھا کسی کو بھی معلوم نہیں تھا اور نہ وہ کسی کو اپنے بارے میں معلومات بہم پہنچانے کا خواہش مند ہی تھا اصل معاملہ یہ تھا کہ وہ ہر دوسرے فقرے پر جی جی کہتا تھا۔ یوں کہنا چاہیئے کہ جی جی اس کا تکیۂ کلام تھا۔ اس کے پاس عقیدت سے آنے والوں نے اسے بار بار جی جی کہتے سنا تو اس کا نام ہی جی جی میاں، لینے لگے اور اس طرح یہ گاؤں جی جی پور مشہور ہو گیا۔

گاؤں والے جی جی میاں کا بہت احترام کرتے تھے اور جو کچھ وہ کہتا تھا اسے صحیح تسلیم کر لیتے تھے۔ اس جی جی میاں نے گاؤں کے خاص خاص لوگوں کو بتایا تھا کہ بابا صاحب بڑے اونچے درجے کے بزرگ تھے۔ مگر طبیعت کے لحاظ سے تھے جلالی۔ بڑی جلدی جلال میں آجاتے تھے

اور بڑے سے بڑے آدمی کو بھی بلا تکلف جھڑک دیتے تھے۔

شاید انہی جی جی میاں نے بتایا تھا اگر باباصاحب کے مزار پہ ہر جمعرات کو مٹی کا ایک چراغ جلایا جائے تو ساتویں جمعرات کو جب آخری چراغ جلایا جائے گا تو چراغ جلانے والے کی دلی آرزو پوری ہو جائے گی۔

چراغ جلایا جاتا تھا مگر ابھی اسے مزار پہ رکھا ہی نہیں جاتا تھا کہ شمالی پہاڑوں کی طرف سے آنے والی سرد ہوائیں اسے بجھا دیتی تھیں۔ گاؤں میں شاید ہی کوئی ایسا فرد ہوگا جسے اس کا علم نہیں تھا اور جس کے دل میں یہ یقین جاگزیں نہیں تھا کہ ساتویں جمعرات کو چراغ جلانے والے کی آرزو ضرور پوری ہو جاتی ہے لیکن مشکل یہ تھی کہ اس آزمائش پہ پورا اترنا قریب قریب ناممکن تھا۔ ہوتا یہ تھا کہ اول تو پہلی جمعرات ہی کو چراغ کی لو شمالی ہواؤں کے حملے سے سیاہ پوش ہو جاتی تھی اور اگر پہلے دو تین چراغ صحیح سلامت مزار تک پہنچ بھی جاتے تھے تو ان کے بعد جو چراغ جلایا جاتا تھا وہ ضرور بجھ جاتا تھا۔ عام یقین یہ تھا کہ اب تک جو کوئی شخص بھی یکے بعد دیگرے سات چراغ جلانے میں کامیاب نہیں ہو سکا تو اس کی وجہ باباصاحب کی جلالی طبیعت کی کارفرمائی ہے ورنہ شمالی پہاڑوں کی بلندیوں سے آنے والی سرد ہواؤں کا یہ کہاں حوصلہ کہ وہ عین اس لمحے دیوار کے روزنوں سے اندر آئیں جب مزار کے قریب چراغ جلایا جا رہا ہو۔ یوں ساتواں چراغ جلانے کی کبھی نوبت ہی نہیں آئی تھی البتہ بعض لوگوں کی زبانی یہ بات سنی جاتی تھی کہ کافی مدت ہوئی ایک بار ایک دھوبن نے مزار پہ ساتواں چراغ بھی جلا دیا تھا اور اس کی مراد بھی پوری ہو گئی تھی۔ اس کا بیٹا جو قتل کے مقدمے میں ماخوذ تھا پھانسی کی کوٹھڑی سے باہر نکل آیا تھا۔

اس حقیقت کی تصدیق اس وجہ سے نہیں ہو سکتی تھی کہ یہ ماں اور بیٹا دونوں دنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔

اگر کوئی شخص مقبرے کے اندر جانے کی بجائے اس کے ارد گرد گھومتا تو اسے بے شمار ٹوٹے

ہوئے مٹی کے چراغ نظر آ جاتے۔ یہ وہ چراغ تھے جو مزار پر دو دو تین تین یا زیادہ سے زیادہ چار چار کی تعداد میں جلے تھے اور چونکہ یہ چراغ جلانے والے وہ شرط پوری نہیں کر سکے تھے۔ یعنی سات جمعراتوں تک سات چراغ نہیں جلا سکے تھے۔ اس لئے ان کے چراغ مزار سے اٹھا کر باہر پھینک دیئے گئے تھے تاکہ نئے مرادیں مانگنے والوں کو بھی قسمت آزمائی کا موقع ملتا رہے۔

یہ چراغ باہر کون پھینک دیتا تھا۔ اس سوال کے مختلف جواب دیئے جاتے تھے۔ کچھ لوگ کہتے تھے کہ بابا صاحب کے واحد مرید جی جی میاں جو ایک روز چپ چاپ اپنی جھونپڑی چھوڑ کر اس طرح غائب ہو گیا تھا کہ پھر کبھی دکھائی نہیں دیا تھا۔ وہی آدھی رات کو باقاعدہ یہاں آتا ہے اور چراغ باہر پھینک دیتا ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ شمال سے آنے والی سرد ہوائیں ہی ان چراغوں کو دھکیلتی ہوئی دروازے سے باہر لے جاتی ہیں اور یہ چراغ اس عمل کے دوران ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں۔

جی جی گاؤں کا سب سے متمول آدمی ناصر خاں تھا جس کی زرعی اراضی بیس مربعوں پر مشتمل تھی اور جس کی حویلی کے دالان میں سو کے قریب چارپائیاں بچھائی جا سکتی تھیں۔ ناصر خان ان آباد کاروں میں سے تھا جو سب سے پہلے یہاں آئے تھے۔ آدمی تجربہ کار اور معاملہ فہم تھا۔ اس نے حال کے آئینے میں مستقبل کے واضح خدوخال دیکھ لئے تھے وہ کشتیاں جلا کر یہاں آیا تھا یعنی اس نے اپنی تھوڑی سی شہری جائداد فروخت کر دی تھی اور ہمیشہ کے لئے اس اجاڑ مقام پر رہائش پذیر ہو گیا تھا اس نے وقت سے فائدہ اٹھا کر زیادہ سے زیادہ اراضی پر اپنی ملکیت جمالی تھی۔ پیسہ پاس تھا۔ غریب لوگوں کو اپنا مزارع بنا لیا اور اس طرح اس کی دولت اور ذاتی وجاہت میں دن رات اضافہ ہونے لگا۔

گاؤں کے لوگوں کی تو بیشتر آبادی اس نتیجے پر پہنچ چکی تھی کہ بابا صاحب کے مزار پہ جا کر چراغ جلانے کی شرط پوری کرنا بہت مشکل ہے اس لئے وہ لوگ ادھر کا رُخ ہی نہیں کرتے تھے۔ کبھی کبھی کسی کے دل میں بے اختیار خواہش پیدا ہو جاتی تھی تو وہ اپنے کٹھن سفر پہ روانہ ہو جاتا

تھا لیکن چوتھے پانچویں چراغ کے بجھ جانے پر اس کی اپنی طبیعت اس طرح بجھ جاتی تھی کہ وہ پھر زندگی بھر ادھر کا رخ نہیں کرتا تھا البتہ شہر سے کوئی نہ کوئی آتا ہی رہتا تھا اور جو بھی آتا تھا وہ سیدھا ناصر خان کی حویلی کی طرف جاتا تھا اور ناصر خان اس وقت اس کے رہنے سہنے کا بندوبست اپنی حویلی میں کر دیتا تھا اور پہلے دن کے بعد اس سے یکسر بے نیاز ہو جاتا تھا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ یہ مہمان دو تین جمعراتیں یہیں بسر کرے گا اور جاتے ہوئے ملے گا بھی نہیں، مہینے میں ایک دو قسمت آزما ضرور آ جاتے تھے۔ کوئی مرد تو شاذ ہی آتا تھا۔ عام طور پر عورتیں اور وہ بھی عمر رسیدہ آتی رہتی تھیں مگر اس مرتبہ ایسا ہوا کہ تین مہینے گزر گئے اور ناصر خان کی حویلی کے بڑے پھاٹک پر کسی نے بھی دستک نہ دی۔ نہ جانے گاؤں والوں کو اس سے اپنی اجتماعی زندگی میں ایک خلا کیوں محسوس ہونے لگا تھا چوپال میں جب بھی کچھ لوگ بیٹھتے تھے تو ہیر رانجھا یا نہ بیتون نامہ سننے سے پہلے اس کمی کا تذکرہ ضرور کرتے تھے اور ناصر خان کے منشی منظور ے کو تو یقین ہو گیا تھا کہ اب یہاں کوئی نہیں آئے گا چنانچہ اس نے حویلی کے چوکیدار سے کہہ دیا تھا۔

"چاچا رات کو آرام سے سو جایا کر۔ بابا صاحب کے مزار پر کوئی نہیں آئے گا۔"

اور چوکیدار چاچا مرزد نے یہ بات پلے باندھ لی تھی۔ وہ اس امر سے بے نیاز ہو گیا تھا کہ جمعرات کو کوئی شخص مٹی کا چراغ اور ماچس لے کر حویلی سے نکلے گا اور آدھی رات سے پہلے پہلے لوٹ آئے گا۔ وہ پھاٹک کے پہلو میں رکھے ہوئے پنچ کے اوپر بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگتا تھا اور پھر اونگھتے اونگھتے سو جاتا تھا۔

چوتھے مہینے کا پہلا ہفتہ شروع ہو گیا تھا۔ شام گہری ہوتی جا رہی تھی کہ جاگیردار ناصر خان اپنی سفید گھوڑی سے نیچے اترا اور اسے مرزو کے حوالے کر کے پھاٹک کی طرف جا رہا تھا کہ ایک بوڑھیا نے جس کا لباس میلا کچیلا تھا اور جس نے ہاتھ میں ایک تھیلا اٹھا رکھا تھا۔ پھاٹک کے پاس ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔

ناصر خان بارہا ایسے لوگوں سے پھاٹک کے سامنے مل چکا تھا اس لئے یہ اندازہ لگانے میں اسے کوئی دقت نہ ہوئی کہ یہ عورت کس مقصد کے ساتھ آئی ہے اور اس سے کیا توقع رکھتی ہے

"ٹھیک ہے" ناصر خان نے رٹا رٹایا جملہ بڑھیا کی طرف پھینک دیا۔

ناصر خان جب یہ جملہ زبان سے نکالتا تھا تو اسے کچھ اور کہنے سننے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی چوکیدار مہمان کو ساتھ لے کر اسے حویلی کے ایک کمرے میں پہنچا دیتا تھا اور اس وقت اس کے قیام تک کھانے پینے کا بھی بندوبست کر دیتا تھا۔

ناصر خان پھاٹک کے اندر چلا گیا تھا معمول کے مطابق بوڑھیا کو چوکیدار کے ساتھ اس کے پیچھے پیچھے قدم اٹھانا چاہیئے تھا مگر وہ وہیں کھڑی رہی۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا تو اب کیوں ہو رہا تھا۔ ناصر خان چند قدم چل کر رک گیا۔

"مرزو!" اس نے چوکیدار کو پکارا۔

چوکیدار نے بوڑھیا کو چلنے کا اشارہ کیا اور وہ چلنے لگی۔

ناصر خان نے پھاٹک کے اوپر جلتے ہوئے سو پاور کے بلب کی روشنی میں بوڑھیا کو دیکھا۔ اس چہرے میں اسے ایک عجیب کیفیت کا احساس ہوا۔ اسے یاد آگیا کہ ایسی کیفیت اس نے اس خاتون کے چہرے پر بھی دیکھی تھی جو مزار پہ ساتواں چراغ جلا کر اپنی مراد پا چکی تھی۔

"تو کون ہے" جاگیردار کے لہجے میں کرختگی تھی۔

"میں ماں ہوں" بوڑھیا بس یہی لفظ کہہ سکی۔

وہ گھور گھور کر اسے دیکھ رہا تھا۔

"اماں! تو کرتی کیا ہے؟"

"پُتر! میں تو بن"

ناصر اس کے قریب آ گیا۔

"تو بھی؟"

بوڑھیا اس کا مطلب نہ سمجھ سکی۔

"اماں تو بھی ساتواں چراغ جلالے گی"

بوڑھیا کا چہرہ جو پہلے تذبذب کا تاثر لئے ہوئے تھا اس پر ایک ایسا نور جھلملانے لگا جو طلوعِ آفتاب کے وقت مشرقی افق پر تھوڑی دیر کے لئے برقرار رہتا ہے اور پھر غائب ہو جاتا ہے۔

ناصر خان چند لمحے وہاں ٹھہر کر چلا گیا۔

بوڑھیا کمرے میں داخل ہوئی تو اس کی نظر سب سے پہلے مٹی کے ان چند چراغوں پر پڑی جو ایک طرف ایک چھوٹی سی میز کے اوپر پڑے تھے۔ چراغوں کے پاس کچھ روئی بھی نظر آ رہی تھی۔

میز کے علاوہ کمرے کے اندر ایک چارپائی بھی تھی۔ ٹین کا ایک لوٹا، ایک دیگچی اور اس قسم کی گھریلو استعمال کی کچھ اور چیزیں بھی موجود تھیں۔

چوکیدار بجلی کا بلب روشن کر کے کمرے سے باہر نکل گیا۔ بوڑھیا دروازے کے قریب رُک کر کمرے کا جائزہ لیتی رہی۔ اس کے دل میں ایک ہیجان سا برپا ہو گیا۔ اس نے اپنا تھیلا میز کے اوپر رکھ دیا اور اس کی انگلیاں اُن چراغوں کو چھونے لگیں جن میں تیل کی ایک بوند بھی نہیں پڑی تھی۔ اسے یکایک خیال آیا کہ جو بھی یہ چراغ لایا ہوگا وہ کتنی آس کے ساتھ آیا ہوگا اور پھر مایوس ہو کر چلا گیا ہوگا۔

اسے اپنا خیال آ گیا۔ وہ ایک ایسے کپڑے کی طرح تھی جس کو دھو کر پوری طرح اس کا پانی نہ نچوڑا گیا ہو اور اس حالت میں سبز گھاس پہ بکھیر دیا گیا ہو۔

دُھوپ کی شدت کپڑے کے اس باقی پانی کو بھی چوس لے گی۔

اس کا سر گھومنے لگا اور وہ چارپائی پر گرنے ہی والی تھی کہ جاگیردار کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگے۔" وہاں تو بھی ساتواں چراغ جلالے گی"۔ اور اس کے باطن میں پھر ایک

اضطراب پیدا ہو گیا۔

جمعرات آنے میں دو دن باقی تھے۔ دوسرے دن صبح سویرے اس نے تھیلے میں سے ساری چیزیں میز پر انڈیل دیں۔ ان میں کڑوے تیل کی ایک بڑی بوتل تھی۔ دس بارہ مٹی کے چراغ اور روئی کا ایک بنڈل۔

جس وقت وہ تھوڑی تھوڑی روئی لے کر بتیاں بنا رہی تھی تو ایک دم اسے احساس ہوا کہ وہ کسی اجنبی جگہ پر نہیں، موچی دروازے کے اندر اپنے چھوٹے سے جدی مکان میں ہے اور ہانڈی چولہے پر رکھ کر پرانے مونڈھے پر بیٹھی دروازے کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہی ہے جہاں وہ چہرہ نظر نہیں آتا جو نو سال پہلے غائب ہو گیا تھا۔

شوہر کی وفات کے بعد اس کا بیٹا چراغ دین ہی اس کا واحد سہارا تھا۔ بارہ سال تک وہ بڑا ذمے دار بیٹا بنا رہا۔ ماں کو کبھی اس سے کسی قسم کی شکایت نہ ہوئی۔ محلے کے بیسیوں گھروں تک جانا، وہاں سے میلے کپڑے لانا۔ ہر ہفتے ان سب کپڑوں کی لدیاں بنا کر دریا پہ لے جانا۔ دوسروں کے ساتھ مل کر انہیں دھونا اور پھیلی ہوئی ریت پر سکھانے کے لئے پھیلا دینا شام کے بعد انہیں اپنے بیل پر لاد کر گھر لے آنا اور رات کو گیارہ بارہ بجے تک ان پر استری پھیر کر الگ الگ گاہکوں کے کپڑے تہہ کر کے رکھ دینا اور دوسرے روز صبح سے لے کر تیسرے پہر تک گھر گھر کپڑے پہنچا کر اجرت وصول کرنا۔ یہ سب کام وہ بڑی باقاعدگی کے ساتھ کرتا رہتا۔ ان سب کاموں میں اس کی ماں بھی برابر اس کی مدد کرتی رہتی تھی مگر وہ چاہتا نہیں تھا کہ ماں کی بوڑھی ہڈیوں کو تکلیف دے۔

تیرھواں سال شروع ہوا تو نہ جانے کس طرح سے اسے جوئے کی لت پڑ گئی۔ کئی دن اور کئی راتیں حوالات میں بھی گزار دیں لیکن یہ لت دور نہ ہو سکی بلکہ بڑھتی چلی گئی۔ ایک رات وہ بڑی دیر سے گھر میں آیا۔ صبح اسے ایک ہمسائے نے بتایا کہ اسے گرفتار کرنے کے لئے پولیس آ رہی ہے۔ اس نے ابھی کلیجے کا ایک ہی لقمہ دہی میں لتھڑا کر حلق سے اتارا ہو گا کہ جلدی سے پاؤں میں

جوتے ڈال کر سیڑھیوں سے اترنے لگا۔ ماں پیچھے آوازیں ہی دیتی رہ گئی۔

اس کے بعد اس کی ماں اس کی صورت نہ دیکھ سکی۔

اس کی زندگی کے سب سے خوشگوار اور مسرت بخش وہ لمحے ہوتے تھے جب وہ دروازے پر کھڑی ہو کر اپنے بیٹے کے بیل کی گھنٹیوں کی آواز سنا کرتی تھی۔ یہ بیل شام کے بعد واپس گلی میں داخل ہوتا تھا اور گلی میں داخل ہوتے ہی اس کی گھنٹیاں بجنے لگتی تھیں۔ گھنٹیوں کی آواز سن کر وہ تیزی سے دروازے پر آ کھڑی ہوتی اور جب تک ایک ایک کر کے ساری لڑیاں اندر رکھوا نہیں لیتی تھی اسے چین نہیں پڑتا تھا۔

وہ سارے کام مزے لے لے کر کرتی تھی استری میں سے بجھی بجھی راکھ باہر نکالتی تھی۔ لمبے چوڑے تختے پر جس کے اوپر ایک ایک کپڑا بچھا کر استری کی جاتی تھی۔ اس کی چادر بدل دیتی تھی کوئلوں کے ڈھیر پر ایک نظر ڈال کر یہ اندازہ کر لیتی تھی کہ ان سے کام چل سکتا ہے یا نہیں، نیم سوختہ کوئلے رکھ کر باقی راکھ لے باہر پھینک دیتی تھی۔

چراغ ابھی گھر سے دور ہی ہوتا تھا کہ وہ صدقے جاواں۔ واری جاواں کہہ کر اس سے جا کر لپٹ جاتی تھی۔

مگر پچھلے نو سال سے اس کے گھر میں اور اس کے دل میں تاریکیاں ہی تاریکیاں چھا چکی تھیں۔ اپنے بیٹے کو پانے کی خاطر اس نے کیا کچھ نہیں کیا تھا۔ سیانوں نے جو کچھ کہا تھا وہ کر چکی تھی مگر اب وہ تھک چکی تھی۔ بالکل مایوس ہو چکی تھی کہ اس نے بابا صاحب کی کرامت کا حال سنا اور وہ اسے آخری سہارا سمجھ کر جاگیردار کے یہاں آ گئی۔

اس کی آنکھیں دروازے پر جمی تھیں اور اس کی انگلیاں متواتر حرکت کر رہی تھیں۔ اس کے سامنے بتیوں کا ایک ڈھیر لگ گیا تھا۔

"اتنی ساری بتیاں۔ اچار ڈالنا ہے؟"

یہ الفاظ جاگیردار ناصر خان نے کہے تھے جو شاید جب سے حویلی بنی تھی تیسری مرتبہ اس

کمرے میں داخل ہوا تھا۔

بوڑھیا نے ایک نظر بتیوں پر ڈالی اور پھر ناصر خان کو دیکھنے لگی جس کی مونچھوں کے بال جھک کر ٹھوڑی کو چھونے کی کوشش کر رہے تھے۔

"میں نے سنا ہے تمہارا بیٹا نو سال سے غیب ہے۔"

بوڑھیا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

ناصر خان چارپائی پر بیٹھ گیا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" اس نے بوڑھیا سے پوچھا۔

"فاطمہ!"

"فاطمہ" ناصر خان نے چند سیکنڈ بوڑھیا کو گھور کر دیکھا اور پھر یوں سر ہلانے لگا جیسے اس کے دل میں کسی بات کی تصدیق ہو گئی ہے۔

"کوئی تکلیف؟"

بوڑھیا نے نفی میں سر ہلا دیا۔

کمرے سے باہر ناصر خاں کا منشی ہاتھ میں حساب کتاب کے لمبے لمبے رجسٹر لئے اپنے مالک کے فارغ ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ ناصر خان کی اس پر نظر پڑی تو دروازے کی طرف جانے لگا۔

جمعرات کی شام کو جھکڑ چلنا شروع ہو گیا تھا۔ بوڑھیا نے چراغ میں بتی اور تیل ڈالا دوسرے ہاتھ میں ماچس پکڑی بسم اللہ کہہ کر تنہا مزار کی طرف روانہ ہو گئی۔

کسان کھیتوں سے لوٹ رہے تھے اور ان کے بیلوں کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ بوڑھیا کے قدموں میں تیزی آ گئی۔ سنسان راستوں سے گزرتی ہوئی وہ مقبرے کے اندر داخل ہو گئی۔ اندر داخل ہوتے وقت بھی اس کے کانوں میں بیلوں کی گھنٹیوں کی آواز گونج رہی تھی اور وہ ان سرما کی ہواؤں سے بے نیاز تھی جس کے جھونکے مقبرے کی دیواروں سے ٹکرا کر مسلسل شور برپا کر رہے تھے۔

اس نے تیلی کو ماچس کے کنارے پر رگڑا۔ آہستہ سے اسے بتی کی لو کی طرف بڑھایا۔ ایک

ہلکی سی روشنی پھوٹ پڑی۔ جلتا ہوا چراغ اس نے مزار کے ایک طرف رکھ دیا۔ دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے اور چند لمحوں بعد انگلیوں سے رخساروں پر بہتے ہوئے آنسوؤں کو خشک کر کے جلتے ہوئے چراغ پر آخری نظر ڈال کر باہر نکل گئی۔

وہ قدم اٹھا رہی تھی مگر اسے احساس نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے۔ کہاں جا رہی ہے۔ یکایک حویلی کے چوکیدار نے کرخت لہجے میں پوچھا۔

"کیا ہوا مائی صاب!"

بوڑھیا نے اپنی شہادت کی انگلی اوپر اٹھائی اور پھاٹک میں سے نکل گئی۔

کمرے میں جا کر اس نے ماچس میز کے اوپر رکھ دی۔ چارپائی پر جا بیٹھی۔ اس نے دیکھا کہ کمرے کے اندر آتے وقت اس نے دروازہ بند کر دیا تھا۔ بند دروازہ دیکھ کر اس کے ذہن میں نہ جانے کیا خیال آیا کہ اس وقت وہاں جا کر اس کے دونوں پٹ کھول دیئے اور ٹکٹکی باندھ کر ادھر دیکھنے لگی۔

دوسری، تیسری اور پھر چوتھی جمعرات بھی گزر گئی اور بادِ شمال کے سرد جھونکے اس کے جلائے ہوئے چراغوں کی لوؤں کا کچھ نہیں بگاڑ سکے تھے۔

پانچویں جمعرات کو جب اس نے چراغ جا کر مزار کے پہلو میں رکھا اور مدھم روشنی میں دعا کے لئے ہاتھ پھیلائے تو اسے یکدم احساس ہوا کہ ایک سایہ اس کے قریب حرکت کر رہا ہے۔ اس احساس کے باوجود اس کے نم آلود ہونٹ لرزتے رہے۔

دونوں ہاتھ منہ پر پھیر کر وہ مڑی۔ اور اس نے دیکھا کہ ایک جلتا ہوا چراغ مزار کے دوسرے پہلو کی طرف جھکا جا رہا ہے اور دوسرے ہی لمحے میں اسے ایک دھندلا سا چہرہ دکھائی دینے لگا جس کے گرد دوپٹہ لپٹا ہوا تھا۔

دو تین لمحوں کے لئے دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ دونوں کے ہونٹ لرزتے رہے اور پھر دونوں کی نظریں جھک گئیں۔

ہوا تند و تیز تھی۔ اوپر کسی اڑتے ہوئے پرندے کی چیخ فضا میں تحلیل ہو گئی۔ وہ جب حویلی کے پھاٹک پر پہنچی تو اس مرتبہ چوکیدار مرزو نے کوئی سوال نہ کیا اور پھاٹک کا ایک پٹ کھول دیا۔

"یہ کون ہے؟" اس نے چارپائی پر لیٹ کر خود سے سوال کیا۔

"کوئی ہو گی۔ میری طرح بدنصیب۔ دکھیاری۔"

چھٹی جمعرات کو وہ بابا صاحب کے مزار کے پاس پہنچی تو اسے مزار کے پہلو میں ایک جلتا ہوا چراغ نظر آیا۔ اس چراغ کے ساتھ پانچ اور چراغ تھے جو بجھ چکے تھے مگر لگتا تھا اس چھٹے چراغ کی لو سے جو مدھم سی روشنی پھوٹ رہی ہے وہ ایک روشن لکیر کی طرح ان کے اوپر پھیل گئی ہے۔

اس نے اپنا چراغ جلایا اور چراغوں کے پہلو میں رکھ دیا اور جب دونوں ہاتھ پھیلا کر سینکڑوں بار دہرائے ہوئے الفاظ اپنے ہونٹوں سے نکالنے لگی تو اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی قطاریں نکلنے لگیں۔ اس نے دونوں ہاتھ نیچے کر کے اپنی جھولی کے کناروں کو پکڑ لیا اور آنسو ٹپ ٹپ اس کی جھولی میں گرنے لگے۔ اس نے آنسو بھری آنکھوں سے سامنے دیکھا۔ اس کا چراغ جل رہا تھا اور دوسری طرف دوسرا چراغ بھی جل رہا تھا۔ اس نے یکایک محسوس کیا کہ دونوں چراغوں کی لویں اس کے آنسوؤں میں سے گزرتی ہوئی آنکھوں کے اندر چلی جا رہی ہیں۔

وہ دیر تک جھولی پھیلائے کھڑی رہی۔

اس رات وہ بڑی دیر تک وہاں بیٹھی رہی اور جب آثارِ سحر نمودار ہونے لگے تو مقبرے سے باہر نکل آئی۔

باہر نکلتے وقت اس نے ایک لمحے کے لئے پلٹ کر دیکھا۔ ذرا فاصلے پہ دونوں چراغ روشن تھے

آخر ساتویں جمعرات آ گئی۔

دور عشا کی نماز کی اذان بلند ہوئی تو اس نے چراغ، بتی اور ماچس سنبھالی اور بسم اللہ کہہ کر چلنے لگی۔

اوپر ستارے چمک رہے تھے اور ہوا خاصی تیز تھی۔ وہ خاموش، ویران راہ پر قدم اٹھاتے مقبرے کی طرف جا رہی تھی۔

کسی قریبی علاقے میں شدید بارش ہوئی تھی جس کا پانی بہتا ہوا نشیبی حصوں میں آکر جابجا ٹھہر گیا تھا۔ کہیں کہیں یہ پانی زیادہ گہرا تھا اور اسے بڑی مشکل سے آگے بڑھنا پڑتا تھا۔

جب وہ مزار کے قریب کھڑی تھی تو اس کے دل میں ایک ہیجان برپا تھا۔ اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا اور سانس جیسے سینے میں رُک سا گیا تھا۔

اس نے ماچس کی تیلی جلائی۔ چراغ کی لو کی طرف بڑھائی اور چراغ روشن ہو گیا۔

یہ چراغ آہستہ آہستہ مزار کی طرف بڑھنے لگا۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ اس کے پاس کوئی کھڑا ہے۔ ایک آہ اس کے کان تک جا پہنچی تھی۔

اس نے سامنے دیکھا۔ مزار سے کچھ اوپر ایک بجھا ہوا دیا اور اس سے ذرا فاصلے پر ایک ایسا چہرہ جو اس طرح نظر آ رہا تھا جیسے اس پر سکتے کا عالم طاری ہو۔ ایک گرم گرم لہر اس کے سارے جسم میں سرایت کر گئی۔

اس کا ہاتھ مزار کی طرف حرکت کرنے کی بجائے اُدپر جانے لگا۔ دوسرے لمحے میں بجھا ہوا چراغ اس کے اپنے ہاتھ میں تھا اور اس کا جلتا ہوا چراغ اس مایوس عورت کے ہاتھ میں جو ایک کھنڈر کی دیوار کی طرح جھکی ہوئی تھی۔

تین چار لمحوں ہی میں یہ سب کچھ ہو گیا۔

بجھا ہوا چراغ لے کر وہ ایک سیکنڈ بھی وہاں نہ ٹھہری۔ مقبرے سے باہر آ گئی اور مشرق کی طرف چلنے لگی۔

ہوا کے تند و تیز تھپیڑے اس کے جسم سے ٹکرا رہے تھے۔ بار بار اس کے قدم ڈگمگا جاتے تھے مگر وہ برابر چلی جا رہی تھی۔ آگے ہی آگے کسی منزل کا تصور کئے بغیر جیسے دُور سے کسی نے اسے اشارہ کر دیا ہو اور وہ کہیں بھی رُکنا نہ چاہتی ہو۔

پھر بارش ہونے لگی اور بارش کے بھاری بھاری قطرے چراغ کے کناروں پر اور چراغ کے اندر گرنے لگے۔ جب یہ قطرے چراغ کے کناروں سے لگتے تھے تو ٹن کی ہلکی سی آواز آنے لگتی تھی۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئیں۔ اس کے تھکے ہوئے ضعیف پاؤں میں ایک نامعلوم سی قوت آ گئی۔

بارش کے قطرے گر رہے تھے۔ آواز بلند ہوتی جا رہی تھی۔ ٹن ٹن۔ ٹن ٹن۔ ٹن ٹن۔

وہ کہیں بھی نہ رکی۔ تیز و تند ہوائیں برابر چل رہی تھیں۔ بارش بڑھتی جا رہی تھی۔

پھر یوں ہوا کہ بارش تھم گئی مگر ہواؤں کی تندی و تیزی میں کوئی فرق نہ آیا۔

صبح ہو گئی تھی۔ کسان اپنے اپنے بیلوں کو لئے کھیتوں کی طرف جا رہے تھے۔

اچانک ان کے قدم رک گئے۔ ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ انہوں نے دیکھا کہ ایک بوڑھیا چلی جا رہی ہے اور طوفانی ہواؤں میں اس کے ہاتھ میں تھما ہوا چراغ جل رہا ہے۔

بوڑھیا کو خود بھی معلوم نہیں تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ اس کے ارد گرد کیا ہو رہا ہے۔ اس نے چراغ کی طرف ایک لمحے کے لئے بھی نہیں دیکھا تھا وہ چلی جا رہی تھی اور اس کے دائیں بائیں اور پیچھے حیران و سراسیمہ لوگ قدم اٹھا رہے تھے۔

O

یہ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے اور اس کے وسطی حصے میں ایک نو تعمیر شدہ مقبرے کی دیواریں کھڑی ہیں۔

قصبے کے لوگوں کا اعتقاد ہے کہ یہاں ایک بزرگ خاتون دفن ہے جس کا چراغ طوفانی ہواؤں میں بھی جلتا رہا تھا۔ اس لئے اسے چراغ بی بی کہتے ہیں۔

ہر روز عقیدت مند یہاں آتے ہیں اور دعائیں مانگتے ہیں خاص طور پر وہ لوگ جن کے بچے گم ہو گئے ہوں۔

مزار کے سرہانے ایک مٹی کا چراغ ساری رات جلتا رہتا ہے۔

گریٹ مین

آدھی رات سے کچھ زیادہ وقت گزرا ہوگا کہ فوراں اٹھ کر بستر پر بیٹھ گئی اور اندھیرے میں ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔ شاید وہ اس تاریکی میں کسی ایسی کرن کی تلاش میں تھی جو اس کی آنکھوں کے راستے دل میں اتر جائے۔

یہ پہلی رات نہیں تھی جب وہ اس درجہ بے تاب ہو گئی تھی کہ آدھی رات سے زیادہ لیٹ ہی نہیں سکی تھی۔ ایسی کئی راتیں آئی تھیں اور ان راتوں میں یا تو وہ سارا وقت کروٹیں بدلتی رہی تھی یا اٹھ کر ایک طرف بیٹھ گئی تھی، اور پھر ایک لمحے کے لئے بھی سو نہیں سکی تھی۔

وہ ایک غریب بیوہ تھی دنیا میں اس کا کوئی بھی سہارا نہیں تھا گھر کا خرچ چلانے کی خاطر وہ محلے کے گھروں میں کام کرنے پر مجبور تھی۔ اس کا اسے دکھ ضرور تھا مگر یہ کوئی ایسا دکھ نہیں تھا کہ وہ پوری پوری رات آنکھوں میں گزار دے اس کے دکھ کی اصل وجہ اس کا بیٹا تھا پچیس سال کا نواب، جو اندر کمرے میں سو رہا تھا۔

نواب سے اسے یہ شکایت نہیں تھی کہ وہ کچھ پڑھ لکھ نہیں سکا تھا کوئی کام کاج نہیں کرتا تھا گھر کی ذمے داریوں میں کوئی حصہ نہیں لیتا تھا ایسی باتوں کا گلہ تو اسے اس وقت ہوتا جب نواب ایک نارمل انسان ہوتا اور وہ نارمل انسان تھا ہی نہیں۔

ماں نے جب اس کا نام نواب رکھا تھا تو وہ غیر شعوری طور پر چاہتی تھی کہ اس کا بیٹا بڑا ہو کر دولت مند بنے آپ کھائے ماں کو کھلائے اور وہ نواب تو بنا مگر خیالی دنیا کا۔ اس کے دل میں یہ یقین پیدا ہو گیا تھا کہ وہ ایک بہت بڑا آدمی ہے اور سب کے سب اس کی عزت

کرتے ہیں احترام کرتے ہیں اور اس کی عظمت کا اعتراف کرتے ہیں وہ خود کو گریٹ مین تصور کرتا تھا اور یہ اس بنا پر کہ چراغ دین ٹھیکیدار کا بڑا لڑکا جو کسی کالج میں پڑھتا تھا اس نے نواب کو بتایا تھا کہ تم گریٹ مین ہو یہ لفظ سن کر نواب بوقتوں کی طرح اسے دیکھنے لگا تھا۔

"ارے میاں تم گریٹ مین ہو۔ گریٹ مین کا مطلب ہے بڑا آدمی، تم بڑے آدمی ہو یعنی گریٹ مین ہو۔ سمجھے؟"

نواب نے یہ لفظ یاد کر لئے تھے اور انہیں بلا محل اور بلا ضرورت اپنے ہونٹوں پر لے آتا تھا محلے میں اکثر لوگ مذاقاً اسے گریٹ مین کہہ کر ہی پکارنے لگے اور اس طرح پکارے جانے پر وہ پھولا نہیں سماتا تھا پہلے پہل ماں نے سوچا تھا۔ ابھی چھوٹا ہے۔ یہ نہیں سوچ سکتا کہ لوگ گریٹ مین کہہ کر اس کا مذاق اڑاتے ہیں جب بڑا ہو جائے گا تو اصل حقیقت سمجھ لے گا مگر اس کی یہ امید خاک میں مل گئی کیونکہ نواب دوسروں کے مذاق کو مذاق سمجھ ہی نہ سکا وہ خیال کرتا تھا کہ محلے کے چھوٹے بڑے جو مسکرا مسکرا کر جھک جھک کر اس کو سلام کرتے ہیں اور گریٹ مین کہہ کر مخاطب کرتے ہیں تو یہ سب کے سب واقعی اس کا احترام کرتے ہیں اور حقیقتاً اسے گریٹ مین ہی تصور کرتے ہیں اور یوں وہ زیادہ سے زیادہ ابنارمل ہوتا چلا گیا۔

نوراں صرف یہ چاہتی تھی کہ اس کا بیٹا بیشک ایک پھوٹی کوڑی بھی کما کر گھر میں نہ لائے دن بھر بے کار بیٹھا رہے مگر وہ یہ برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ وہ کام کرنے کے لئے جس گھر میں بھی جائے گھر کے لوگ ہنس ہنس کر اس سے پوچھیں۔

"نوراں! کیا حال ہے تیرے نواب کا۔ تیرا گریٹ مین کیا کر رہا ہے؟"

وہ اس طنز کو خوب سمجھتی تھی اور یہی احساس اس کے لئے اس قدر اذیت ناک ہو گیا تھا کہ اس کا جی چاہتا تھا کاش اس کا بدبخت بیٹا مر جائے تاکہ ہر روز اسے زہر کے گھونٹ تو نہ پینے پڑیں۔

محلے کے لڑکے آئے دن اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی واردات کر دیتے تھے، اسے کسی محفل میں صدر

بنایا جاتا تھا اور جب وہ بیٹھنے لگتا تھا تو کرسی کھسکا کر اسے گرا دیا جاتا تھا اور پھر معافی مانگ لی جاتی تھی۔ اسے ایسی مٹھائی کھلائی جاتی تھی جس میں نمک بھرا ہوتا تھا اس کی شان میں ایسے قصیدے پڑھے جاتے تھے جن میں اس کا جی بھر مذاق اڑایا جاتا تھا۔ لیکن وہ تھا کہ اس سارے مذاق کو اپنی شان میں اظہارِ عقیدت ہی سمجھتا تھا۔

اگلے دن اس کے گلے میں ایک بڑا سا ہار ڈالا گیا تھا۔ جس میں پھولوں کے ساتھ کپڑے میں لپٹی ہوئی کوئی شے بھی تھی۔ نواب یہ ہار پہن کر بڑی آن بان شان سے گھر کی طرف جا رہا تھا اور محلے کے بچے اس کے پیچھے تالیاں بجا رہے تھے جب وہ گھر کی دہلیز پہ پہنچا تو ماں نے اس کا ہار نوچ لیا اور کپڑے میں لپٹا پرانا جوتا نکال کر اسے تالیاں بجانے والے بچوں پر دے مارا اور کم از کم آدھ گھنٹہ تک انہیں بددعائیں دیتی رہی۔

اس کا بیٹا کتنا احمق ہو گیا ہے کہ یہ بھی نہیں سمجھ سکتا کہ لوگ اسے ذلیل کر رہے ہیں یہ بات اس کے لئے سوہانِ روح بن گئی تھی اور وہ اپنی ذلت کے احساس سے اندر ہی اندر سلگ رہی تھی مگر اس کا بے حیا بیٹا تھا کہ ماں سے لڑ رہا تھا۔

"ماں تو پاگل ہو گئی ہے یہ میری عزت کرتے ہیں۔"

"عزت کرتے ہیں یہ عزت کرنے کے لئے گلے میں جوتے ڈالے جاتے ہیں؟" اور اس نے بیٹے پر اس زور سے دو ہتڑ مارا کہ وہ بلبلا اٹھا۔

نوراں کے گھر میں جب بھی ایسا ہنگامہ برپا ہوتا تھا تو عموماً اماں بسانی بھاگتی ہوئی آ جاتی تھی اور وہ وہی فقرہ کہتی تھی جو وہ کئی بار کہہ چکی تھی۔

"نوراں وہ تو پگلا ہے، تو بھی پاگل ہو گئی ہے۔"

اور نوراں اس کے جواب میں اپنے کرتے کا دامن پھیلا کر اوپر دیکھتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہتی۔

"اللہ اسے کسی کی آن آ جائے یا مجھے اٹھا لے۔"

اس دن بھی اس نے یہی دعا کی تھی اور نواب یہ کہہ کر دروازے میں سے نکل گیا تھا۔

"اب میں اس گھر میں کبھی نہیں آؤں گا"

مگر حسبِ معمول وہ شام کو گھر آ گیا تھا اور اس وقت اندر کمرے میں سو رہا تھا۔

نوراں کے ذہن میں تلخی بھر گئی۔ اس نے چارپائی سے نیچے اتر کر گھڑے میں سے ٹھنڈے پانی سے مٹی کا وہ پیالہ بھرا جس سے گھڑے کو ڈھانپا گیا تھا۔ سرد پانی جب اس کے حلق سے نیچے اترا اسے ذرا سا سکون مل گیا۔ مگر یہ سکون عارضی تھا کیونکہ اسے پھر ایک بات یاد آ گئی تھی جس نے اسے تڑپا کر رکھ دیا تھا۔

میاں نور محمد کے ہاں جو عورت برتن مانجھا کرتی تھی وہ بیمار ہو کر اپنے گاؤں چلی گئی تھی اور میاں صاحب کی بیوی نے نوراں کو کہلوا بھیجا تھا کہ وہ اس کے ہاں کام کیا کرے۔ نوراں کو تو کام کرنا تھا کہیں بھی ہو وہ میاں صاحب کے ہاں چلی گئی۔

جس لمحے وہ دالان میں سے گزر کر کمرے میں پہنچی میاں صاحب اپنی کھچڑی داڑھی میں کنگھی پھیر رہے تھے۔

نوراں نے سلام کیا۔

"وعلیکم السلام۔ نوراں بہن! کیا حال چال ہے؟" میاں صاحب نے کنگھی میز پر رکھ کر سرمہ دانی اٹھائی اور آنکھوں میں سرمہ ڈالتے ہوئے یہ سوال کیا۔

"اللہ کا شکر ہے میاں جی!"

"ہاں شکر ہی ادا کرنا چاہیے ـــــ پر بندہ بڑا ناشکرا ہے۔"

"جی میاں جی"

"کیا کام ہے نوراں بی بی؟"

وہ جی آپ کی بیگم نے بلایا ہے۔ فاطمہ بیمار ہو کر چلی گئی ہے نہ ماں۔

میاں صاحب نے نوراں کو ذرا غور سے دیکھا۔

"تو تم فاطمہ کی جگہ کام کروگی؟"

نوراں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"پر نوراں بہن! بڑا بیٹا تو گریٹ مین ہے۔ گریٹ مین کی مائیں دوسروں کے برتن نہیں مانجھا کرتیں۔"

نوراں کے ذہن میں جیسے شعلہ سا بھڑک اٹھا۔ اور اس شعلے کی حرارت اس کے سارے بدن میں سرایت کر گئی۔

میاں صاحب مسکرا کر اسے دیکھ رہے تھے یہ مسکراہٹ اسے زہر لگی اور وہ ایک لمحہ بھی وہاں نہ ٹھہر سکی۔ اس وقت وہ خاموش رہی تھی۔ مگر اب جو اسے یہ بات یاد آگئی تو وہ میاں صاحب کو بد دعائیں دینے لگی۔

میاں تیرا جنازہ اٹھے۔ تجھے سانپ ڈس جائے۔

وہ بد دعائیں دے رہی تھی اور اس کے اپنے الفاظ اس کے کانوں میں اس طرح اتر رہے تھے جیسے ان میں گرم گرم تیل ڈالا جا رہا ہے۔ ایک مرتبہ اور اس نے بھرا ہوا پیالہ ہونٹوں سے لگا لیا اور تین چار لمبے لمبے گھونٹ بھرے۔ آدھا پانی ٹھوڑی پر سے گزر کر گردن کو چھوتا ہوا گریبان تک جا پہنچا اور وہ پیالہ ہاتھ میں لئے گم صم سامنے دیوار کو گھورتی رہی۔

آسمان میں ستارے پھیکی پھیکی روشنی دے رہے تھے اور ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا ایسے میں جب میاں نور محمد کے کوٹھے سے مرغے کی ککڑوں کوں کبھی ہوئی آواز بلند ہوئی تو اسے احساس ہوا کہ وہ کہاں ہے اور کیا کر رہی ہے۔

مرغا بانگ پر بانگ دے رہا تھا اور نوراں کا جی چاہتا تھا کہ وہ اگر اس کے قریب ہوتی تو اس کی گردن ہی مروڑ ڈالتی۔ اس نے میاں صاحب کی بیوی کو دل ہی دل میں گالیاں دیں جس نے اسے پال پوس کر اتنا طاقتور بنا دیا تھا کہ اس کی آواز محلے میں دور دور تک گونج اٹھتی تھی۔

نوراں کو معلوم تھا کہ جب مرغا بانگ دیتا تھا تو اس سے تھوڑی دیر بعد مسجد سے اذان کی

آواز بھی آنے لگتی ہے مگر اس صبح صرف مرغا ہی ساری فضا پر چھایا ہوا تھا اذان کی آواز نہیں آئی تھی۔ شاید مؤذن سو گیا تھا یا مرغے نے وقت سے پہلے ہی لوگوں کو جگانا شروع کر دیا تھا۔

نوراں گھڑے کے پاس کھڑی رہی۔ پیالہ ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔

اس نے پیالہ اوندھا کر کے گھڑے کے منہ پر رکھ دیا اور پھر برآمدے کا دروازہ کھول کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ یہ کمرہ نواب کا ڈرائینگ روم بھی تھا۔ کامن روم بھی اور خوابگاہ بھی دیواروں پر پرانے کیلنڈر، انگریزی اور دیسی ایکٹرسوں کی تصویریں اور وہ ہار لٹکے ہوئے تھے جو نواب کے بزعم خویش عقیدت مندوں نے خاص خاص موقعوں پر اس کے گلے میں ڈالے تھے ان کے پھول مرجھا کر ذروں کی صورت میں نیچے گرے ہوئے تھے۔

نوراں نے اندر قدم رکھا تو سب سے پہلے اس کی نظر چارپائی کے نیچے فوجی بوٹ پر پڑی۔ یہ بھاری بھرکم بوٹ غلام احمد قریشی ترانے کے بیٹے نے نواب کو دیئے تھے اور یہ کہہ کر دیئے تھے کہ گریٹ مین ایسے بوٹ ہی پہنا کرتے ہیں۔

نواب کو بھلا ایسے بوٹ پہننے پر کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ اس نے بڑی شان سے بوٹ لئے مگر شدید گرمی کی وجہ سے اس کو محسوس ہوا جیسے اس کے پیروں کو گرم گرم شکنجے میں کس دیا گیا ہے لیکن گریٹ مین کو تو سب کچھ کرنا ہی پڑتا ہے۔

اس کے پاس یہ خوفناک بوٹ دیکھ کر نوراں کے اندر بیزاری کی لہر دوڑ گئی۔

"توبہ میرے اللہ" اس کے منہ سے بے اختیار نکلا اور اس وقت اس کی نظر بیٹے کے چہرے پر پڑی اس کا چہرہ پیلا پیلا دکھائی دے رہا تھا اور اس پر جا بجا پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔

نوراں کو محسوس ہوا کہ اس کے ہونٹ حرکت کر رہے ہیں۔ وہ کیا کہہ رہا تھا——— نوراں کو سنائی نہیں دے رہا تھا مگر وہ جانتی تھی کہ وہ سوتے میں بھی کوئی ڈھنگ کی بات نہیں کرتا ایک

دو بار جب وہ دالان میں سویا ہوا تھا اس نے بیٹے کو بڑبڑاتے ہوئے پایا تھا اور جب اپنے کان اس کے ہونٹوں کے قریب لے گئی تھی۔ تو اس نے سنا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ اماں! میں گریٹ مین ہوں۔ اماں! تم نہیں سمجھتیں میں کیا ہوں۔ گریٹ مین۔ گریٹ مین، اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا لیکن دوسرے ہی لمحے وہ پھر سے ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہی تھی۔

نواب کا ماتھا سوجا ہوا تھا اور مچھر اس کے چہرے پر اڑ رہے تھے۔

نوراں بے قرار ہو گئی اور اس کے ہاتھ بے اختیاری کے عالم میں بیٹے کی طرف بڑھنے لگے اس نے زور زور سے اس کے کندھوں کو ہلایا۔ نواب نے پریشان ہو کر آنکھیں کھول دیں۔

"کیا ہے اماں؟"

"مردار منہ پر مچھر مکھیاں اڑ رہی ہیں۔"

نواب نے زہرناک نظروں سے ماں کو دیکھا۔

"اماں! تجھے ہزار بار کہا ہے، ذرا ادب سے بات کیا کرو۔"

"کیوں وے ادب سے بات کیوں کروں۔ تو میرا جنا ہے یا تو نے مجھے جنا ہے؟"

"اماں" نواب نے ہاتھ سے مچھروں کو ہٹاتے ہوئے کہا "تو جانتی نہیں۔ میں گریٹ مین ہوں"

نوراں نے زور سے زمین پر تھوکا۔

"لکھ لعنت تیری گریٹ مینی پر۔ سب تجھے مخول کرتے ہیں۔ تو نے تو میرے گھر کی خاک اڑا دی ہے۔"

نواب اب اٹھ کر بیٹھ گیا تھا اور اپنی انگلیاں ماتھے پر پھیر رہا تھا۔

اماں تو نہیں مانتی۔ میں گریٹ مین ہوں۔ گریٹ مین۔ بڑا آدمی۔ لوگ میری عزت کرتے ہیں مجھے دیکھتے ہیں تو فوراً کھڑے ہو جاتے ہیں۔ سنا تو نے۔ لوگ مجھے آتے ہوئے دیکھتے ہیں تو اسی وقت اٹھ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ میں گریٹ مین ہوں۔ ایسی عزت گریٹ مین ہی کی کی جاتی ہے۔ نواب کا چہرہ جوشِ بیان سے سرخ ہو گیا تھا اس کے نتھنے متحرک تھے اور وہ اس

وقت بڑا مضحکہ خیز دکھائی دے رہا تھا پھر نہ جانے کیوں ماں کی ممتا جاگ اٹھی۔ اسے اپنے بیٹے کا وہ چہرہ دکھائی دے رہا تھا جو برسوں پہلے اس کی چھاتی سے دودھ پیتے پیتے چھاتی پر دانت مار دیتا تھا اور وہ درد سے بے قرار ہو جاتی تھی۔ چھاتی اس کے منہ سے نکال لیتی تھی لیکن جب وہ رونے لگتا تھا تو اسے سینے سے چمٹا کر پھر چھاتی اس کے منہ میں ڈال دیتی تھی۔

اس نے اپنا ہاتھ بڑھا کر اس کے سر کے سخت بالوں پہ پھیرا اور یہ احساس کر کے کہ ان بالوں میں تیل نہیں لگایا گیا اس کا دل اور دکھی ہو گیا۔

"نہ نہ نہ پتر نہ"

نواب کچھ سمجھے بغیر اُسے دیکھے جا رہا تھا۔

"تو سمجھتا کیوں نہیں ـــــ اللہ ان کو سانپ کاٹے، ان کے جنازے نکلیں"

نواب جانتا تھا کہ اس کی ماں کن لوگوں کو بددعائیں دے رہی ہے۔

"نہیں اماں۔ وہ میری عزت کرتے ہیں" وہ بولا۔

"نہیں کرتے۔ تیرا مخول اڑاتے ہیں"

نوراں نے اپنا ہاتھ بیٹے کے سر سے ہٹا لیا تھا۔

"اماں! وہ آج میرا جلوس نکالیں گے۔ میرے گلے میں ـــــ"

"جوتیوں کے ہار ڈالیں گے منہ پر تھوکیں گے۔ زور زور سے ہنسیں گے قہقہے لگائیں گے ـــــ بے شرم۔ بے حیا ـــــ"

وہ جھپٹ مارنے کے لئے اس کے ہاتھ اوپر اٹھے اور پھر واپس آ گئے۔

"اماں تو پاگل ہو گئی ہے"

نوراں کے ہونٹ تھرتھرانے لگے۔

"میں پاگل ہوں کہ تو پاگل ہے۔ تیرا دماغ پھر گیا ہے عزت بے عزتی میں فرق ہی نہیں کرتا۔ اللہ تجھے کسی کی آئی آئے۔ تجھے ہیضہ ہو جائے"

بیٹے سے بحث کے اختتام پر وہ اسی قسم کے فقرے کہتی تھی اور بار بار ماتھے پر ہاتھ مار کر قسمت کو کوستی تھی۔

وہ دروازے کی طرف مڑی مگر فوراً پلٹ آئی۔

"میں کہتی ہوں تو آج گھر سے نہیں نکلے گا" اس نے حکم دے دیا۔

نواب سر ہلانے لگا گویا کہہ رہا ہے "جو دل میں آئے کہہ دے ہوگا وہی جو میں پسند کرتا ہوں"

"میں کہتی ہوں تو گھر سے نہیں نکلے گا۔ ورنہ ـــــ"

"میرا جنازہ نکلے گا" نکلنے دو اماں! جنازہ ہی نکلنے دو"

وہ برداشت نہ کر سکی نواب پر پل پڑی۔ اسے دھکا دے کر چارپائی پر گرا دیا اور اس کے ہاتھ اس کے چہرے سینے اور پیٹ پر برستے رہے۔ تھک ہار کر دروازے سے باہر نکلی۔ کنڈی لگائی اور لسی لانے کے لئے میاں نور محمد کے گھر جانے لگی۔

اس روز وہ دوپہر تک گھروں میں کام کرتی رہی اور یہ بھول ہی گئی کہ وہ نواب کو کمرے میں بند کر آئی ہے۔ دو بجے کے لگ بھگ وہ لوٹی۔ شیخ اللہ دتا کے گھر سے وہ تنخواہ نہیں لیتی تھی اپنا اور بیٹے کا کھانا لیتی تھی اور اس روز وہ چار روٹیاں اور ایک برتن میں ساگ لے کر گھر میں آئی۔ روٹیاں اور سالن کا برتن اس نے چولھے کے پاس رکھ دیا۔ بند دروازہ دیکھ کر ہائے وے میرے ربا۔ اس کے منہ سے نکلا اور جلدی سے اس نے دروازہ کھولا اور دیکھا کہ نواب چارپائی پر آنکھیں بند کئے پڑا ہے۔

"نواب وے نواب" اس نے بیٹے کو پکارا۔

نواب نے کوئی حرکت نہ کی۔

"کیا مزے سے سو رہا ہے"

نواب پر اس فقرے کا بھی کوئی اثر نہ ہوا۔

نوراں نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا یک لخت اسے محسوس ہوا کہ اس نے اپنے بیٹے کا ہاتھ نہیں چولھے پر رکھا ہوا توا پکڑ لیا ہے۔

وہ ڈر گئی۔

"نواب پتر نواب"

نواب نے آنکھیں کھول دیں۔

"جلوس والے آگئے ہیں"۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور دوسرے ہی لمحے لڑکھڑا کر گر پڑا۔

تین دن گزر گئے اور اس کا بخار نہ اترا۔ چوتھے روز وہ بیہوش ہو گیا اور اس کے ٹھیک ساتویں روز بعد وہ چارپائی کے اوپر ایک بےحس و حرکت، نحیف و نزار جسم کی صورت میں پڑا تھا۔

نواب مر گیا۔ نواب مر گیا۔

ہر شخص دوسرے سے کہتا تھا، دراصل وہ دوسرے کو یہ خبر سنا رہا تھا کہ محلے کی تفریح کا ایک بہت بڑا ذریعہ ختم ہو گیا ہے۔

نوراں خاموش تھی۔ اس کے سامنے اس کے بیٹے کو نہلایا گیا، کفنایا گیا۔ اس نے نہ تو زبان سے ایک لفظ کہا اور نہ آنکھ سے ایک آنسو تک بہایا۔

محلے کی عورتیں منہ جوڑ جوڑ کر کہتی تھیں۔

"ہائے کیسی ظالم ماں ہے نہ روتی ہے نہ بین کرتی ہے؟"

اور نوراں بالکل نہ روئی۔ محلے کی عورتیں اپنے مرے ہوئے عزیز یاد کر کے روتی رہیں۔

چار مردوں نے جنازہ کندھوں پر اٹھایا اور قبرستان کی طرف چلنے لگے جنازے کے ہمراہ صرف سات آدمی تھے۔ اور ان میں چار جنازہ اٹھانے والے بھی شامل تھے آٹھویں نوراں تھی جو اس طرح چل رہی تھی جیسے خواب میں قدم اٹھا رہی ہے۔

جنازے کے ساتھ جانے سے اسے کسی نے بھی نہیں روکا تھا دراصل اس کی طرف کسی نے توجہ ہی نہیں کی تھی۔

جنازہ گلی سے باہر نکل آیا۔

امجد علی ٹھیکیدار کی حویلی میں کوئی تقریب تھی۔ حویلی کے باہر دس بارہ آدمی کرسیوں پر بیٹھے تھے

انہوں نے جو جنازے کو آتے دیکھا تو سب کے سب احتراماً کھڑے ہو گئے فوراں نے انہیں کھڑے ہوتے ہوئے دیکھا اور یک لخت اس کے قدم رُک گئے۔

اس نے زور سے اپنے سینے پر دوہتر مارا اور "ہائے رے لوگو! میرا گریٹ مین مر گیا۔ ہائے رے میرا گریٹ مین مر گیا"۔ اور یہ الفاظ کہتے ہوئے تیورا کر زمین کے اوپر گر پڑی۔

سائرہ

وہ ہسپتال پہاڑی علاقے میں تو نہیں تھا مگر پہاڑی علاقے کے بہت قریب واقع ہونے کی وجہ سے وہاں فضا عموماً سرد ہی رہتی تھی۔ اس لیے ہسپتال کا عملہ آغاز سرما کے ساتھ ہی ہسپتال کے تمام کمروں کی کھڑکیاں اور روشندان بند کر دیتا تھا۔ تاکہ ہوا کے خنک جھونکے کمروں کے اندر آ کر مریضوں کو پریشان نہ کریں۔ اور جب ساری کھڑکیاں اور روشندان بند ہو جاتے تھے تو کہیں بھی سردی کا کچھ زیادہ احساس نہیں رہتا تھا۔ لیکن علی نواز جو ہسپتال کے پرائیویٹ روم نمبر سات میں گزشتہ سوا چار ماہ سے مقیم تھا عملے کی اس حرکت کو پسند نہیں کرتا تھا۔ وہ اپنے کمرے کی اس کھڑکی کے دونوں پٹ کھلا رکھتا تھا جو اس کے سرہانے سے ڈیڑھ دو فٹ کے فاصلے پر کھلتی تھی۔ شروع شروع میں نرس نے ڈاکٹر کی واضح ہدایت پر عمل کرتے ہوئے یہ کھڑکی بند کر دی تھی اور علی نواز نے کوئی اعتراض بھی نہیں کیا تھا۔ مگر جب دوسرے روز وہ ڈاکٹر کے ساتھ راؤنڈ پر آئی تھی تو اس نے کھڑکی کو کھلا پایا تھا۔ ڈاکٹر نے کھڑکی کھلی دیکھی تو نرس کو ڈانٹ پلائی۔ نرس نے اسی وقت کھڑکی بند کر دی جو چند گھنٹوں کے بعد ہی پھر کھل گئی۔ مریض سے سوال جواب کرنے پر اسے معلوم ہو گیا کہ وہ کھڑکی کو ہر وقت کھلی رکھنا چاہتا ہے۔ اور اس معاملے میں وہ ڈاکٹر کے حکم کی تعمیل کرنے سے معذور تھی نرس نے ڈاکٹر کو مریض کے اس فیصلے سے آگاہ کر دیا اور ڈاکٹر نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

نرس نے سوچا تھا کہ علی نواز شاعر مزاج آدمی ہے کھڑکی کے باہر دیکھ کر ارد گرد پھیلے ہوئے مناظر سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہے لیکن اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی تھی کہ علی نواز جب بھی

کھڑکی سے باہر دیکھتا تھا۔ اس کی نگاہیں اوپر نہیں، نیچے فرش پر جمی رہتی تھیں۔ جیسے برآمدے میں یا لان میں آنے جانے والے لوگوں کا جائزہ لے رہا ہو۔ اس نے صبح کے وقت بھی اُسے دیکھا تھا اور شام کے لمحوں میں بھی۔ نہ تو طلوعِ آفتاب سے پہلے جہاں تہاں بکھرے ان ملگجی اجالوں سے اسے کوئی دلچسپی تھی اور نہ غروبِ آفتاب کے بعد بلندیوں سے اترتے ہوئے شفق آلود دھندلکوں کو وہ پُرشوق نظروں سے دیکھتا تھا۔ تو پھر یہ دیکھتا کیا ہے؟ نرس نے اپنے آپ سے سوال کیا تھا؟

انہی دنوں سردی کافی بڑھ گئی تھی۔ اور سارے مریض کمبلوں میں اپنے آپ کو ہر وقت لپیٹے رکھتے تھے۔ اس نے علی نواز سے پوچھ ہی لیا تھا۔

"معاف کیجئے ـــــ آپ کھڑکی سے باہر کیا دیکھتے رہتے ہیں؟"

علی نواز نے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا تھا ــــ

"کچھ نہیں ــــ کچھ بھی تو نہیں۔"

نرس اس مختصر سے جواب پر کیونکر مطمئن ہو سکتی تھی؟ بولی۔

"آپ نہیں بتانا چاہتے تو میں آپ کو مجبور نہیں کر سکتی۔ ویسے سرد ہوا آپ کے لئے ٹھیک نہیں۔ بہت کمزور ہو چکے ہیں۔"

اور نرس نے یہ محسوس کر کے کہ اس کے اعتماد کو دھکا لگا ہے۔ فرش پر اپنی اونچی ایڑی کی ٹھک ٹھک کا شور کرتی ہوئی جلدی سے باہر نکل گئی تھی۔

اس واقعے کو پورا ایک دن بھی نہیں گزرا تھا کہ نرس صبح کے وقت اس کا ٹمپریچر نوٹ کرنے کے لئے کمرے میں آئی تو علی نواز نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔

"نرس! شاید دوسرے ونگ میں ایک لڑکی صبح و شام آتی جاتی رہتی ہے۔"

"کون لڑکی؟" نرس نے اسے حیرت ناک انداز میں دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

"لڑکی ـــــ وہ جو شوخ رنگ کی ساڑھیاں پہنتی ہے، ٹوکری اٹھائے لان میں سے

گزرتی ہے؟"

نرس نے علی نواز کو گھور کر دیکھا ۔اس کی نگاہیں کہہ رہی تھیں ۔

آپ بوڑھے ہو چکے ہیں یہ بات آپ کو زیب نہیں دیتی اس لئے وہ کسی قدر جھنجھلا کر بولی۔

" ہزاروں لڑکیاں آتی جاتی رہتی ہیں ۔مجھے کیا پتہ آپ کس لڑکی کو پوچھ رہے ہیں؟"

علی نواز کو افسوس ہوا کہ اس نے نرس سے یہ سوال کیوں پوچھا ہے ۔نرس اس کے جذبات کیونکر جان سکتی ہے اور اسے کسی مریض سے کیا ہمدردی ہو سکتی ہے ۔

شام تک اس نے ارادہ کر لیا کہ وہ رنگین ساڑھی میں ملبوس لڑکی جب لان میں سے گزرے گی تو وہ خود اس سے گفتگو کرے گا ۔آئندہ نرس سے اس سلسلے میں کچھ نہیں کہے گا چنانچہ شام سے ذرا پہلے جب سورج پہاڑ کی بلند ترین چوٹی کے پیچھے آہستہ آہستہ اندھیروں میں ڈوب رہا تھا ۔وہ لان کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ گیا ۔

وہ لڑکی آئی ۔اس روز اس نے گلابی رنگ کی ساڑھی زیب تن کر رکھی تھی ۔ایک ہاتھ میں تروتازہ پھولوں کا گلدستہ تھا اور دوسرے میں ٹوکری ۔علی نواز نے اسے دیکھا اور بلا ارادہ اس کا دایاں ہاتھ اوپر اٹھ گیا ۔اور اس کے ہونٹ "بیٹی" کہتے ہوئے تھر تھرا اٹھے ۔

لڑکی کے قدم رک گئے اور وہ اسے حیرت ناک نظروں سے دیکھنے لگی ۔

" آپ کا کون بیمار ہے ،بیٹی"! اس نے لڑکی سے پوچھا ۔

لڑکی نے نظریں جھکا لیں ۔

" میرا شوہر"

" اللہ اسے صحت دے ۔میں دعا کروں گا"

لڑکی ایک لمحہ بھی نہ رکی اور دوسرے ونگ کی طرف جانے لگی ۔علی نواز اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا ۔

شام ابھی ہوئی نہیں تھی مگر شام کے سائے فضا میں بادلوں کے رواں دواں قافلوں کی

وجہ سے ہسپتال کے لان میں پھیل گئے تھے۔ علی نواز نے چائے کا کپ خالی کر کے تپائی کے اوپر رکھا تھا۔ اور بے خیالی کے عالم میں دیوار سے لگی ایک میز کے اوپر بکھری ہوئی کتابیں دیکھ رہا تھا۔ شاید وہ کسی ایسی کتاب کا انتخاب کرنا چاہتا تھا جسے پڑھتے پڑھتے سو جائے اور ساری رات سوتا رہے۔ رات کو گیارہ بارہ بجے تک کتاب کا مطالعہ کرنا اس کا روزمرہ کا معمول تھا۔ جس میں شاذ و نادر ہی فرق پڑتا تھا۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر ایک کتاب اٹھالی۔ یہ میر تقی میرؔ کا منتخب کلام تھا۔ میرؔ کا مطالعہ وہ بڑے شوق اور دلچسپی سے کرتا تھا۔ میرؔ کے اداس کر دینے والے شعر اسے ایک عجیب و غریب ناقابلِ بیان کیفیت سے دوچار کر دیتے تھے اور وہ کتاب بند کر کے دیر تک اسی کیفیت میں گم رہتا تھا۔

ابھی اس نے تین چار شعر ہی پڑھے ہوں گے کہ اس کے کان میں ایک باریک سی آواز آئی۔

"میں اندر آسکتی ہوں؟"

علی نواز نے مڑ کر دروازے کی طرف دیکھا وہی لڑکی پھولوں کا ایک گلدستہ دائیں ہاتھ میں لئے دروازے سے کچھ دور کھڑی تھی۔

"آجاؤ بیٹی۔"

لڑکی اندر آگئی۔

"صبح آپ نے بڑے خلوص سے مجھے بلایا تھا۔ اس لئے ــــــ"

علی نواز نے پدرانہ شفقت سے معمور لہجے میں کہا۔

"بیٹی! میں نہیں جانتا تمہارا نام کیا ہے۔ میں تمہارا شکر گزار ہوں۔ یہ گلدستہ۔ بڑے خوبصورت پھولوں کا ہے۔"

"آپ کے لئے ہے۔ میں ان کے لئے ہر روز تازہ پھولوں کا گلدستہ لے کر آتی ہوں صبح جو لائی تھی وہ انہوں نے آپ کے کمرے کے۔ لئے دے دیا ہے۔"

صاف ظاہر تھا کہ ان سے مراد لڑکی کا شوہر تھا۔

"بیٹھو گی نہیں بیٹی؟"

لڑکی نے گلدستہ شیشے کے گلاس میں ٹکا دیا اور خود کرسی پر بیٹھ گئی۔

"بیٹی! تمہیں اس بات پر حیرت ہوگی کہ میں نے ہر روز تمہیں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔"

لڑکی بڑے غور سے علی نواز کو دیکھنے لگی۔

"تم بالکل میری اپنی بہو معلوم ہوتی ہو وہ جب چلتی تھی تو بالکل تم جیسی معلوم ہوتی تھی۔ اس کا تعلق کراچی کے ایک خاندان سے تھا میرے اکلوتے بیٹے نے جب اس سے شادی کی تو اس نے پہلے دن ہی مجھے احساس دلا دیا کہ وہ میری بہو بھی ہے اور بیٹی بھی۔ پھر دو سال بعد وہ جرمنی میں چلے گئے۔ جہاں میرے بیٹے کو بڑی معقول ملازمت مل گئی تھی۔ سات سال ہو گئے ہیں۔ اس دوران میں دونوں میاں بیوی صرف ایک مرتبہ یہاں آئے تھے۔"

علی نواز کے چہرے کے نقش گہرے ہوتے گئے۔ اس کی نظریں فضاؤں میں بھٹکنے لگیں۔ لڑکی نگاہیں جھکائے چپ چاپ اس کے الفاظ سنتی رہی جب وہ ایک لمبی آہ بھر کر خاموش ہو گیا۔ تو لڑکی کرسی سے اٹھ بیٹھی۔

"وہ کب آئیں گے؟"

علی نواز کھڑکی سے باہر ایک اڑتے ہوئے بادل کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کے الفاظ نہ سن سکا۔

لڑکی دروازے کی طرف جانے لگی علی نواز بھی آہستہ آہستہ چلنے لگا۔

دونوں دروازے کے باہر رک گئے۔

"بیٹی۔ یہ انسان بھی اللہ کی ایک عجیب مخلوق ہے۔ اس کی زندگی میں کوئی خلا پیدا ہو جاتا ہے تو کسی نہ کسی ذریعے اسے پر کر لینے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ کبھی کامیاب ہو جاتا ہے اور کبھی ناکام۔ شاید تم نے میری دلی کیفیت کا اندازہ لگا لیا ہوگا۔"

لڑکی نے اثبات میں سر ہلا دیا اور جانے لگی۔

"دیکھو بیٹی! ہو سکتا ہے تم پھر آؤ۔ میں تمہیں کس نام سے بلاؤں گا؟"

"سائرہ" لڑکی نے کسی قدر مسکرا کر کہا۔

جب وہ کمرے سے ذرا دور لان میں پہنچی تو اس نے ٹھہر کر ایک لمحے کے لئے مشرقی سمت دیکھا۔ علی نواز ابھی تک وہیں کھڑا تھا اور جس وقت سائرہ نظروں سے اوجھل ہو گئی تو وہ اندر آ گیا۔ اس نے ایک کونے میں پڑے ہوئے سوٹ کیس کو کھولا۔ کپڑوں کے نیچے ہاتھ ڈال کر ایک نصف فٹ لمبی اور اسی قدر چوڑی فوٹوگراف نکالی اور کرسی پر بیٹھ کر اسے دیکھنے لگا۔ یہ فوٹوگراف اس کے بیٹے اور بہو کی تھی۔ بہو کرسی پر بیٹھی تھی اور اس کا بیٹا کرسی کے پیچھے اپنی بیوی کے دونوں کندھوں کے اوپر دونوں ہاتھ رکھے کھڑا مسکرا رہا تھا۔

اس روز کے بعد سائرہ کا یہ معمول ہو گیا تھا کہ دوسرے تیسرے دن وہ لان میں سے گزرتے ہوئے علی نواز کے دروازے پر ضرور آتی تھی۔ اور اس کی خیریت دریافت کر کے چلی جاتی تھی۔ وہ زیادہ سے زیادہ دو منٹ وہاں ٹھہرتی تھی مگر اس بہت کم وقت میں بھی تپ دق کے بوڑھے مریض کے اندر زندہ رہنے کی خواہش میں اضافہ کر دیتی تھی۔ ابھی تک علی نواز نے اس کے شوہر کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ جب بھی اس سے ملنے کی آرزو کا اظہار کرتا سائرہ کہہ دیتی۔

"انکل! وہ خود آپ سے ملنے کے لئے بےتاب ہیں۔"

"تو میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں" علی نواز کہتا۔

نہیں انکل! ڈاکٹر نے آپ کو مکمل آرام کی ہدایت کی ہے۔ یوسف پر کوئی ایسی خاص پابندی نہیں۔ وہ خود آئیں گے ـــــ وہ مجھ سے یہ بات کہہ بھی چکے ہیں۔ اور ایک دوپہر کو سائرہ یوسف کے ساتھ آ گئی۔

یوسف نے پھل سے بھری ہوئی ٹوکری اٹھا رکھی تھی اور سائرہ کے ہاتھ میں تازہ اور شاداب پھولوں کا گلدستہ تھا۔ ان دونوں کو اپنے کمرے میں دیکھ کر علی نواز کی آنکھوں میں ایک

ایسی چمک آگئی جو اس کی دلی مسرت کا پتہ دے رہی تھی۔

یوسف کا لب و لہجہ بڑا شائستہ تھا طویل بیماری کی وجہ سے اس کے رخسار پچک گئے تھے اور آنکھوں کے ارد گرد گڑھے پڑ گئے تھے چہرے پر کہیں بھی سرخی کی جھلک نظر نہیں آتی تھی تاہم جب اس نے علی نواز سے مصافحہ کیا تو علی نواز کو محسوس ہوا کہ وہ کافی توانا ہے گرم جوشی نے اس کی انگلیوں کی گرفت کو مضبوط بنا دیا تھا۔ وہ اور اس کی بیوی کچھ دیر علی نواز سے باتیں کرتے رہے اور جب رخصت ہونے لگے۔ تو علی نواز نے ایک ایسے لہجے میں جو فطرتاً ایک باپ ہی کا ہو سکتا ہے یوسف سے مخاطب ہو کر کہا۔

"یوسف! میں محسوس کر رہا ہوں جیسے میرا اپنا بیٹا جو سات برس سے جرمنی میں ہے۔ اپنی بیوی کے ساتھ واپس آگیا ہے میری اداسیاں دور ہو گئی ہیں۔ اور مجھے زندگی کی سچی خوشی مل گئی ہے۔

یوسف نے پوچھا۔

"انکل! کیا آپ کے بیٹے کو آپ کی علالت کا علم نہیں ہے؟"

علی نواز نے دکھ بھری آواز میں جواب دیا۔

"نہیں میں نے اسے نہیں بتایا۔ اسے مجھ سے بے حد محبت ہے۔ بیماری کا ذکر کروں گا تو وہ مضطرب ہو کر واپس آ جائے گا۔ ایک لمبی جد و جہد کے بعد اسے بڑا اچھا چانس ملا ہے۔ یہ چانس ضائع نہیں ہونا چاہیئے۔ مگر کوئی بات نہیں میری آس پوری ہو گئی ہے۔ میری زندگی کا خلا پُر ہو گیا ہے۔"

"مگر انکل! اپنا خون اپنا خون ہوتا ہے۔ میں وہ نہیں بن سکتا جو آپ کے لئے آپ کا بیٹا ہے تاہم مجھے اپنا بیٹا ہی سمجھئے۔"

یوسف کی زبان سے یہ الفاظ سن کر علی نواز کی آنکھوں میں وقتی طور پر مایوسی کا جو سایہ سا لہرا رہا تھا اس کی بجائے چمک دمک آگئی۔

اب یہ ہوا کہ سائرہ تو اس کے ہاں معمول کے مطابق آتی ہی رہتی تھی۔ یوسف بھی ہفتے میں ایک مرتبہ آنے لگا۔ ایسا ہوتا رہا۔ تقریباً ایک ماہ تک اس کے بعد کئی روز کے بعد سائرہ آئی۔

علی نواز نے اسے دیکھا تو نہ جانے اسے یہ احساس کیوں ہوا کہ وہ دیر سے وہاں کھڑی ہے۔

"کیوں سائرہ بیٹی! کب آئیں؟"

"ابھی آئی ہوں۔ آپ شاید کچھ سوچ رہے تھے ـــــ اور میں آپ کو یہ بتانے آئی ہوں کہ وہ گھر چلے گئے ہیں۔"

"یوسف گھر چلا گیا ہے۔ الحمد للہ"

علی نواز کچھ اور کہنے والا تھا کہ سائرہ کہنے لگی۔

"اس رات ایک بڑا SERIOUS کیس آ گیا ـــ ڈاکٹر نے کہا۔ یوسف! تمہاری حالت تو ـــ ٹھیک ہے۔ گھر جا سکتے ہو ـــــ اور یوسف نے فون کر کے گھر سے گاڑی منگوائی اور ہم چلے گئے ـــ انکل! یہ ـــ انکل! آپ یہ نہ سوچیں کہ ملے بغیر چلا گیا ـــ بات ہی کچھ ـــ ایسی ـــ ہو گئی تھی ـــــ" اس نے رُک رُک کر فقرہ مکمل کیا۔ علی نواز نے سوچا وہ شرمندگی کی وجہ سے رُک رُک کر بات کر رہی ہے۔

"نہیں بیٹی! ہرگز نہیں۔ میری حالت پہلے سے بہتر ہو گئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب اسی ہفتے مجھے چلنے پھرنے کی اجازت دے دیں گے۔ میں گھر جا کر تم دونوں کو اپنے ہاں بلاؤں گا۔ تم از کم ایک مہینہ تک تم وہیں رہو گے ـــ کیوں بیٹی!"

سائرہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"دیکھو بیٹی! میرے بیٹے کو صحت یابی پر میری طرف سے ہزاروں مبارکباد دیں دینا۔ اللہ تم دونوں کو سدا سکھی رکھے۔"

سائرہ سر جھکائے کمرے کے باہر چلی گئی۔ علی نواز نے دیکھا کہ وہ اسی طرح سر جھکائے چلی جا رہی ہے۔

وہ ہر روز آتی تھی اور آکر بتاتی تھی ۔۔ آج یوسف نے لمبی سیر کی ہے ۔۔ آج اس نے پیٹ بھر کر اپنی من پسند چیزیں کھائی ہیں ۔ ادھر علی نواز کی صحت میں بڑی نمایاں تبدیلی رونما ہو چکی تھی ۔ اس کی صحت کافی حد تک عود کر آئی تھی ۔ ڈاکٹر خود حیران تھا کہ اس کی حالت میں ایسی خوشگوار تبدیلی کیسے آگئی ہے ؟

دسمبر کا آدھا مہینہ گزر گیا تھا ۔ کوہستانی علاقوں میں یہ مہینہ برف باری کے لئے مخصوص ہے ہسپتال کے لان میں آمد و رفت خاصی کم ہو گئی تھی ۔ دو ہفتوں کے بعد برف گرنی رک گئی تھی فضا میں سفیدیاں پھیلی ہوئی تھیں اور ان سفیدیوں میں سورج کی کرنیں سونے کے تاروں کی طرح بکھر گئی تھیں ۔

دن گزرتے جا رہے تھے ۔ اور علی نواز کی حالت پہلے کی نسبت خاصی بہتر ہو گئی تھی ۔ اسے ہسپتال سے جانے کی بھی اجازت مل گئی تھی ۔ مگر وہ حیران تھا کہ پچھلے پانچ روز سے سائرہ کیوں نہیں آئی ۔

اور چھٹے روز سائرہ آگئی ۔

اس کے چہرے پر ایک گہری اندرونی کشمکش کی کیفیت طاری تھی ۔ وہ اندر آئی اور دیوار کے قریب چپ چاپ کھڑی ہو گئی ۔ علی نواز اسے دیکھ نہ سکا اور جب دیکھا تو اسے معلوم ہو گیا کہ سائرہ دیر سے وہاں کھڑی تھی ۔

" میں آج آپ سے کچھ کہنے کے لئے آئی ہوں ۔ اس نے بڑے دھیمے لہجے میں کہا ۔

علی نواز اس کے قریب ہو گیا ۔

" کہو بیٹی ؟ "

انکل ! آپ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ میں نے پچھلے کئی دن اور کئی راتیں کس اضطراب اور کرب میں کاٹی ہیں ۔"

وہ خاموش ہو گئی ۔

"مگر کیوں بیٹی!"

"میں ــــ انکل! میں نے آپ کے ساتھ اور اپنے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا ــــ وہ یوسف ــــ ہسپتال میں ــــ ان کی حالت بڑی خراب ہوگئی تھی ــــ ہم انہیں گھر لے گئے ــــ اور تین دن کے بعد وہ چل بسے ــــ انکل میں آپ کو بتا نہ سکی ــــ میں نے سوچا آپ کو بڑا اشتیاق ہو گا ــــ آپ کی صحت کو بڑا دھچکا لگے گا ــــ آپ ــــ اوہ انکل! میں نے جھوٹ بولا ــــ میں نے فریب ــــ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا ــــ مجھے سچ کہہ دینا چاہیئے تھا ــــ پر ــــ انکل! میری زبان رکی رہی ــــ مجھے معاف کر دیجئے انکل ــــ معاف کر دیجئے۔"

سائرہ زار و قطار رونے لگی۔ اس کا بدن بری طرح کانپ رہا تھا۔

علی نواز آنکھیں جھپکائے بغیر اسے دیکھ رہا تھا۔

"رو نہیں بیٹی! تم نے کوئی جھوٹ نہیں بولا ــــ کوئی دھوکا نہیں دیا ــــ کیونکہ تمہاری نیت نیک تھی ــــ تمہارے اندر میرے لئے ہمدردی اور محبت کے سوا اور کچھ نہیں تھا ــــ رو نہیں بیٹی۔ زندگی میں تو ہر خلا کسی نہ کسی طرح پُر ہو جاتا ہے سائرہ بیٹی! میں آج تمہیں بتاتا ہوں ــــ میں نے تمہیں صرف یہی بتایا تھا کہ میرا بیٹا اور بہو سات سال سے جرمنی میں ہیں ــــ"

سائرہ نے آنسو بھری آنکھیں اوپر اٹھائیں۔

"بیٹی! دو سال ہوئے وہ ایک کار کے حادثے میں مر گئے تھے۔"

"انکل!"

"وہ مر گئے تھے بیٹی۔"

اب سائرہ کے چہرے کا کرب ختم ہو گیا تھا اس کی جگہ ایک نرمی اور ملائمت آگئی تھی۔

علی نواز نے اپنا دایاں ہاتھ بڑھایا اور اس کے سر پر رکھ دیا۔

بند گلی، بڑا مسئلہ

اس گلی کا شمار لاہور کی اُن پانچ چھ گلیوں میں ہوتا تھا جو بڑی لمبی تھیں مگر اُس گلی کو تو یہ امتیازی شان بھی حاصل تھی کہ جب بازار سے اس کے اندر داخل ہوتے تھے تو دونوں طرف کھڑے ہوئے مکانوں کے درمیان کافی فاصلہ ہوتا تھا، مگر پھر بتدریج گلی تنگ ہوتی چلی جاتی تھی اور آخر میں تو اس قدر تنگ ہو جاتی تھی کہ دو آدمی بھی پہلو بہ پہلو چل کر باہر نہیں نکل سکتے تھے۔ ۴۷ء سے پہلے اس گلی کی بیشتر آبادی غیرمسلم خاندانوں پر مشتمل تھی اور جو چند ایک مسلم گھرانے آباد تھے تو یہ وہ لوگ تھے جو سبزیاں اور پھل بیچتے تھے یا موچی، لوہار اور بڑھئی تھے۔ ان کی دکانیں گلی کے اندر ہی کھلی رہتیں اور آبادی کی اکثریت کے لئے ان کی خدمات میں کبھی کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔

پاکستان قائم ہوا تو غیرمسلم آبادی اپنے مکانوں کو چھوڑ کر بھارت میں منتقل ہو گئی اور اس کی جگہ اس گلی کے خالی مکانوں میں مسلمان مہاجرین نے رہائش اختیار کر لی۔ اس مدت میں گلی کے اندر جو مسلمان رہتے تھے ان میں سے سوائے ایک بوڑھے بڑھئی الدین کے سب کے سب موقع سے فائدہ اٹھا کر دوسرے محلوں کے اچھے اچھے خالی مکانوں میں چلے گئے۔ الدین ایسا نہ کر سکا ایک تو اس وجہ سے کہ اسے یہاں رہتے ہوئے کم و بیش نصف صدی گزر گئی تھی اور دوسری وجہ یہ کہ وہ تنہا تھا۔ تنہا آدمی کو لالچ کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟

قیام پاکستان کے بعد اس گلی میں کوئی پرانا مکان گرا کر اس کی جگہ نیا مکان نہ بنایا گیا، البتہ مسلم آبادی نے گلی کی ایک ایسی عمارت کو جس میں پہلے رہنے والوں نے ایک ریڈنگ روم قائم کر رکھا تھا

اسے ضروری ترمیم کے بعد مسجد بنا دیا۔ ریڈنگ روم کا مسجد بن جانا الدین کے لئے مفید ثابت ہوا اور وہ اس طرح کہ بڑھاپے کی وجہ سے وہ اپنا دھندہ نہیں کر سکتا تھا یا کرتا تو وہ ناقص ہوتا۔ محلے کی مسجد کمیٹی نے اسے بتیس روپے ماہانہ تنخواہ پر مسجد کی صفائی کے لئے ملازم رکھ لیا اور یوں اسے زندگی کی بنیادی ضرورتیں مہیا کرنے کا ایک وسیلہ مل گیا جس پر وہ ہر طرح مطمئن تھا۔

گلی کے دو سب سے اونچے مکان گلی کے ان دو کونوں میں واقع تھے جن کے آگے کئی گز کا فاصلہ چھوڑ کر سڑک چلی گئی تھی۔ ان دونوں مکانوں میں تاجر پیشہ لوگ رہتے تھے۔ ایک مکان میں لدھیانے کا ایک خاندان آباد ہو گیا تھا جس کے سربراہ علی احمد انصاری تھے۔ اس کے بالمقابل جو مکان کھڑا تھا۔ اس میں دلی کا کوئی تاجر آ بسا تھا۔

انصاری صاحب خاصے آسودہ حال تاجر تھے۔ تاہم آدمی ہم جو تھے قدرتی طور پر ان کی نظر خوب سے خوب تر پر رہتی تھی۔ انہوں نے پہلے سعودی عرب میں جانے کی کوشش کی اس میں کامیابی نہ ہو سکی تو قطر میں چلے گئے وہاں ان کا کاروبار روز بروز وسیع ہوتا گیا تو انہوں نے آہستہ آہستہ بیوی بچوں کو بھی وہیں بلوا لیا اور مکان پر تالا لگا دیا کہ جب کبھی حالات نے واپس آنے پر مجبور کر دیا تو اس کو اپنا ٹھکانہ بنا لیں گے۔

انصاری صاحب جب قطر پہنچے تو ان کو غالباً یہ توقع تھی کہ وہ تین چار سال کی مدت میں خوب دولت کما کر واپس آ جائیں گے، لیکن وہ وہاں سے سعودی عرب جا پہنچے اور وہاں سے آگے بڑھے تو معلوم ہوا کہ مع اہل و عیال لندن پہنچ گئے ہیں ان کا جو خط ان کے تابعدار دوست خان صاحب اکبر خان کے ہاں پہنچا، اس میں وہ یہی بتاتے کہ بس وہ ایک سال کی بات ہے وہ واپس اپنے پرانے گھر میں آ جائیں گے لیکن چھ سال بیت گئے اور ان کے آنے کا کوئی سال اور مہینہ مقرر نہ ہو سکا۔

ساتواں برس شروع ہوا تو لاہور میں بے پناہ بارش ہوئی اگر انصاری صاحب مکان کے اندر موجود ہوتے تو انہیں علم ہو جاتا کہ ان کے مکان کی بالائی منزل کی دیواروں پر جا بجا

خراشیں پڑ گئی ہیں۔ فرش پر چھت میں سے پانی ٹپک ٹپک کر جمع ہوتا جا رہا ہے اور ایک رات جب بارش اپنے پورے عروج پر تھی، اس گلی کی فضا میں ایک ایسا دھماکا ہوا کہ سب کے دل دہل گئے ہر شخص کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے ہمسائے میں کوئی مکان گر پڑا ہے۔ خوف و دہشت کے عالم میں زبانیں گنگ سی ہو گئیں۔ بجلی تو سر شام ہی جا چکی تھی۔ گھپ اندھیرے میں اصل حقیقت کا کسی کو بھی علم نہ ہو سکا۔ پھر کچھ نوجوان ہاتھوں میں ٹارچ لے کر اپنے اپنے گھروں سے باہر آ گئے۔ معلوم ہوا انصاری صاحب کا مکان گر گیا ہے۔

آہستہ آہستہ لوگوں کے اوسان بحال ہونے لگے قریب ہی اتنا بڑا حادثہ ہو جائے تو لوگ سو کیونکر سکتے ہیں۔ ہر تین چار گھروں کے مرد اور عورتیں اکٹھے ہو کر الگ الگ ٹولیوں میں اس واقعے پر اظہار خیال کرنے لگے۔

مکان گر پڑا تھا، مگر اطمینان کی صورت یہ تھی کہ کوئی جانی نقصان نہیں ہوا تھا، کیونکہ جو دیواریں زمین بوس ہو گئی تھیں وہ گذشتہ سات برس سے اس خاندان کے افراد کی صحبت سے محروم ہو چکی تھیں جو ان کے درمیان رہتے تھے۔

صبح ہونے میں ابھی ڈیڑھ دو گھنٹے باقی تھے کہ بارش تھم گئی ـــ لیکن ابھی روشنی نہیں ہوئی تھی اور ٹارچوں کی مدھم روشنی میں صورت حال کا صحیح جائزہ نہیں لیا جا سکتا تھا۔

گلی کی مسجد میں مؤذن نے اذان دی تو لوگ مسجد کی طرف رخ کرنے سے پہلے جائے حادثہ کی طرف جانے لگے، وہاں اور تو کچھ نہیں ہوا تھا، اینٹوں اور ملبے کے ڈھیر سے وہ راستہ مسدود ہو گیا تھا جو بازار کی سڑک سے جا ملتا تھا اور اس ڈھیر کو ہٹانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔

پہلے دن جائے حادثہ پر لوگوں کا تانتا بندھا رہا۔ صرف گلی ہی کے نہیں ان محلوں سے بھی لوگ آتے جاتے رہے جنہیں انصاری صاحب کے مکان کے گرنے کی خبر مل گئی تھی۔ انہوں نے اس سے پیشتر بھی گرے ہوئے مکان دیکھے ہوں گے، مگر انسانی فطرت میں جو ایک غیر معمولی واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی خواہش چھپی رہتی ہے وہ انہیں وہاں جوق در جوق آنے پر مجبور کر رہی تھی۔ وہ جب

ادھر ادھر بکھری ہوئی اینٹوں کے علاوہ اپنے سامنے چھت کی گری ہوئی شہتیریوں، ٹوٹے پھوٹے فرنیچر اور گھریلو استعمال کے برتنوں کو دیکھتے تھے تو نہ جانے اس منظر پر انہیں کیا کشش محسوس ہوتی تھی کہ وہاں سے نظریں ہٹانا ان کے لئے مشکل ہو جاتا تھا۔

گلی کے سارے لوگ وہاں آ کر واپس جا چکے تھے اور جو نہیں آئے تھے وہ کسی خاص مجبوری کی وجہ سے گھروں سے باہر نہیں نکلے تھے، البتہ ایک شخص ایسا تھا جو نہ تو وہاں پہنچا اور نہ وہاں پہنچنا چاہتا تھا، کیونکہ اس کے روزمرہ کے معمولات میں کبھی کسی قسم کی بے قاعدگی نہیں ہوئی تھی اور اس دور میں بھی وہ کسی بے قاعدگی کو پسند نہ کر سکا۔ وہ رات کی روٹی توے پر گرم کر کے اور اسے چادر کے ساتھ کھا کر مسجد میں آ گیا تھا اور معمول کے مطابق اس کی صفائی میں مصروف ہو چکا تھا شریف حلوائی کا بیٹا عنایت جب مسجد کے سقاوے میں نہانے کے لئے آیا اور اس نے الدین کو بدستور مسجد کے فرش پر گیلا کپڑا پھیرتے ہوئے دیکھا تو پوچھا:

"چاچا! پتا ہے رات انصاری صاحب کا مکان گر پڑا تھا۔"

الدین نے اس کے جواب میں سر ہلایا۔

"دیکھا چاچا؟"

"نہیں یہ کوئی تماشا ہے؟"

لڑکے نے اور کچھ نہ پوچھا اور سقاوے میں چلا گیا۔

انصاری صاحب کا مکان کیا گرا تھا تین ایسے مسئلے پیدا ہو گئے تھے جن کا تعلق گلی کی اجتماعی زندگی سے ہونا ایک فطری امر تھا۔ پہلا مسئلہ یہ تھا کہ انصاری صاحب کو اس حادثے کی اطلاع کیونکر دی جائے۔ دوسرا مسئلہ یہ کہ جب تک وہ یہاں نہیں آتے ان کے سامان کا کیا کیا جائے۔ بہت سا سامان تو ملبے کے نیچے دب گیا تھا، مگر کچھ فرنیچر اور برتن نکالے جا سکتے تھے۔ انہیں کہاں اور کیسے رکھا جائے اور تیسرا مسئلہ تھا گلی کے اس حصے سے ملبہ ہٹانا، کیونکہ ملبہ ہٹائے بغیر گلی والوں کا بیرونی دنیا سے کوئی رابطہ سہولت کے ساتھ برقرار نہیں رہ سکتا تھا۔ زمین کا وہ حصہ جو گلی کو بیرونی

سڑک سے ملاتا تھا وہ تمام کا تمام ملبے سے ڈھک چکا تھا اور ملبے کے اوپر سے گزرنا بڑا دشوار کام تھا۔

اسی شام کو محلہ کمیٹی جسے گلی کے ایک رفاہی ادارے کی حیثیت حاصل تھی، کے صدر خان صاحب اکبر خان کے مکان میں گلی کے اہل الرائے افراد کی ایک میٹنگ ہوئی جس میں یہ طے کیا گیا کہ ملبے کو ہٹانا بہت ضروری ہے اس کی اطلاع فوری طور پر کارپوریشن کو دینی چاہیئے۔ انصاری صاحب کو فوراً خط لکھ دینا چاہیئے کہ ان کا مکان گر پڑا ہے، آکر اپنا سامان لے جائیں۔ خط لکھنے کی ذمہ داری خان صاحب نے برضا و رغبت قبول کر لی۔ کارپوریشن کو اطلاع دینے کا فریضہ کمیٹی کے سیکرٹری نور محمد ٹھیکیدار کے حوالے کر دیا گیا۔

تین روز بیت گئے، مگر کارپوریشن کا عملہ حرکت میں نہ آسکا، تو گلی کے لوگوں نے کمیٹی کے صدر خان صاحب سے شکایت کی کہ ہماری دقت دور نہیں ہوئی۔ ہمیں باہر نکلنے کے لئے گلی کے دوسرے سرے پر جانا پڑتا ہے اور یہ کافی دور ہے۔ خان صاحب نے سیکرٹری کو بلا کر پوچھا:

"ٹھیکیدار صاحب! آپ نے کارپوریشن سے رابطہ قائم نہیں کیا؟"

ٹھیکیدار صاحب نے نفی میں سر ہلایا اور اپنے رویے کی وضاحت یوں کی:

"خان صاحب! کارپوریشن کو اطلاع دینا میرے لئے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ایک آدھ گھنٹے میں یہ کام کیا جا سکتا ہے، مگر میں سوچتا ہوں انصاری صاحب کا سارا سامان ملبے کے نیچے پڑا ہے۔ اس سامان کے ساتھ گڑبڑ کا اندیشہ ہے۔ کل انصاری صاحب نے آکر پوچھا خان صاحب! کیا آپ میرے سامان کی حفاظت نہیں کر سکتے تھے۔ تو اس وقت جواب دینا مشکل ہو جائے گا۔ بہتر یہ ہے کہ براہ راست انصاری صاحب سے رابطہ قائم کیا جائے۔ اس طرح کل ہم پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

بات معقول تھی۔ کمیٹی کے ارکان کی سمجھ میں آگئی۔ سب نے رائے دی:

"خان صاحب! آپ انصاری صاحب کو تار دے دیں یا ان کا ٹیلیفون نمبر دریافت کر کے

ڑنگ کردیں۔ ٹھیکیدار صاحب نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔ ہمیں یہ الزام اپنے سر نہیں لینا چاہیئے۔ تیسرے روز کمیٹی کی میٹنگ ہوئی تو خان صاحب نے بتایا، میں نے ٹیلی گرام بھیج دیا ہے۔ انصاری صاحب ٹیلی گرام ملتے ہی یہاں آجائیں گے۔

گلی والوں کی دقت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ کوئی بیمار ہوتا تو گلی کے اندر سواری کا بندوبست کرنا ناممکن تھا۔ بیمار کو بڑی مشکل سے دوسرے راستے سے باہر لے جایا جاتا تھا اور وہاں جا کر تانگے کا بندوبست کیا جاتا تھا۔

گلی والے صبر و تحمل کے ساتھ یہ وقت برداشت کر رہے تھے کیونکہ انہیں یقین تھا کہ انصاری صاحب ہوائی جہاز میں بیٹھ کر فوراً آجائیں گے اور راستہ صاف کرادیں گے۔

چار دن گزر گئے۔ فضا میں اضطراب اور بے چینی کے آثار محسوس کئے جانے لگے۔ گلی کا ایک شخص دوسرے سے کہتا۔

چار دن گزر گئے ہیں، تار تو ایک دن میں پہنچ جاتا ہے۔ ہوائی جہاز کا سفر ایک دن کا نہ سہی ڈیڑھ دن کا ہی اب تک تو انصاری کو آجانا چاہیئے تھا۔

مخاطب جواب دیتا،

"ضرور پہنچ جانا چاہیئے تھا، وہ کیوں نہیں آیا؟"

خان صاحب جب بھی کسی غرض سے کہیں آتے جاتے تو ان سے سلام کے بعد یہی سوال کیا جاتا،

"خان صاحب جی! انصاری صاحب آجائیں گے ناں؟"

خان صاحب ایک ہی جواب دیتے:

"آئے گا، کیوں نہیں آئے گا؟" ان کے لہجے میں دبا دبا غصہ ہوتا۔

ایک صبح گلی کے لوگ سو کر اٹھے تو انہوں نے ایک نئی خبر سنی۔ خبر یہ تھی کہ راتوں رات کسی نے انصاری صاحب کا سامان نکال لیا ہے۔ واقعی وہ شکستہ فرنیچر اور تانبے وغیرہ کے برتن

جو ملبے میں دھنسے ہوئے ہر روز نظر آیا کرتے تھے اب غائب تھے۔ ملبے کے ارد گرد پھر تماشائیوں کا ہجوم ہونے لگا۔ لوگ ایک دوسرے سے پوچھتے۔

"یہ سامان کون لے گیا؟"

یہ سوال سننے والا اپنی حیرت کے اظہار کے سوا اور کچھ نہ کہہ سکتا۔

اس روز شریف اور بسا رنگریز مسجد کے قریب سے گزر رہے تھے تو انہوں نے دیکھا کہ نور محمد ٹھیکیدار چاچا الہ دین سے ہولے ہولے کچھ کہہ رہا تھا اور الہ دین نے اپنے دائیں ہاتھ کی انگلی آسمان کی طرف اٹھا رکھی ہے۔ شریف اور بسا کسی نئی خبر کی امید میں وہیں رک گئے۔ بسا بولا،

"ٹھیکیدار صاحب کوئی سرِ تیا چلا؟"

ٹھیکیدار نے جواب دیا:

"میں نے چاچے سے پوچھا ہے تم راتوں کو بہت کم سوتے ہو، گلی کی چوکیداری کرتے رہتے ہو، معلوم ہوگا تمہیں یہ بدذاتی کس نے کی ہے؟"

ضرور پتا ہوگا جی کیوں چاچا؟

الہ دین نے اپنی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکالا، اس کی انگلی بدستور آسمان کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔

اتنے میں عنایت بھی آ گیا۔ وہ معنی خیز انداز میں اپنا سر ہلا رہا تھا اور اس کی آنکھیں کسی خاص انکشاف پر چمک رہی تھیں سارے گلی والے عنایت کو گپ باز سمجھتے تھے۔ اس کی بات پر بہت کم اعتماد کیا جاتا تھا اور شریف نے اس ڈر سے کہ کہیں اس کا بیٹا کوئی سنسنی خیز خبر سنا کر خواہ مخواہ فتنہ نہ اٹھا دے، اس کو سختی سے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

پتر! باز آجاؤ اپنی حرکتوں سے سنا تم نے؟

مگر عنایت نے جھٹ کہہ دیا۔

"انصاری صاحب کا سامان پتا نہیں کون لے گیا۔ پر میاں جی"
عنایت اپنے باپ کو میاں جی کہتا تھا۔ اس کے منہ سے پر کا لفظ سن کر بسا بولا:
"پترا بتانا کیا معاملہ وا ملہ ہے؟"
اب کے عنایت بسا سے مخاطب تھا:
"نتھو قلعی گر ڈھیر سارے برتن کس کے قلعی کر رہا ہے؟"
اس کے باپ اور بسے نے اپنی نظریں عنایت کے چہرے پر جما دیں۔ چاروں نظریں بڑی بے تابی سے پوچھ رہی تھیں:
"کس کے برتن؟"
عنایت کی دھوتی ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ اس نے اسے اپنی کمر پر کس کر باندھا اور ایک طرف جاتے ہوئے کہنے لگا:
"خان صاحب کے۔ ان کے مکان کے پچھواڑے دیکھو جا کر۔"
شریف نے زور سے تھوکا اور بیٹے سے کہا:
"چپ نیتے بے شرماں ــــ"
عنایت لے جاتے جاتے قہقہہ لگایا اور ایک لمحہ بھی نہ ٹھہرا۔ عجیب بات تھی الدین کی انگلی اب بھی آسمان کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ ٹھیکیدار صاحب کہہ رہے تھے، دیکھ لیا شریف تیرا بیٹا جیل میں جائے گا۔
گلی والے خان صاحب کی بڑی عزت کرتے تھے۔ کئی گھروں میں تو ان کے گھر سے روزانہ صبح لسی کے بھرے ہوئے ڈول جاتے تھے۔ علاوہ ازیں وہ مسجد کی مرمت کے کام میں سرگرمی سے حصہ لیتے رہتے تھے۔ تاہم یہ خبر پھیلنا شروع ہو گئی۔
بسے نے ابراہیم درزی سے سرگوشی کی، ابراہیم نے عبدالکریم کپڑا بیچنے والے کے کان میں کہہ دی عبدالکریم نے جمال مٹھائی فروش تک پہنچا دی۔ اور ہر ایک جب یہ خبر دوسرے پر اعتماد کرتے

ہوئے بتاتا تھا تو ساتھ تاکیداً یہ بھی کہہ دیتا، یار! میں صرف تمہیں بتا رہا ہوں، کسی اور کو ہرگز نہ بتانا۔ اور رازداری کا یہ معاملہ اس طرح چلا کہ خان صاحب کے کانوں میں بھی اس کی بھنک پڑ گئی۔ جس شخص نے ان کو یہ بات بتائی تھی، اس کو توقع تھی کہ وہ اس کے الفاظ سنتے ہی بھڑک اٹھیں گے اور عنایت کو بے عزت کر کے رکھ دیں گے۔ مگر انہوں نے دو تین لمحوں کے لئے گردن جھکا کر کچھ سوچا اور چپ چاپ اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ خبر سنانے والے کی نظریں اس وقت تک ان کا تعاقب کرتی رہیں جب تک وہ گھر کے اندر نہ چلے گئے شام سے پہلے پہلے خان صاحب کے ردعمل کا بھی ہر ایک کو علم ہو گیا ٹھیکیدار نور محمد کو اس کا علم ہوا تو وہ دودھ کا خالی گلاس اپنی نوکرانی کو دیتے ہوئے ابراہیم سے کہنے لگا!

"ابراہیما! پتیلی میں پانی اُبل رہا ہے۔ ڈھکنا گر پڑے گا۔ میں نے کہا تھیں تھا عنایت جیل جائے گا۔"

"اچھا ٹھیکیدار جی!"

"دیکھ لینا۔ ہوتا کیا ہے ابراہیما! کسی پر الزام لگانا آگ سے کھیلنا ہے، ضرور کچھ ہوگا۔"

اور اسی وقت بشے نے آ کر بتایا!

"ٹھیکیدار جی! مسجد میں میٹنگ ہو رہی ہے، خان صاحب نے آپ کو بلایا ہے جلدی چلئے۔"

ٹھیکیدار نے ابراہیم کو اس انداز سے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو، دیکھ لو میں نہ کہتا تھا ضرور کچھ ہوگا

ابراہیم نے سر ہلا کر اس کی تائید کر دی۔

مسجد میں اتنے لوگ جمع ہو چکے تھے کہ صحن بھر گیا تھا۔ خان صاحب دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے شریف کھڑا تھا جس کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ ٹھیکیدار پہنچا، تو ایک دم کئی آوازیں بلند ہو گئیں۔

"آیئے ٹھیکیدار صاحب!"

کئی لوگوں نے ان کے لئے اپنی جگہ خالی کر دی اور خود کھڑے ہو گئے۔ خان صاحب نے

انہیں اپنے قریب بُلا لیا اور جو لوگ اٹھ بیٹھے تھے وہ دوبارہ بیٹھ گئے۔

لوگ آپس میں کچھ کہہ سن رہے تھے۔ لگتا تھا ہر ایک دوسرے سے سرگوشی کر رہا ہے۔ اتنے میں خان صاحب نے اپنا دایاں ہاتھ سر اپن لہرایا اور کہنے لگے: "بھائیو! کیا آپ مجھے جانتے ہیں؟"

سب آوازیں گونج اٹھیں: "جی ہاں"

خان صاحب نے تھوک اپنے حلق سے نیچے اتاری اور اپنے دائیں ہاتھ کو آہستہ آہستہ حرکت دیتے ہوئے بولے: "میں نے نو دس برس آپ سب کی خدمت کی ہے، آپ سب نے مسجد کمیٹی کا مجھے صدر چنا تھا۔ چنا تھا، یا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"چنا تھا، چنا تھا۔ ۔ ۔" آوازوں کا ایک طوفان برپا ہو گیا۔

خان صاحب نے حاضرین کو مخاطب کر کے پوچھا،

"کبھی آپ نے مجھے بددیانتی کرتے ہوئے پایا ہے؟"

"نہیں نہیں"

"مگر آج مجھ پر الزام لگایا جا رہا ہے کہ میں نے انصاری کے گھر سے برتن چرا لئے ہیں۔ او لوگو! اللہ سے ڈرو، اللہ کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے ۔ یاد رکھو ۔ ۔"

شریف اور ایک قدم اٹھا کر خان صاحب کے قریب چلا گیا۔

خان صاحب جی! ـــ میں معافی مانگتا ہوں، ہاتھ جوڑتا ہوں" اور وہ ہاتھ جوڑ کر گڑگڑانے لگا۔

"معافی مانگنے کی کوئی ضرورت نہیں ـ میں خان صاحب سے پوچھتا ہوں ان کے مکان کے پچھواڑے منقوتلعی گر دو دن سے کس کے برتن قلعی کر رہا ہے اور ابھی برتن ختم نہیں ہوئے یہ سینکڑوں برتن آخر کہاں سے آ گئے ہیں؟"

سب کی نظریں عنایت کی طرف اٹھ گئیں وہ اس جگہ کھڑا تھا جہاں نمازی جوتے رکھتے ہیں۔

"چپ او حرامزادے" شریف گرجا۔

عنایت نے باپ کے غصّے کا کوئی خیال نہ کیا، کہنے لگا،

انصاری صاحب کے مکان کے ملبے میں جو برتن نظر آتے تھے وہ کہاں غائب ہو گئے ہیں۔ کیا خان صاحب بتائیں گے کہ ہفتے کی رات کو ان کی ایک نوکرانی اور دو نوکر دھڑا دھڑ برتن نکال کر نہیں لے گئے تھے؟ عنایت نے اپنا فقرہ مکمل کر کے چھوڑا۔ اگرچہ اس کا باپ خبیث کتے چُپ کر کہتا رہا۔

"خان صاحب اس کتے کو جواب دیں" بشیر نے کہا۔

"ہرگز نہیں۔ خان صاحب ایک آوارہ گرد، غیر ذمے وار جھوٹے مکار لونڈے کو جواب ہرگز نہیں دیں گے۔" ٹھیکیدار صاحب نے اٹھ کر پرجوش لہجے میں کہا۔

"خان صاحب کو جواب دینے دیں" ابراہیم نے کہا۔

"نہیں۔ بالکل نہیں۔ جواب دینا خان صاحب کی توہین ہے" ٹھیکیدار خان صاحب کا پوری طرح دفاع کر رہا تھا۔ ادھر خان صاحب کی حالت یہ تھی کہ وہ بڑے سکون کے ساتھ بیٹھے تھے اور تحسین آمیز نظروں سے ٹھیکیدار کو دیکھ رہے تھے۔

عنایت بولا؛

"خان صاحب جی ابھی ملبے کے نیچے اور برتن اور قیمتی سامان بھی ہے ۔۔۔" یہ کہہ کر وہ تیزی مڑا اور جانے لگا۔ ٹھیکیدار پکڑلو اس بدمعاش کو" کہتا رہ گیا ۔۔۔

میٹنگ ختم ہو گئی۔ لوگ ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو جانے لگے۔

اس میٹنگ کے ایک روز بعد ۔۔۔

مسجد کے صحن میں شریف، ابراہیم اور نھتو بیٹھے تھے۔ شریف اور ابراہیم مسجد سے نہا کر واپس جا رہے تھے کہ نھتو نظر آیا جو خان صاحب کے مکان سے کچھ فاصلے پر چلا جا رہا تھا۔ انہوں نے اسے روکا اور اصرار کر کے مسجد میں لے آئے۔ وہ اس سے بار بار انصاری کے برتنوں کے بارے میں دریافت کر رہے تھے اور وہ تھا کہ صرف ایک ہی فقرہ رٹے جا رہا تھا۔

" برتن خان صاحب نے دیئے تھے۔ بس اللہ جانے کس کے :"

اس سے زیادہ اس نے ایک لفظ بھی نہ کہا اور باہر جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ جب وہ جوتے پہن رہا تھا تو کہنے لگا:

محنت مجوری کر کے بال بچوں کا پیٹ بھرتا ہوں مجھے ذگھسیٹو اس معاملے میں ہاں کہہ دیا ہے:" وہ یہ الفاظ کہہ کر چلا گیا۔ شریف اور ابراہیم ایک دوسرے کا منہ تکتے رہ گئے۔

شریف تولیے کا کونہ دانتوں تلے دبانے لگا اور ابراہیم نے بغیر کسی مقصد کے صابن دانی سے صابن نکالا اور اسے ناک کے پاس لے جا کر سونگھنے لگا۔ ان سے کچھ دور مسجد کے صحن کے کنارے اردین ایک ٹوٹی ہوئی ڈبل اینٹ سے اس بکس کے کیل درست کر رہا تھا جس میں نمازی جوتے رکھ کر مسجد کے اندر نماز پڑھنے کے لئے جاتے تھے۔ انہماک کے عالم میں اس کے منہ سے تھوک بہہ کر داڑھی کے گرد آلود بالوں میں جذب ہو رہی تھی۔ اس کی نگاہیں بکس پر جمی تھیں اور لگتا تھا کہ اسے شریف اور ابراہیم کی موجودگی کا کوئی علم نہیں ہے۔

عنایت ہاتھ میں پیتل کا ایک ڈول لٹکائے اندر آیا اور ایک ٹوٹی کھول کر اسے پانی سے بھرنے لگا۔ شریف کی اس پر نظر پڑ گئی۔ غصے سے بولا:

" او بے شرماں۔ بے حیاوا!"

عنایت نے ٹوٹی بند کر دی اور باپ کی طرف دیکھ کر کہنے لگا:

" میں بے شرم کیوں ہوں؟"

" کر کیا رہا ہے؟" باپ نے پوچھا۔

" کر کیا رہا ہوں۔ نیاز نے گاہکوں کو لسی بنا کر دینی ہے۔ بولا یار ڈول میں ذرا پانی تو لے آ۔ اس میں بے شرمی کیا ہے میاں جی!"

اس سے پیشتر کہ شریف اپنے بیٹے سے مزید کچھ کہے ابراہیم نے کہا:

پتر! یہ بے شرمی کا کام نہیں ہے جو تو نے کل کیا تھا۔ توبہ۔ توبہ خان صاحب پر اتنا بڑا

الزام اللہ سے ڈرو بترؔ۔

عنایت نے ڈول ایک طرف رکھ دیا۔"

"میں نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔"

"میں کہتا ہوں بک بک بند کر۔" شریف کا ہاتھ بے اختیار پاؤں کی طرف گیا، مگر جوتے تو وہ صحن سے باہر اتار آیا تھا۔

"میاں جی! اگر خان صاحب کہہ دیں کہ میں جھوٹا ہوں۔ یوں نہیں سر پہ قرآن اٹھا کر — تو مجھے سات چوروں کی سزا دیں، اُف نہیں کروں گا۔"

شریف کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا اور وہ اپنے بیٹے کو خونخوار نظروں سے دیکھنے لگا۔

عنایت نے ڈول ایک ہاتھ میں اٹھا لیا۔

"میاں جی، کل جو انصاری آئے گا تو گلی کے لوگ اسے کیا منہ دکھائیں گے۔ پوچھے گا یارو! میرے برتنوں اور چیزوں کی حفاظت بھی نہ کر سکے، منہ دکھا سکو گے؟"

عنایت چلا گیا۔ فضا میں ایک سناٹا چھا گیا۔ شریف اور ابراہیم کی سوچتی ہوئی آنکھیں جھک گئی تھیں۔ الہ دین کے ہاتھ سے اینٹ گرنے ہی والی تھی۔ وہ اثبات میں سر ہلا رہا تھا۔

"شریف یار!" ابراہیم نے اپنے دوست سے سرگوشی کی۔

شریف ایک کشمکش میں مبتلا ہو گیا تھا۔

"یار، تیرا پتر بات سچی کہہ گیا ہے۔ یار سچ، ہم انصاری کو کیا منہ دکھائیں گے؟"

شریف کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ اپنے دوست کو گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔

"یہ سامان کون لے گیا؟" اس نے پوچھا۔

ابراہیم ایک دو لمحے خاموش رہ کر کہنے لگا۔

"تیرا پتر کہتا ہے خان صاحب قرآن۔۔۔"

"اس حرام زادے کی بات چھوڑو۔"

ابراہیم نفی میں سر ہلانے لگا :

"نہیں یار! دال میں کچھ کالا ہے۔ پر آج و ڑو میں کہتا ہوں انصاری کو کیا منہ دکھائیں گے۔"

"کیا منہ دکھائیں گے، کیا منہ دکھائیں گے۔ یہی رٹ لگا رکھی ہے" شریف کا پارہ برابر چڑھ رہا تھا۔ "راستہ بند ہے، کوئی مرگیا تو جنازہ کیسے نکلے گا؟" اس نے فقرہ مکمل کیا۔

ابراہیم کے چہرے پر سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔

"شریف یار! انصاری بڑا اچھا آدمی تھا۔ میری صغراں کا بیاہ ہوا تو پانچ سو روپے دے کر بولا لے یار! کام چلا، تیری بیٹی میری بیٹی ہے۔ آکر کہے گا نہیں کہ میرا مال اسباب کہاں گیا، تم لوگ اندھے ہو گئے تھے؟ اپنے گھروں میں لے گئے ہو!"

شریف ابراہیم کے آخری فقرے پر چونک پڑا۔ اس کے چہرے کی سرخی بتدریج ہلکی ہوتی گئی۔ اچانک اس کی توجہ معاملے کے اس پہلو پر چلی گئی جس کا اس سے پہلے اس نے خیال تک نہیں کیا تھا۔ کہنے لگا "ہم سب کو چور سمجھے گا ــــ بہت بڑا ہوگا" نتھنوں کے متحرک ہونے سے اس کی مونچھیں کانپ سی رہی تھیں۔

اللہ دین نے اپنا کام ختم کر لیا تھا۔ اس نے اینٹ مسجد کی دیوار کے ساتھ لگا دی۔ بکس اٹھا کر دوسرے کونے میں ٹکا دیا۔ شریف اور ابراہیم کے جوتے دونوں ہاتھوں میں لے کر اس کے اندر رکھ دیئے اور اندر آنے لگا۔ وہ ان دونوں کے قریب آیا تو ٹھہر گیا۔

"ڈرو۔ ڈرو۔ اوپر والے سے ڈرو۔ اوپر والا سب کچھ دیکھ رہا ہے۔"

دونوں نے اس کی بات کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ وہ آہستہ آہستہ صحن میں سے گزرتا ہوا مسجد کے آخری حصے میں چلا گیا اور جب باہر آیا تو اس نے پندرہ بیس کے قریب تنکوں کی بنی ہوئی ٹوپیاں اٹھا رکھی تھیں جنہیں وہ ایک ایک کر کے مسجد میں بچھی ہوئی صفوں پر رکھنے لگا۔

"میں تو کہتا ہوں شریف یار خود ہمت کرتے ہیں، ملبہ کھود کر چیزیں نکالتے ہیں، تمہارے گھر میں یا میرے گھر میں پڑی رہیں گی۔ کسی دن تو انصاری آ ہی جائے گا۔" ابراہیم نے کہا۔

شریف نے کوئی جواب نہ دیا، مگر اس کے چہرے کا تاثر بتا رہا تھا کہ اسے یہ تجویز پسند ہے۔ الہ دین نے آخری ٹوپی ایک جگہ رکھی اور سبحان اللہ، سبحان اللہ کہتا ہوا پھر اندر چلا گیا۔

شریف اور ابراہیم نے دوسروں کو اپنے ساتھ ملانے کے لئے کچھ قابل اعتماد لوگوں کو اپنی تجویز بتا دی۔ جس نے یہ تجویز سنی اسی نے تائید کی اور عملی طور پر اس میں حصہ لینے کیلئے تیار ہو گیا ــــ ٹھیکیدار کو بھی اس تجویز کا پتا چل گیا، خان صاحب کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اس سے بہتر موقع نہیں مل سکتا تھا، فوراً خان صاحب کے پاس پہنچا اور کہنے لگا،

"خان صاحب جی! اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ انصاری کے برتن ورتن آپ ہی لے گئے ہیں اور باقی چیزوں کو وہ آپ سے بچانا چاہتے ہیں، اللہ کی لعنت ان پر، آپ کی توہین کرتے ہیں۔"

خان صاحب کے ہونٹ لرزنے لگے۔ وہ جو بات کہنے کی کوشش کر رہے تھے، وہ ٹھیکیدار نے کہہ دی تھی۔

"یہ پھل ہے دس سال کی خدمت کا۔ آپ نے گلی والوں کی اتنی خدمت کی اور آج اس خدمت کا صلہ مل رہا ہے۔"

"یہی خدمت کا پھل ہے۔" خان صاحب بولے۔

ٹھیکیدار، خان صاحب کے اور قریب ہو گیا؛

"پر خان صاحب! ہم نے بھی کوئی چوڑیاں نہیں پہن رکھیں، آئے کون مائی کا لال آتا ہے ملبہ ہٹانے، ہم مر نہیں گئے خان صاحب! مزا چکھا دیں گے۔"

اس روز دوپہر کے وقت شریف ابراہیم، بنا، عنایت اور چھ اور آدمی کدالیں اور بیلچے وغیرہ لئے کھنڈر کی طرف جا رہے تھے۔ گلی کے مکانوں کی کھڑکیوں سے عورتیں انہیں دیکھ رہی تھیں اور وہ بھی بار بار اپنی نگاہیں اوپر اٹھا لیتے تھے۔ انہیں حیرت ہوتی تھی کہ عورتیں مسکرا

کیوں رہتی ہیں۔ اور اس مسکراہٹ کا راز جلد ہی ظاہر ہو گیا۔ انہوں نے دیکھ لیا کہ ملبے کے اوپر ٹھیکیدار اور دس بارہ آدمی ڈانگیں چھڑیاں اور اینٹیں ہاتھوں میں لئے کھڑے ہیں ٹھیکیدار نے انہیں آتے دیکھا تو للکار کر کہا:

"خبردار جو کسی نے ایسی ویسی حرکت کی۔ چلے جاؤ۔ خون خرابہ ہو جائے گا۔"

شریف ابراہیم اور دوسرے لوگوں کو اس حادثے کی قطعاً توقع نہیں تھی۔ وہ حیران ہو گئے۔

"یارو! ہم خون خرابہ کے لئے نہیں آئے" ابراہیم نے بلند آواز سے کہا۔

"پھر کیا کرنے آئے ہو؟" ٹھیکیدار کی آواز گونجی۔

"ٹھیکیدار جی ہم تو ایک نیک کام کرنے آئے ہیں۔ ہم تو ملبہ صاف کرنے آئے ہیں۔ کوئی بیمار پڑتا ہے تو کتنی تکلیف ہوتی ہے۔ اللہ نہ کرے کوئی مر گیا تو —" ٹھیکیدار آگے بڑھا اور کہنے لگا:

"بکواس کرتے ہو، تم نے ہمارے خان صاحب پر جھوٹا الزام لگایا ہے۔ میں کہتا ہوں شرافت اسی میں ہے کہ فوراً چلے جاؤ۔"

ابراہیم اور اس کے ساتھی متذبذب حالت میں کھڑے تھے۔ عنایت آگے بڑھ گیا۔

"ہم واپس نہیں جائیں گے۔ ہم ملبہ اٹھائیں گے — ہم —"

عنایت اوپر چڑھ گیا۔ اس نے ہاتھ میں بیلچہ پکڑ رکھا تھا۔

ٹھیکیدار نے گرج کر کہا:

"دفع ہوتے ہو یا نہیں؟"

"نہیں۔ ملبہ صاف ہو گا۔ آج ہی صاف ہو گا۔"

"اچھا تو لو —" اور ٹھیکیدار نے اپنی ڈانگ گھمائی جو عنایت کے بیلچے کے ساتھ زور سے ٹکرائی۔ بیلچہ اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا پڑا۔

"کھڑے کھڑے ہوا ہو جاؤں گا ذلیل کتے!" ٹھیکیدار نے اس کا گریبان پکڑ لیا۔

شریف کے اندر باپ کی محبت نے جوش مارا اور وہ ابراہیم سے ہاتھ چھڑا کر اوپر جانے لگا۔ عنایت کا چہرہ سُرخ ہو گیا تھا۔ اس کے حلق سے آواز نہیں نکلتی تھی۔

ٹھیکیدار نے شریف کو اوپر آتے دیکھا تو عنایت کو اس کی طرف دھکا دے دیا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا باپ کے پاؤں پر آگرا۔ ابراہیم بھی اوپر جانے لگا تھا۔ مکانوں کی کھڑکیوں سے جو عورتیں جھانک رہی تھیں انہوں نے بے تحاشا چیخنا شروع کر دیا تھا ــ

"خدا کے لئے روکو۔ خدا کے لئے روکو۔"

ان کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔

نیچے وہ لوگ کھڑے تھے جو اس معاملے میں غیر جانبدار تھے اور محض تماشا دیکھنے کے لئے آئے تھے۔ انہوں نے جلدی سے آگے بڑھ کر اوپر جانے والوں کو روک دیا۔ آدھ گھنٹے بعد طرفین کے افراد ایک دوسرے کو خونخوار نظروں سے گھورتے ہوئے واپس جانے لگے۔

ٹھیکیدار جاتے ہوئے چیلنج دے گیا۔

"ایک ایک سے نپٹ لوں گا۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے دایاں ہاتھ اپنے چہرے پر پھیرا۔

ساری گلی کی فضا پر خوف و دہشت کی گہری دھند چھا گئی تھی۔ عورتوں نے مردوں کے اندر آتے ہی دروازے بند کر دیئے تھے اور شام ہوتے ہی سرد تیز و تُند ہوا بھی چلنے لگی تھی۔

تمام رات تیز ہوا کا شور برپا رہا۔

صبح ہونے میں ایک ڈیڑھ گھنٹہ باقی تھا کہ ہوا کی طوفانی کیفیت ختم ہو گئی تھی ــ اور پھر جب مسجد سے صبح کی اذان گونجنے لگی تو سب سے پہلے مسجد میں جانے کے لئے شریف نیچے اترا ــ ساری رات جاگنے کی وجہ سے اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔

مسجد کی طرف جاتے ہوئے یونہی اس کی نظر ملبے پر جا پڑی۔ اس نے دیکھا کہ وہاں کوئی سیاہ سی چیز پڑی تھی۔

"یہ کیا ہے؟"

اس نے اپنے دل سے سوال کیا اور ملبے کی طرف جانے لگا۔

اب ابراہیم بھی نیچے اتر آیا تھا۔

"ابراہیم! وہ کیا ہے؟" اس نے سیاہ چیز کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"کیا ہے؟" ابراہیم نے کہا۔

دونوں ملبے پر پہنچ گئے۔ انہوں نے حیرت زدہ نظروں سے دیکھا کہ ملبہ کھودنے سے ایک وسیع گڑھا پڑ گیا ہے اور اس کے قریب الدین اوندھے منہ گرا ہوا ہے۔ بیلچہ اس کے ہاتھ میں ہے۔

ابراہیم نے جھک کر اسے دو تین بار ہلایا۔ شریف نے اسے ہلایا مگر وہ بے حس و حرکت پڑا تھا۔

لوگ آتے گئے، لاش کو دیکھتے گئے۔

ایک گھنٹہ گزر گیا۔

لاش ہٹالی گئی۔ گلی کے بڑوں اور بچوں نے شام سے پہلے پہلے ملبہ صاف کر دیا اور رات کے پہلے پہر جب الدین کا جنازہ اٹھا تو اس کے پیچھے صرف گلی ہی کے نہیں اردگرد کے علاقوں کے لوگ بھی عقیدت و احترام سے سر جھکائے چلے جا رہے تھے اور جنازہ ایک ہموار راستے سے نکل کر سڑک پر پہنچ گیا۔

ریڑھی

فیروز کو باپ کی موت کے بعد وراثت میں نہ تو کوئی قطعۂ زمین ملا تھا، نہ مکان اور نہ کچھ نقدی۔ صرف ایک چیز ملی تھی اور یہ تھی ایک پرانی ریڑھی جو اس کے باپ کے لئے بھی روٹی کمانے کا واحد آسرا تھی اور اس کے لئے بھی ذریعۂ معاش بن چکی تھی۔

اس نے باپ کو کئی بار تاروں کی چھاؤں میں ریڑھی کو گھر سے باہر لے جاتے ہوئے دیکھا تھا اور بیسیوں مرتبہ یہ بھی دیکھا تھا کہ وہ اس ریڑھی پر طرح طرح کی سبزیاں رکھے چوبان روڈ سے باہر اسلام پورہ کی سڑکوں پر ریڑھی کے ساتھ گھومتا پھر رہا ہے مگر یہ خیال کبھی اس کے ذہن میں نہیں آیا تھا کہ ایک روز وہ بھی اسی طرح سڑکوں اور بازاروں میں سبزیوں سے بھری ہوئی ریڑھی دھکیلنے پر مجبور ہو جائے گا۔

اپنا بچپن اور لڑکپن اس نے چوبان روڈ سے متصل ملت روڈ پر گزارا تھا جہاں ایک گلی میں وہ اپنے باپ اور ماں کے ساتھ رہتا تھا۔ چھٹی جماعت میں اس نے سکول سے اپنا تعلق قطع کر لیا تھا اور یہ واقعہ اس روز ہوا تھا جب اس کے سخت گیر ماسٹر نے سبق یاد نہ کرنے پر اس کی بڑی طرح پٹائی کی تھی اور وہ روتا ہوا زخمی حالت میں گھر پہنچا تھا۔ اس کے بعد سکول کے نام ہی سے اس پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا اور ماں باپ کے بے حد اصرار کے باوجود اس نے سکول کی طرف رُخ نہ پھیرا۔ ماں باپ کیا کرتے۔ ان کا تو جی چاہتا تھا کہ ان کا بیٹا کوئی عزت و آبرو کی نوکری کرے مگر یہ اس کی قسمت ہی میں نہیں تھی۔

باپ نے اُسے ایک کلاتھ مرچنٹ کی دکان پر بٹھا دیا کہ کسی روز اپنے پیروں پر کھڑا ہو

جائے گا لیکن اس کا دل یہاں نہ لگا۔ صبح سے لے کر شام تک ایک جگہ بیٹھے رہنا یا گاہکوں کے سامنے تھان کھول کھول کر قیمت پر بحث کرنا اسے بالکل پسند نہ آیا۔ وہ وہاں ایک مہینہ بھی نہ گزار سکا اور دکان ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر گھر آ گیا۔

باپ نے کئی اور دکانوں پر بھی اسے بھیجا مگر ٹک کر بیٹھنا اس کے بس کا روگ نہ تھا۔ نتیجہ یہ کہ باپ اس سے مایوس ہو گیا اور اُسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

اس کے بعد تین برس کی مدت اس طرح بیتی کہ فیروز کا باپ ریڑھی لے کر تنہا منڈی جاتا کیونکہ اس وقت فیروز سویا ہوتا مگر جب منڈی سے واپس آتا تو بیٹے کو بھی اپنے ہمراہ لے جاتا۔ فیروز ریڑھی کے ساتھ ساتھ چلتا، کسی گھر کے دروازے پر کوئی عورت کوئی ترکاری طلب کرتی تو یہ ڈیوٹی فیروز کی ہوتی کہ وہ ترکاری تلوا کر عورت کے حوالے کرے اور اس سے پیسے وصول کر کے باپ کو لا کر دے!

اس کام سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن باپ بوڑھا ہو گیا تھا۔ ریڑھی کو دھکیلتے رہنا اس کے لئے زیادہ مشکل کام نہیں تھا مگر اپنی سبزیوں کا بار بار اعلان کرنا اور لوگوں کو ان کی تروتازگی سے مطلع کرنا اس کے لئے قدرے دشوار امر ہو گیا تھا۔ یہ فرض بھی فیروز ادا کرتا تھا۔ جیسے ہی ریڑھی گھر کے قریب پہنچتی اور باپ پہلی آواز لگاتا۔ گوبھی۔ مٹر، آلو، تازہ سبزیاں" تو وہ مجبوراً بستر سے نکل کر باہر آ جاتا اور دوسری آواز اس کے حلق سے نکلتی۔

باپ بیٹا گھر میں ناشتہ نہیں کرتے تھے۔ مولا داد کی دکان پر نان سری پائے اڑاتے ـــ بس یہی ایک ایسی شئی تھی جس سے فیروز کو دلچسپی تھی۔

بوڑھا باپ طرح طرح کی بیماریاں پال رہا تھا اور یہی بیماریاں تیزی سے اسے قبر کے قریب لے جا رہی تھیں اور آخر کار لے ہی گئیں۔ ماں بھی چھ ماہ کے بعد دنیا سے چلی گئی۔

باپ کے مرنے پر تو فیروز کی ماں نے ایک ایک پیسہ جوڑ کر جو رقم جمع کی تھی اس سے گزر اوقات ہوتی رہی۔ وہ مر گئی تو فیروز بھری دنیا میں اکیلا رہ گیا۔ ماں جاتے ہوئے اسے ڈیڑھ سو

روپیہ دے گئی تھی، اس میں سے دو ماہ کا کرایہ دینے کے بعد فیروز کی جیب میں چھیانوے روپے بچ گئے تھے۔ دس روز گھر میں بیٹھا تو تیئیس روپے اور خرچ ہو گئے۔ محلے کے بزرگوں نے سمجھایا: نوجے! خرچ کرنے سے تو قارون کا خزانہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔ کچھ کام کاج کر۔ کب تک گھر میں بیٹھا رہے گا؟" یہ معاملہ ہی ایسا تھا کہ فیروز اسے نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔

حاجی غلام جیلانی کا شاندار مکان اس کے گھر کے قریب واقع تھا اور حاجی صاحب کی دو دکانیں تھیں، اور دونوں میں سبزیاں بکتی تھیں۔ فیروز کا باپ جب بھی اپنے کسی گاہک سے سنتا تھا" حاجی جی! ترکاری بہت مہنگی بیچتے ہو" تو وہ بڑی حقارت سے کہتے تھے" میاں صاحب! سستی کھانی ہے تو جلال کی ریڑھی پر جاؤ! یہاں جیسی سبزی ہو گی ویسے دام ہوں گے"

یہ حاجی صاحب ایک روز فیروز سے ملے اور بولے!

" نوجے! باپ کی طرح ریڑھی چلائے گا یا بھلے مانسوں کی طرح میری دکان پر کام کرے گا؟"

حاجی صاحب نے گویا اس کے مرحوم باپ کو بھلے مانسوں کی فہرست سے خارج کر دیا تھا۔ اس نے باپ کی توہین محسوس کی مگر یہ زہر چپکے سے پی گیا اور ادب سے بولا۔

" حاجی جی! مہربانی"

حاجی صاحب سر ہلاتے ہوئے چلے گئے۔

وہ گھر آیا تو اپنی چارپائی پر گر پڑا۔ اس کے سر میں درد تھا۔ تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد درد میں افاقہ ہوا تو اس نے اٹھ کر گھڑے میں سے گلاس بھر کر پانی پیا۔ گلاس گھڑے پر رکھ رہا تھا کہ اس کی نظر ریڑھی پر پڑی جو اس کے باپ کی چارپائی کے قریب پڑی تھی۔

اس کا باپ اپنی ریڑھی سے بہت پیار کرتا تھا۔ گھر کے اندر رکھنے میں گھر والوں کو چلنے پھرنے میں کافی دقت ہوتی تھی اور فیروز کی ماں نے کئی بار اس کے باپ سے بھی اصرار کیا تھا۔

نوجے کے ابا! اسے باہر رکھا کرو۔ اندھیرے میں ٹھوکر کھا کر گر پڑتی ہوں۔ کوئی چور نہیں

لے جائے گا۔"

فیروز کے باپ کو یہ ڈر نہیں تھا کہ ریڑھی کو کوئی چرا کر لے جائے گا لیکن ایک تو اسے بارش سے خراب ہو جانے کا خدشہ تھا اور دوسرا ڈر یہ بھی تھا کہ محلے کے بچے اس کے اوپر چڑھ کر اودھم مچائیں گے اور اس کا ستیاناس کر دیں گے۔ اس لئے وہ بیوی کی بات ماننے کے لئے تیار نہیں تھا اور نہ ہی کبھی تیار ہوا۔

یہ ریڑھی اس کے باپ نے اپنی جوانی کے عالم میں خریدی تھی اور چونکہ اسے بہت حفاظت اور احتیاط سے رکھا تھا۔۔۔ اور دو تین بار رنگ روغن بھی کر دیا تھا۔۔۔ وہ پرانی دکھائی نہیں دیتی تھی بلکہ لگتا تھا کہ صرف تین ماہ پہلے بنوائی گئی ہے۔

وہ کئی لمحے ٹکٹکی باندھ کر ریڑھی کو دیکھتا رہا۔ اس کے سامنے اس کے مرحوم باپ کی شکل ابھرنے لگی۔ وہ بڑھاپے میں کتنی دقت سے ریڑھی دھکیل دھکیل کر آگے لے جاتا تھا اور جب کسی کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھتا تھا تو فوراً رک جاتا تھا۔ پھر اس کے ذہن میں وہ الفاظ بھی گونجنے لگے جو وہ ریڑھی کے ساتھ چلتے ہوئے بلند آواز میں کہتا تھا "گوبھی، آلو، مٹر، تازہ سبزیاں" یہ آواز سن کر اردگرد کے گھروں کے دروازے کھلنے لگتے تھے اور ان دروازوں پر عورتیں اور بچے ٹوکریاں اٹھائے آ جاتے تھے۔ اس وقت اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ بازار میں سے گزر رہا ہے اور گھروں کے دروازے کھل رہے ہیں۔

وہ چارپائی سے اٹھ بیٹھا۔ ریڑھی کے پاس گیا اور بغیر ارادے کے اس پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ شفاف لکڑی کے لمس سے اس کے اندر ایک ایسی کیفیت پیدا ہو گئی جیسے وہ لکڑی ایک جاندار وجود ہو جو سوالیہ نظروں سے اسے مسلسل دیکھ رہا ہو۔!

اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ساری نقدی نکال کر ریڑھی پر ڈھیر کر دی۔ مایوسی کے عالم میں اس کے چہرے پر سیاہ سائے سے منڈلانے لگے۔ وہ ریڑھی سے الگ ہو کر گھر کی واحد الماری کے قریب چلا گیا وہ کبھی کبھی دیکھا کرتا کہ اس کی ماں اس الماری کے سب سے نچلے

خانے میں کپڑوں کے نیچے سے ایک میلا کچیلا رومال نکالا کرتی اور اس کی گانٹھ کھول کر ایک روپیہ نکال کر اسے دے دیتی اور پھر گانٹھ باندھ کر رومال کو وہیں رکھ دیتی جہاں سے اسے نکالا گیا تھا۔

یہ روپیہ وہ اپنے شوہر سے چوری بیٹے کو اپنی مرضی کے مطابق خرچ کرنے کے لئے دیا کرتی تھی۔ ہلال کو اپنی بیوی کی یہ حرکت پسند نہیں تھی۔ وہ کہا کرتا تھا" عیشاں! یہ فضول خرچی ہے تمہارا لال کماتا خاک نہیں اور تم اسے پورا ایک روپیہ دے دیتی ہو مگر عیشاں بیٹے کو ناامید نہیں کرتی تھی۔

فیروز نے الماری کھولی۔ ماں کی وفات کے بعد اس نے کئی بار کپڑے نکالنے کے لئے یہ الماری کھولی تھی لیکن رومال کی طرف کبھی اس کا خیال نہیں گیا تھا۔ اس نے نیم دروا کی حالت میں سب سے نچلے خانے کے کپڑوں میں ہاتھ ڈالا اور دوسرے ہی لمحے میں وہی میلا کچیلا رومال اس کے ہاتھ میں تھا۔

رومال میں گانٹھ دیکھ کر اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ بے صبری سے اس نے گانٹھ کھولی۔ چند نوٹ نظر آنے لگے۔ یہ نوٹ گن کر اس نے نقدی کے اوپر رکھ دیئے اور رومال اپنی جیب میں ڈال لیا۔ ان نوٹوں نے نقدی میں چالیس روپے کا اضافہ کر دیا تھا۔

" اماں تم کتنی اچھی تھیں "

اس کے یہ الفاظ دل کی گہرائیوں سے نکلے تھے اور اسے اچانک یہ سوچ کر پشیمانی ہوئی کہ اس نے اپنی ماں کو کوئی سکھ نہیں دیا تھا۔

دوسرے روز علی الصبح جب ٹھیکیدار علی احمد کے مرغے نے بانگ دی تو اس کی آنکھ کھل گئی۔

اس صبح اس نے اپنے باپ کی طرح سارے کام کئے۔ پہلے ایک کپڑے سے ریڑھی کو صاف کیا، پھر کپڑا گیلا کر کے اس پر پھیرا۔ دروازے کے دونوں پٹ کھولے۔ ریڑھی کو باہر لے آیا

اور دروازے کو مقفل کر دیا۔

جب اس کے ماں باپ زندہ تھے تو جس وقت اس کا باپ ریڑھی کو دروازے سے باہر نکالتا تھا۔ تو اس کی ماں ضرور دروازے پر آجاتی تھی اور تین چار مرتبہ "رب خیر کریں" کہتی تھی اور اس وقت تک دروازے پر کھڑی رہتی تھی جب تک اس کا شوہر گلی کے آخر تک نہیں پہنچ جاتا تھا۔ اب کوئی "رب خیر کریں" کہنے والا نہیں تھا۔ دکھ کی ایک لہر اس کے سارے جسم میں سرایت کر گئی۔

مولا داد کی دکان میں سٹول پر بیٹھ کر جب اس نے گرم نان کا لقمہ توڑ کر شوربے میں ڈالا تو اسے تنہائی کا ایسا احساس ہوا کہ وہ کئی لمحے لقمہ منہ تک نہ لے جا سکا۔

گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد وہ زور لگا کر بازاروں میں ریڑھی دھکیل رہا تھا سبزی منڈی سے پوری رقم خرچ کر کے وہ جتنی ترکاریاں خرید کر لایا تھا ان سے ریڑھی اس طرح بھری نہیں تھی جس طرح اس کے باپ کے زمانے میں بھر جایا کرتی تھی۔

بازاروں سے گزرتے وقت اس کے کانوں میں عجیب عجیب آوازیں آرہی تھیں۔

"اللہ تیری شان ـــــ واہ وا آ گیا باپ کے راستے پر ـــــ سبحان اللہ کاؤ بیٹا آیا ہے۔

ٹھیکیدار علی احمد نے اسے دیکھا تو دھوپ کی وجہ سے آنکھوں پر ہاتھوں کا سایہ کر کے بولا۔

"پھنس گئے بیٹا! پیٹ بڑی بلا ہے"

باپ کی زندگی میں جب ریڑھی کسی بازار میں سے گذرتی تھی تو ادو گرد کے گھروں کے دروازے کھلنے لگتے تھے مگر اب شاذو نادر ہی کوئی دروازہ کھلتا تھا۔

ایک بجے کے قریب اس کی ریڑھی پر صرف چند خراب آلوؤں کے سوا اور کچھ نہ رہا تھا اور وہ خوش تھا ـــــ!

اس کے گھر سے کچھ فاصلے پر اماں شاداں کا تنور تھا۔ ماں کے مرنے کے بعد وہ اس تنور سے روٹی کھایا کرتا تھا۔

تنور کے پاس آکر اس نے ریڑھی اللہ جوایا کے مکان کی دیوار کے ساتھ کھڑی کردی اور اپنے کرتے کی دونوں بھری ہوئی جیبوں کے ساتھ اس پھٹے پرانے بوریے کی طرف قدم اٹھانے لگا جس پر مزدور اور غریب غربا بیٹھ کر پیٹ بھرا کرتے تھے۔

پیٹ بھرکر وہ ریڑھی لے کر گھر کے آگے جا رُکا۔ جیب سے چابی نکالی ـــ دروازہ کھولا اور آہستہ آہستہ ریڑھی کو اندر لے گیا۔

گھڑے سے ٹھنڈے پانی کا گلاس بھر کر ایک ہی سانس میں پی گیا اور باری باری دونوں جیبیں ریڑھی پر خالی کردیں۔ رقم گنی تو انتیس روپے چار آنے کا منافع ہوا تھا۔ باپ کے زمانے میں منفع اصل رقم سے بھی بڑھ جاتا تھا تاہم وہ خوش تھا۔

اس کے محلہ والوں کو یقین تھا کہ یہ تماشا زیادہ سے زیادہ ایک ماہ تک رہے گا لیکن وہ یہ دیکھ کر مایوس ہوتے جا رہے تھے کہ فیرد نے باپ کی جگہ لے لی تھی اور وہ باپ کی سی مستعدی کے ساتھ کام کر رہا تھا اس کی ماں کا پرانا رومال جواب اس کی جیب سے نکل کر الماری کے سب سے نچلے خانے میں کپڑے کے نیچے چھپا رہتا تھا۔ اس میں ایک کی بجائے چار گانٹھیں پڑ چکی تھیں۔ ان گانٹھوں کے اندر نوٹ تھے سکے وہ الگ کانسی کے ایک ایسے برتن میں ڈالتا جاتا تھا جو ماں کی چارپائی کے قریب ایک طاقچے میں اس مقصد کے لئے رکھا رہتا تھا۔

پانچ مہینے گزرنے پر اس کی وہی حالت ہوگئی جو اس کے باپ کی تھی ـــ اب منڈی میں ترکاریاں لے کر بازاروں میں سے گزرتا تھا تو مکانوں کی کھڑکیوں اور دروازوں پر عورتوں اور بچوں کے چہرے نظر آنے لگے تھے اور بارہ بجے تک ساری ریڑھی خالی ہو جاتی تھی۔ گھر واپس جاتا تھا تو ایک ان جانی اُداسی اس کے دل و دماغ پر چھا جاتی تھی۔ تنور سے پیٹ بھرنے کے بعد وہ کبھی غفورے کی دکان پر جا بیٹھتا تھا اور کبھی نصیر حلوائی کی دکان کے پاس اس بنچ پر جو گاہکوں کے لئے مخصوص تھا، نیم دراز ہو جاتا تھا۔ شام تک اسی طرح وقت

بتا کر وہ پھر تنور سے روٹی کھانے کے بعد گھر آکر چارپائی پر لیٹ جاتا تھا اور گھنٹے آدھ گھنٹے تک کروٹیں بدلنے کے بعد سو جاتا تھا۔

دن پر دن بیت رہے تھے اور اس کی الماری کے سب سے نچلے خانے میں کپڑوں کے نیچے نوٹ ہی نوٹ بکھرے پڑے تھے یہ ان نوٹوں کے علاوہ تھے جو رومال کے چاروں کونوں میں بندھے ہوئے تھے۔

اس روز غفورے کی دکان پر کوئی گاہک نہیں تھا اور فیروز اس کے قریب سٹول پر بیٹھا تھا۔ غفورے نے معنی خیز نظروں سے اسے دیکھا اور خود بخود مسکرانے لگا۔

فیروز اس کی مسکراہٹ کا مطلب نہ سمجھ سکا۔ بولا ۔۔۔!

"کیوں غفورے! بات کیا ہے؟"

غفورا کہنے لگا۔

"یار! پیسہ ویسہ ٹھیک ہے نا اپنے پاس؟"

"کیا پیسہ ویسہ؟ ہاں اللہ کا فضل ہے۔"

"تنوروں کی روٹیاں کھاتے کھاتے بے زار نہیں ہو گئے ۔۔۔؟ میں تو دس روپے بھی نہیں کماتا تھا جب میری شادی ہو گئی تھی ۔۔۔ کہو تو کچھ کروں؟"

"کیا کرو گے؟" فیروز نے ہنس کر پوچھا۔

"یہ بات ہم پر چھوڑ دو۔"

اور دوسرے روز مائی حمیداں اس کے گھر میں بیٹھی تھی اور وہ جانتا تھا کہ مائی کا کام رشتے کروانا ہے اور غفورے نے اسے اس کے گھر بھیجا ہے۔

حمیداں نے باتوں باتوں میں سمجھ لیا تھا کہ آسامی اچھی ہے۔ کسی غریب گھرانے کی لڑکی اس کے گھر آکر اپنے ماں باپ کی محتاج نہیں رہے گی۔ تھوڑی دیر بعد اٹھتے ہوئے بولی۔

"بس ٹھیک ہے۔ ڈھونڈتی ہوں، اللہ نے چاہا تو ہیرے جیسی لڑکی لاؤں گی تمہارے لئے۔"

اب ذرا منہ میٹھا کرا دے۔"

وہ سمجھ گیا تھا کہ حمیداں کچھ مانگ رہی ہے۔ مگر وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ کتنے روپے مناسب رہیں گے۔ حمیداں نے اس کا چہرہ دیکھ کر بھانپ لیا کہ کیا سوچ رہا ہے۔

"پندرہ بیس تو دے دے نا۔"

اس نے ایک لفظ کہے بغیر جیب سے بیس روپے نکالے اور حمیداں کے حوالے کر دیئے اور وہ دعائیں دیتی ہوئی چلی گئی۔

چوتھے دن ہی وہ آ گئی۔

"خوجے! ایسی لڑکی ڈھونڈی ہے کہ سارے شہر میں نہیں ہو گی۔ شریف ماں کی شریف بیٹی خوبصورت، نماز روزے کی پابند، سگھڑ، گھریلو۔"

فیروز خوش ہو گیا۔

"پر اماں ہے کون؟"

"بتا دوں؟"

"بتاؤ گی کیوں نہیں؟"

حمیداں نے کاغذ کی پڑیا کھول کر پان منہ میں ڈالا اور انگلیوں سے وہ سرخ سرخ لکیریں پونچھنے لگی جو اس کے ہونٹوں سے نکل کر ٹھوڑی کی طرف نکل گئی تھیں ــــ فیروز بے تابی سے اس کی یہ کارروائی دیکھ رہا تھا۔

"اماں بتاؤ نا؟"

"بے صبرے نہ بنو ــــ بتاتی ہوں ــــ وہ اپنا اکبر علی ہے نا۔"

"وہ جس کی چھوٹی سی دکان لڑکیوں کے سکول کے پاس ہے؟"

حمیداں کو یہ بات بری لگی۔ اس کے ماتھے پر تیوریاں پڑ گئیں۔

"چھوٹی دکان ہے تو کیا ہوا ــــ پندرہ بیس روپے روز کما لیتا ہے۔ تمہاری اپنی ذات کا ہے۔

مکان اپنا ہے ۔۔۔ جہیز بھی دے گا۔۔۔ بولو ہاں کر دوں تمہاری طرف سے ؟"

فیروز اپنی پیشانی پر دائیں ہاتھ کی انگلی پھیرنے لگا۔"

"اماں! سوچ کر بتاؤں گا۔"

"کل دوپہر آؤں گی!"

حمیداں چلی گئی تو وہ اس لڑکی کے متعلق سوچنے لگا۔ اسے یاد آ گیا کہ دو تین مرتبہ وہ سانولے رنگ کی ایک لمبے قد و قامت کی لڑکی کو اکبر علی کے گھر کے دروازے پر دیکھ چکا تھا وہ ریڑھی تک نہیں آئی تھی، وہیں سے سبزی کا نام لیا تھا۔ اور فیروز یہ سبزی تول کر خود اس کے پاس گیا تھا اور جتنے پیسے مانگے تھے وہ اس نے فوراً اسے دے دیئے تھے۔ بھاؤ پر کوئی تکرار نہیں کی تھی۔ کئی بار سونے سے پہلے فیروز نے اس لڑکی کے بارے میں سوچا تھا۔ کتنی شرمیلی ہے آنکھ اٹھا کر بھی میری طرف نہیں دیکھا تھا۔ جو بھاؤ بتایا ان گنے پیسے کم کرنے کے لئے کوئی بات نہیں کی۔ یہ لڑکی میری بیوی بن جائے گی تو ٹھیک رہے گا۔

فیروز کو یہ خیال کچھ عجیب لگا اور فوراً اس سے دل پر مایوسی چھا گئی: "اکبر علی کو یہ رشتہ منظور نہ ہوا تو ؟" اضطراب کے عالم میں وہ بستر پر بار بار کروٹیں لینے لگا۔

صبح منڈی سے سودا لے کر وہ جب اکبر علی کے مکان کے سامنے پہنچا تو اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ وہ پہلے کی طرح بلند آواز میں نہ کہہ سکا "کریلے، ٹینڈے، آلو، تازہ سبزیاں" گاہکوں کو ان کی پسند کی ترکاریاں دیتے وقت رہ رہ کر کنکھیوں سے اکبر علی کے دروازے کو بھی دیکھ لیتا تھا۔ کئی منٹ گزر گئے اور دروازہ نہ کھلا۔

ریڑھی کے پاس کوئی گاہک نہیں تھا۔ اس کے ذہن میں بے اختیار یہ آرزو ابھر آئی کہ وہ آجائے تو کتنا اچھا ہو۔ پہلے اسے کبھی اچھی طرح نہیں دیکھ سکا تھا۔ آج دیکھ لوں گا۔ اسے خود اپنی حرکت کا علم نہ ہو سکا اور اس کی ریڑھی اکبر علی کے دروازے سے ڈیڑھ دو گز کے فاصلے پر پہنچ گئی تھی۔ اس نے آواز لگائی۔ کوئی جواب نہ ملا۔

وہ ڈر بھی رہا تھا کہ کوئی اسے دیکھ نہ رہا ہو۔

پھر دروازہ ذرا سا کھلا۔ اس میں سے ایک ہاتھ نکلا اور نفی میں لہرا کر غائب ہو گیا وہ پھر ریڑھی کو دھکیل کر آگے لے گیا۔

اس رات وہ ہاتھ بار بار اس کے چہرے کے قریب لہراتا تھا۔ اس کی آنکھوں پر سایہ ڈال دیتا تھا۔ ایک موج نشاط بن کر اس کے دل کو چھو جاتا تھا۔

صرف بیس دن میں سب کچھ ہو گیا۔ اکبر علی اور اس کی بیوی اپنی صغریٰ کی بڑھتی عمر دیکھ کر ایک خوف کے زیر اثر اس بات کا انتظار ہی کر رہے تھے کہ کوئی ان کی لڑکی کا رشتہ مانگے اور وہ فوراً ہاں کہہ دیں۔

خاموش خاموش نظروں والی اور شرم کے مارے اپنے ہی وجود میں گم ہو جانے والی صغریٰ اس کی بیوی بن گئی۔ اس کے آنے پر فیروز نے محسوس کیا کہ اب اس کے گھر میں دھیرے رونق - اداسی اور افسردگی نہیں رہی جس کا احساس کچھ مدت سے ہر روز سونے سے پہلے اس کے رگ و پے میں اتر جاتا تھا صغریٰ نے گھر کا سارا انتظام سنبھال لیا تھا شادی کی پہلی رات کے بعد جو صبح طلوع ہوئی فیروز نے ریڑھی کی ہتھی پر ہاتھ رکھنے سے پہلے الماری کھول کر اس کے نچلے خانے میں کپڑوں کے نیچے جتنے نوٹ بکھرے پڑے تھے سب اس کے حوالے کر دیئے تھے۔!

"تم جانو اور تمہارا کام"

فیروز کو یقین تھا کہ یہ دولت دیکھ کر اس کی بیوی بہت خوش ہو جائے گی۔ مسکرا اٹھے گی فرطِ مسرت میں اس سے لپٹ جائے گی۔ مگر ایسی کوئی بات نہ ہوئی۔۔۔!

نوٹوں پر ایک نظر ڈالنے کے بعد اس کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی تو اس نے صرف یہ پوچھا۔

"کتنا!" ظاہر ہے اس کا مطلب تھا یہ سارا کتنا روپیہ ہے۔

"میں نے کبھی گنا نہیں؟"

یہ جواب سن کر صغریٰ حیرت سے اسے دیکھنے لگی ــــ !

"میں نے کبھی تالا نہیں لگایا تھا ــــ لے آؤں!"

صغریٰ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

فیروز نے ریڑھی گھر سے نکالی اور دروازے پر رُک کر بولا۔

"سمجھو تو نہ جاؤں"

صغریٰ نے نہیں میں سر ہلایا تھا یا ہاں میں، وہ سمجھ نہ سکا اور منڈی جاتے وقت یہ سوال کئی بار اس کے ذہن میں جاگ اٹھا تھا۔

منڈی سے سودا لے کر جب وہ مولاداد کی دکان کے سامنے آیا تو اسے ناشتے کا خیال آگیا مولاداد نے ہاتھ بڑھا کر وہ سٹول اپنے قریب کھسکا لیا جس پر فیروز بیٹھ کر ناشتہ کیا کرتا تھا۔ لیکن اب تو وہ تنہا نہیں تھا۔ گھر میں ایک اور ہستی بھی اس کا انتظار کر رہی تھی۔

اس نے مولاداد سے برتن لے کر اسے سالن سے بھروا لیا، چار گرم گرم نان اپنی بغل کے نیچے دبائے اور گھر کی طرف جانے لگا۔

دروازہ بند تھا۔

دروازے پر دستک دینے کی بجائے اس نے آواز لگائی "کریلے، ٹینڈے، آلو، تازہ سبزیاں"

دروازہ بند رہا۔ دو منٹ کے بعد ایک پٹ ذرا سا کھلا اور اس میں سے ایک ہاتھ نکل کر لہرا گیا۔

فیروز کو یہ ادا اتنی پسند آئی کہ اس نے فوراً دروازے میں سے گزر کر دیوار سے لگی صغریٰ کو اپنے سینے سے لگا لیا اور اس بات کا بھی خیال نہ کیا کہ نان اس کی بغل سے نکل کر نیچے گر پڑے ہیں۔

"یہ کیا ہوا" وہ بولی۔ اور اس نے نان اٹھا لئے۔

"سالن ادھر ہے" اور فیروز ریڑھی پر سے برتن اٹھا کر لے آیا۔

"یہ کیوں؟ کیا گھر میں کھانے کی چیزیں باہر سے آئیں گی!"

"ٹھیک ہے اب جیسا کہو گی ۔۔۔ اب تو تمہارا راج ہے۔" فیروز مسکرا دیا۔

فیروز کی زندگی میں بڑی باقاعدگی آ گئی تھی۔ صغریٰ کوئی کام اسے بے قاعدگی سے کرنے نہیں دیتی تھی۔ وقت پر ناشتہ، وقت پر دوپہر کا کھانا اور وقت پر ہی رات کا کھانا۔ شادی کے بعد اسے ایسی راحت ملنے لگی تھی جس کا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ گرمیوں میں وہ کمرے ہی میں سوتے تھے۔ صغریٰ جب تک جاگتی رہتی تھی۔ اسے پنکھا جھلتا رہتی تھی۔

گھر میں بجلی نہیں لگی تھی جس کا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ صغریٰ نے پیسے جمع کر کے وائرنگ کروائی اور کمرے کے اندر شام ہی سے بجلی کا بلب روشن ہونے لگا، بجلی کا پنکھا بھی آ گیا۔ گرمیاں بیت گئیں، سردیوں کا آغاز ہو گیا صغریٰ ہر کام بڑی تیزی سے کیا کرتی تھی۔ مگر اب وہ سست سست نظر آتی تھی۔ فیروز کو اس بات پر حیرت ہوتی تھی۔ وہ بیوی سے پوچھتا تھا تم بیمار ہو گیا؟

"نہیں" وہ منہ پھیر کر جواب دیتی

"پھر سست کیوں ہو گئی ہو؟"

"یہ ایک راز ہے۔"

اور یہ راز چند ماہ تک ہی راز رہ سکا۔ گھر میں ایک مہمان آ گیا تھا۔ . . . یہ مہمان ایک خوبصورت، پیاری سی بچی تھی جس کا نام فیروز نے زینت اور صغریٰ نے نازیہ، رکھ دیا تھا۔ صغریٰ کا رکھا ہوا نام زیادہ سراہا گیا اس لئے فیروز نے بھی یہی نام قبول کر لیا۔

فیروز کی گھر سے باہر کوئی حیثیت نہیں تھی۔ مگر گھر میں اس کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ وہ ایک کنبے کا سربراہ تھا اور کما کر گھر کے سارے اخراجات پورے کرتا تھا۔

یہ کنبہ بظاہر تین افراد پر مشتمل تھا لیکن اس میں ایک اور فرد بھی تھا۔ تین افراد تو جاندار تھے، فیروز صغریٰ اور نازیہ اور یہ فرد بے جان تھا اور رڈھی کی صورت میں تھا جب تک فیروز کی ماں زندہ تھی وہ اپنے شوہر سے یہی کہتی رہی کہ اس کم بخت کو دروازے سے باہر رکھا

کیونکہ فیروز کے باپ نے اس کی یہ بات کبھی نہیں مانی تھی اور اب صغریٰ کو اصرار تھا کہ ریڑھی کو باہر رہنا چاہیئے اس نے آدھا کرہ گھیر رکھا ہے اور اپنے باپ کی طرح فیروز بھی اس کے لئے کبھی آمادہ نہیں ہو سکا تھا۔

فیروز کو اپنی ریڑھی سے بڑی محبت تھی، جمعہ کے روز چھٹی کر کے وہ اسے دھوتا تھا اور پرانے اخبارات ہٹا کر اپنے پڑوسی بابو احمد دین کے گھر سے نئے اخبارات لاکر اس پر پھیلا دیتا تھا۔

نازی ساڑھے تین سال کی ہو گئی تھی۔ وہ ریڑھی کے اوپر بیٹھ کر اپنی گڑیوں کے ساتھ کھیلا کرتی تھی اور وہیں بیٹھ کر ناشتہ بھی کرتی تھی۔ روٹی بھی کھاتی تھی۔ باپ کے منع کرنے کے باوجود اس سے نیچے نہیں اترتی تھی۔

اور وہ جمعہ کی صبح تھی، جب نازیہ بڑی جلدی جاگ کر ریڑھی پر جا بیٹھی تھی۔ گرمیوں کے دن تھے، صبح کے وقت ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔

فیروز نماز پڑھ کر آیا تو اس نے بیٹی کو ریڑھی کے اوپر بیٹھے ہوئے دیکھا۔ تو کہنے لگا۔

"سیر کرو گی؟"

نازیہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

فیروز ریڑھی کو باہر لے جانے لگا۔

نازیہ پہلے تو چند لمحے ڈر کے مارے چیخی اور پھر ہنسنے لگی۔

فیروز نے اس دن نازیہ کو کافی دیر تک سیر کرائی اور جب گھر واپس آ کر وہ ریڑھی سے نیچے اتری تو بہت خوش تھی۔

"اگلے جمعہ تمہیں بھی لے جائیں گے۔" یہ فقرہ فیروز نے صغریٰ سے کہا تھا۔

"ریڑھی پر؟" صغریٰ نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"ہاں"

"پاگل تو نہیں ہو گئے؟"

اگلے جمعہ کی صبح کو جب سورج کے طلوع ہونے میں کم از کم ایک گھنٹہ باقی تھا، فیروز نے زبردستی صغریٰ کو ریڑھی پر بٹھا لیا ۔۔۔ نازی تو خود بخود ہنستی ہوئی بیٹھ گئی تھی۔

ریڑھی گھر کے دروازے سے ذرا دور گئی تو صغریٰ کا شرم کے مارے برا حال ہو گیا۔ وہ بار بار کہتی تھی "ہائے اللہ اوئی اللہ میں مر گئی۔"

"چیختی کیوں ہو۔ ادھر اُدھر کرتی ہے؟" فیروز نے غصے سے کہا۔

صغریٰ شرم سے اپنے آپ میں ڈوبی جا رہی تھی اس کے برعکس نازی بہت خوش تھی قہقہے لگا رہی تھی۔ تالیاں بجا رہی تھی۔

آدھ گھنٹے کے بعد ریڑھی واپس دروازے پہ آ گئی۔ صغریٰ چھلانگ لگا کر اندر چلی گئی۔

"بڑے بے شرم ہو۔ یہ کونی طریقہ ہے؟"

فیروز نے بیوی کے یہ الفاظ سن کر چند لمحے اسے گھور کر دیکھا۔

صغریٰ! ہمارے پاس موٹر نہیں ہے ۔۔۔ تانگہ بھی نہیں۔ یہی ہمارے لئے موٹر اور تانگہ ہے۔

صغریٰ نے اسے پلٹ کر دیکھا۔ نہ جانے اس کے شوہر کے چہرے پر کسی پراسرار جذبے نے اپنے گہرے رنگ پھیلا دیئے تھے کہ وہ چپ چاپ ان بکھرے ہوئے رنگوں کو دیکھتی رہی اور یہاں تک اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کی پلکیں آنسوؤں سے بوجھل ہو گئی ہیں۔

"تم رو رہی ہو صغریٰ؟"

"نہیں ۔۔۔ نہیں" اور صغریٰ اپنے دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھنے لگی۔

فیروز ہر جمعے کو صبح سویرے تیار ہو کر بیوی کے سرہانے کھڑے ہو کر زور سے کہتا۔

"موٹر سیر کے لئے تیار ہے میم صاحب!"

صغریٰ پہلو بدل کر چادر اپنے پورے جسم پر پھیلا دیتی اور چہرہ بھی ڈھانپ لیتی۔ نازیہ جو

ماں کے ساتھ ہی سوتی تھی' اچھا ابا' کہہ کر چارپائی سے اٹھ بیٹھتی۔

"نازی! تم تو تیار ہو مگر تمہاری ماں، دیکھو کیا کر رہی ہے" فیروز نے صغریٰ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔!

نازی ماں کے چہرے سے چادر ہٹانے کی کوشش کرنے لگی۔

"اٹھو نا امی موٹر میں بیٹھ کر سیر نہیں کرنی!"

"دفع دور، یہ موٹر ہے!"

فیروز اس پر ایک لفظ بھی نہ کہتا۔ خاموش کھڑا رہتا۔ صغریٰ چہرے سے چادر ہٹا کر اپنے شوہر کو دیکھتی اور کئی لمحے دیکھتی رہتی پھر نہ جانے اس کے دل میں کیا خیال آتا کہ آہستہ آہستہ چادر الگ کرنے لگتی اور شکایت آمیز لہجے میں کہتی۔

"تم تماشا دکھاؤ گے لوگوں کو"

"تماشا کیسا یہ اپنی موٹر ہے" فیروز ہنس پڑتا۔

چار پانچ بار ریڑھی پر بیٹھ کر سیر کرنے کے بعد صغریٰ کی پہلی سی جھجک دور ہو گئی تاہم وہ شوہر کے اصرار پر ہی ریڑھی پر بیٹھتی تھی۔

گرمیاں ختم ہو گئیں تو سیر کا پروگرام بھی ختم ہو گیا۔

اس روز فیروز بارہ بجے گھر آیا۔ اور اس نے اپنے معمول کے مطابق گوبھی آلو، مٹر تازہ ترکاریاں کی آواز لگائی تو نازی دروازے پر نہ آئی۔ باپ کی آواز سن کر وہ ضرور گھر سے باہر آجاتی تھی۔ فیروز کو بیٹی کی شکل دکھائی نہ دی تو اس نے زیرِ لب کہا' اللہ خیر' صبح جب وہ منڈی کی طرف جانے لگا تھا تو اس کی بیوی نے بتایا تھا' نازو کو سردی لگ گئی ہے' بازاروں میں سے گزرتے وقت اسے بیٹی کا خیال نہ آیا مگر اب اسے نہ دیکھ کر وہ فکرمند ہو گیا۔

کمرے کے اندر جا کر اس نے دیکھا کہ نازی چارپائی پر لیٹی ہوئی ہے۔ اور اس کی ماں پاس بیٹھ کر اس کا سر دبا رہی ہے۔

"قے پر قے کر رہی ہے۔" صغریٰ نے شوہر کو آتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

"ڈاکٹر کو دکھایا؟"

"نہیں ــــ جائے پلائی ہے۔"

فیروز بیٹی پر جھک گیا۔

"نازو بیٹی! کیا ہے؟"

"پتہ نہیں ــــ ابا"

"بارہ بج چکے ہیں۔ ڈاکٹر بارہ ساڑھے بارہ بجے تک رہتے ہیں ــــ لے جاتا ہوں۔"

فیروز نے نازیہ کو گود میں اٹھایا اور قریبی ڈاکٹر کے کلینک کی طرف جانے لگا۔

ڈاکٹر نے نسخہ لکھتے ہوئے کہا۔

"اسے نمونیہ ہو گیا ہے۔ بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔"

فیروز کے دل کو ایک دھچکا سا لگا۔ اسے یاد آ گیا کہ مولاداد کے بیٹے کو بھی نمونیہ ہو گیا تھا اور وہ مر گیا تھا۔

اس نے نازیہ کو دونوں بازوؤں میں بھینچ کر سینے سے لگا رکھا تھا۔ ایک ہاتھ میں دوا تھی اور دوسرے ہاتھ میں غبارہ جو اس نے کلینک سے باہر نکل کر خریدا تھا ــــ!

تین دن اور تین راتیں میاں بیوی نازیہ کے قریب بیٹھے رہے ــــ اور چوتھے روز وہ چپ چاپ چلی گئی۔

نازیہ کے چلے جانے کا صغریٰ کو بڑا صدمہ پہنچا مگر اس نے ضبط سے کام لیا۔ آہستہ آہستہ وہ گھر کے کاموں میں معروف رہنے لگی۔ فیروز چار دن تک منڈی نہ جا سکا۔ پانچویں روز صغریٰ نے مجبور کر کے اسے بھیج دیا۔

تین ماہ گزر گئے۔

صغریٰ گھر کے کاموں میں برابر دلچسپی لیتی رہتی تھی۔ وہ کوئی کام بھی بے قاعدگی سے نہیں کرتی

تھی مگر فیروز محسوس کر رہا تھا کہ وہ سب کچھ کرتے ہوئے بھی چپ چپ سی رہتی ہے۔ اس سے بہتیرا پوچھتا "صغریٰ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ کیا تکلیف ہے تمہیں"۔ صغریٰ ہر بار یہی کہتی تھی "میں بالکل ٹھیک ہوں"۔ "تمہیں وہم ہو گیا ہے میں بالکل ٹھیک ہوں"۔

ایک دن وہ بیوی کو مجبور کر کے ڈاکٹر کے ہاں لے گیا۔ ڈاکٹر نے سٹیتھسکوپ لگا کر اس کا معائنہ کیا اور کہا ــــ!

"فیروز اسے ہسپتال میں لے جاؤ"۔

"کیوں ڈاکٹر صاحب!"

"کہہ جو دیا ہے لے جاؤ" یہ کہہ کر ڈاکٹر صاحب دوسرے مریض کی طرف متوجہ ہو گئے۔

راستے میں میاں بیوی خاموش رہے۔ گھر پہنچ کر جب فیروز نے صغریٰ کو تانگے سے اتارا اور سہارا دے کر اندر لایا تو وہ بولی۔

"میں ہسپتال نہیں جاؤں گی"۔

"ڈاکٹر نے کہا ہے۔ کیوں نہیں جاؤ گی"؟

"کہتا ہے تو کہتا رہے۔ مرنا ہے تو گھر میں مروں گی۔ ہسپتال میں نہیں رُلوں گی"۔

اور صغریٰ گھر ہی میں مری۔ جمعرات کی صبح کو اس کا باپ ایک مقامی ڈاکٹر کو گھر لایا جس نے تاکید کی کہ اسے فوراً ہسپتال میں لے جاؤ۔۔۔ جب اس کا شوہر اور میکے والے لوگ اسے ہسپتال لے جانے کی تیاری کر رہے تھے تو فیروز نے جھک کر اسے دیکھا اور سینے پر دو ہتڑ مار کر ہائے کہتا ہوا بے بسی میں دائیں طرف کرسی پر گر پڑا اور اس کے ساتھ گھر میں کہرام برپا ہو گیا۔

اب اسے گھر خالی خالی لگتا تھا، اداس دیواریں ہر طرف بے رونقی، کہیں کوئی چہرہ نہیں، کوئی آواز نہیں۔ سات سال کی ازدواجی زندگی اسے ایک سپنا محسوس ہوتی تھی۔ اس مدت کا خیال کرتا تھا تو اسے ایسا احساس ہوتا تھا جیسے ایک بہت بھاری سل اس کے سینے پر آ پڑی ہو جس سے اس کا سانس رکنے لگا ہے۔

وہ اپنی چارپائی پر پڑے، پڑے چھت کو گھورتا رہتا تھا ـــــ دیواروں کو گھورتا رہتا تھا۔ محلے کا کوئی موبا عورت آتی تو چند لقمے اس کے حلق سے نیچے اتر جاتے ورنہ بھوکا پیاسا بیٹھا رہتا یا لیٹا رہتا پڑوسی، دوست ملنے جلنے والے تسلی دیتے اس پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ اس کا دل ڈوبتا چلا گیا بجھی بجھی آنکھیں اور بجھ گئیں۔

اتوار کی صبح اس کا انسپکٹر سخت اصرار کر کے اسے اپنے گھر لے گیا اس کا ارادہ تھا کہ اسے چند روز اپنے یہاں ٹھہرائے لیکن فیروز پورا ایک دن بھی وہاں نہ گزار سکا۔ شام ہونے میں ابھی ایک گھنٹہ باقی تھا کہ وہ بھاگا اپنے گھر کی طرف اور دروازے پر پہنچتے ہی جیسے کسی نے اس کے قدم روک لئے دروازے سے چند فٹ کے فاصلے پر اس کی ریڑھی کھڑی تھی جسے صغریٰ کی موت پر آنے والوں نے کمرے میں بیٹھنے کی گنجائش نکالنے کے لئے باہر دھکیل دیا تھا۔

اُسے لگا جیسے ریڑھی خاموش زبان میں اسے بلا رہی ہے۔ اسے اپنے پاس آنے کے لئے کہہ رہی ہے۔

وہ آگے بڑھا اور بے اختیار اپنے دونوں ہاتھ اس کی ہتھی پر رکھ دیئے۔ اس کا سر جھکنے لگا۔ جھکتا چلا گیا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ کر ہتھی کے نیچے ٹپ ٹپ گرنے لگے۔

یکایک دو ننھے ننھے ہاتھ اس کی گردن میں حائل ہو گئے ـــــ اچانک اس کے کانوں میں "ہائے میرے اللہ" کے الفاظ گونجنے لگے۔

اس کے سارے جسم میں ایک نرمی سی، ایک حرارت سی پھیلتی چلی گئی، اس نے اپنی آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھیں ہتھی سے لگا دیں جیسے آنکھوں سے اسے چوم رہا ہو اس نے اس طرح ہاتھ بڑھا رکھے تھے جیسے ریڑھی کو اپنی گود میں لے چکا ہو۔ جیسے وہ ایک زندہ وجود ہو جس کے سانسوں میں اس کی نازیہ، اس کی صغریٰ کے سانسوں کی گرمی بھر گئی ہو اور یہ سانس اس کے چہرے کو اس کی رگ رگ کو چھو رہے ہوں۔

وہ سب سے بے خبر یونہی کھڑا رہا۔ اسی حالت میں کھڑا رہا۔

لمحے گزرتے گئے۔ اندھیرا بڑھتا گیا اور پھر محلے میں کوئی شخص بھی یہ نہ دیکھ سکا کہ وہ کب ریڑھی سے الگ ہو کر اندر گیا تھا مگر صبح کے وقت سب حیرت سے دیکھ رہے تھے کہ وہ پہلے کی طرح ریڑھی کی ہتھی تھامے اس راستے پر چلا جا رہا ہے جو سبزی منڈی کو جاتا ہے۔

عنایت بی بی کا افضال

یہ ایک عجیب اتفاق تھا کہ گلزار انصاری اور استاد فیروز دونوں ایک ہی شام کو ایک ایک بیٹے کے باپ بن گئے۔ انصاری صاحب شہر کے مشہور و معروف چھاپہ خانہ انصاری پریس کے مالک تھے اور استاد فیروز جو ان کے شاندار بنگلے کے قریب ہی رہتا تھا، انصاری پریس میں جلد سازی کا کام کرتا تھا۔

جس شام انصاری صاحب کے بنگلے میں ان کے پہلوٹھی کے بچے نے پہلا سانس لیا ہر طرف خوشی کے شادیانے بجنے لگے۔ بنگلے کے در و دیوار رنگا رنگ روشنیوں کے سیلاب میں ڈوب گئے۔ رات کے دو تین بجے تک مبارک باد دینے والوں کا تانتا بندھا رہا۔ انصاری صاحب نے اپنے ہاں ہر اس ہنگامہ مسرت کا اہتمام کیا جس پر ان کو قدرت حاصل تھی۔ دوسری طرف استاد فیروز کے معمولی سے مکان میں یہ ہوا کہ آدھی رات تک روشنی رہی اور ہمسایوں کی بیویاں استاد کی بیوی عنایت بی بی کے پاس آکر بچے کو دیکھ کر اور منہ میٹھا کر کے زچہ و بچہ کو ڈھیر ساری دعائیں دے کر رخصت ہوتی رہیں۔

ڈیڑھ بجا ہوگا جب عنایت بی بی نے سر سے پٹی اتاری اور اسے اپنے تکیے کے نیچے رکھ دیا اور جب سوئے ہوئے بچے پر نظر ڈالی تو اس کے دل میں ایک ایسا جذبۂ غرور لہرا اٹھا جو صرف ایک ماں ہی کے لئے مخصوص ہے یہ جذبۂ غرور جیسے دل کی گہرائیوں سے نکل کر اس کی رگ رگ میں سرایت کر گیا اور جب اس نے کھڑکی میں سے انصاری صاحب کی جگمگاتی ہوئی کوٹھی کو دیکھا، تو اسکے باوجود کہ اس کی آنکھیں چندھیا گئیں، اس کے جذبے میں کوئی کمی نہ آئی۔

عنایت بی بی ہر روز کسی نہ کسی ہمسائی کی زبانی یہ خبر سن لیتی کہ کل انصاری صاحب نے اپنے دوستوں کی بڑی شاندار ضیافت کی ہے اور آج ان کے فلاں فلاں رشتہ دار بچے کے لئے طرح طرح کے خوبصورت کپڑے لے کر آئے ہیں۔ ایک روز اس نے یہ بھی سنا کہ بچہ ابھی ایک ماہ کا بھی نہیں ہوا کہ پریس کے منیجر نے درجنوں کھلونے اس کے لئے بھیج دیئے ہیں۔ وہ ایسی خبریں سن کر صرف مسکرا دیتی، گویا اس کے نزدیک ان کی کوئی اہمیت ہی نہ ہو۔ ایسا تو ہوتا ہی رہتا ہے ــــ وہ دل میں کہتی اور اپنے افضال کو بے اختیار سینے سے لگا کر بھینچ لیتی اور اس کی پیشانی پر کئی بوسے ثبت کر دیتی۔ کبھی اسے اپنی اس محرومی کا احساس ضرور ہوتا کہ نہ تو میکے میں اس کا کوئی بزرگ ہے نہ سسرال میں۔ وہ ایک یتیم لڑکی تھی۔ جب اس کی شادی ہوئی۔ اس کے سسر اور ساس کا بھی انتقال ہو گیا تھا۔

گھر کا کام کاج کرنے کے لئے اس نے اپنی چھوٹی بہن سکینہ کو اپنے یہاں بلوا لیا ــــ سکینہ نے سارا انتظام سنبھال لیا ــــ وقت پر بچے کو بازاری دودھ بھی پلاتی ــــ اس کے پوتڑے بھی صاف کرتی رہتی۔ کھانا دانا بھی تیار کر لیتی صبح سے لے کر شام تک گھر میں بیٹھے رہنا اس کے لئے ممکن نہیں تھا ادھر کام سے فارغ ہوئی اور ادھر یہ جا وہ جا۔ کبھی بغیر ضرورت کے بازار میں کوئی چیز خریدنے چلی جاتی اور کبھی یونہی کسی ہمسائے کے گھر میں پہنچ جاتی۔ اور تو اور انصاری صاحب کی کوٹھی میں بھی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ گزار آتی۔

اس دوپہر کو عنایت بی بی کے افضال کی طبیعت قدرے ناساز تھی۔ بہن سے کہا:

"سکینہ! افضال رو رہا ہے۔ گود میں اٹھا کر بہلا، چپ ہو جائے گا۔"

سکینہ نے بچے کو گود میں اٹھا لیا اور باہر دالان میں آ گئی۔ کچھ دیر تو بچہ روتا رہا۔ پھر خاموش ہو گیا۔ عنایت بی بی چارپائی پر بیٹھ کر اس کا کرتا سیتی رہی۔

سکینہ اندر آ گئی۔

"آپا! میری بانہیں ٹوٹ گئی ہیں ــــ اتنا بھاری ہے تیرا لال!"

عنایت بی بی کی پیشانی پر ناگواری کے عالم میں شکنیں پڑ گئیں۔ فوراً بولی:

"دفع دور ـــــ کالی زبان والی ـــــ"

سکینہ منہ لبور کر بولی:

"اور کیا ہے ؟" وہ کچھ اور کہنے والی تھی کہ بہن کے تیور دیکھ کر ڈر گئی اور بات پلٹا کر کہنے لگی:

" آپا ! ماشاء اللہ بڑا ہی پیارا ہے ـــــ" اور کھکھلا کر ہنس پڑی۔

عنایت بی بی کا موڈ ذرا خراب ہو گیا تھا۔ اس نے بہن کی گود سے اپنا بچہ لے لیا اور اسے چارپائی پر لٹا دیا۔

"آپا! اس کے لئے پنگوڑا کیوں نہیں منگوا لیتیں ؟"

عنایت بی بی نے بات سمجھ کر بھی ایسا چہرہ بنایا جیسے وہ کچھ سمجھ ہی نہ سکی ہو۔

"پنگوڑا آپا ! پنگوڑا ـــ وہ جس میں بچہ لیٹتا ہے۔"

اس کی آپا اثبات میں سر ہلانے لگی۔

"آپا، کیا بتاؤں۔ آج میں انصاری صاحب کے گھر گئی تھی۔ وہاں پنگوڑا پڑا تھا۔ ہائے آپا میں کیا کہوں ! ایسا تو میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا ہو گا۔ وہ جو اماں ہے نا باجی ثریا کی ساس، وہ کہنے لگی ـــــ یہ پنگوڑا کسی باہر کے ملک سے آیا ہے۔"

عنایت بی بی نے منہ سے ایک لفظ تک نہ کہا۔ ٹکٹکی باندھ کر بہن کا چہرہ دیکھتی رہی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ایک خبر نے اس کے ذہن میں ایک لکیر سی ڈالی تھی۔

شام کے وقت فیروز گھر آیا۔ اس وقت عنایت بی بی بچے کی آنکھوں میں کاجل ڈال رہی تھی اور وہ بری طرح چلا رہا تھا۔ فیروز نے بچہ گود میں اٹھا لیا۔ بولا:

"بس بس، شہزادے! چپ ہو جا۔"

عنایت بی بی نے شوہر کو کنکھیوں سے دیکھا۔

"میں نے کہا جھوٹ موٹ کا شہزادہ ہے نا!"

"کیوں، جھوٹ موٹ کا کیوں ہوگا؟ سچ مچ کا ہے!"

"جانے دو جی! جھوٹ نہ بولو۔ شہزادے کے لیے ایک پنگوڑا بھی نہیں لا سکتے۔" عنایت بی بی نے شکایتاً کہا۔

فیروز نے بہلو میں کبوتری کو دیکھ کر غٹرغوں کرتے ہوئے کبوتر کی طرح سینہ پھیلاتے ہوئے اور انفال کو ماں کی گود میں دیتے ہوئے کہا:

"پنگوڑا کیا میں تو اپنے شہزادے کے لئے تخت لے آؤں گا۔ دیکھو تو سہی!"

یہ فقرہ سن کر عنایت بی بی کے دل میں ایک مبہم سا خوف پیدا ہو گیا۔ شاید یہ خوف اس وجہ سے تھا کہ کہیں اس کا شوہر آدھی تنخواہ خرچ کر کے پنگوڑا ہی نہ خرید لائے۔ احتیاطاً کہنے لگی:

"پنگوڑے بلال گنج کی پرانی دکانوں پر ملتے ہیں۔"

فیروز نے کچھ سوچتے ہوئے چٹکی بجا کر سگریٹ کی راکھ جھاڑی معمول کے مطابق دونوں ہونٹ بند کر کے تھوک نگلا اور سر ہلاتا گھر سے نکل گیا۔

دوسرے روز پریس سے واپس آیا تو بیوی نے پوچھا۔

"اتنی دیر سے کیوں آئے؟"

"تم نے جو کہہ دیا تھا شہزادے کے لئے پنگوڑا لاؤ۔"

سکینہ نے جب یہ الفاظ سنے، اس وقت وہ نلکے کے نیچے کپڑے دھو رہی تھی۔ صابن اس کے ہاتھوں کو لگا تھا۔۔۔ وہ اسی حالت میں اٹھ کر آ گئی۔ اُسے توقع تھی کہ پنگوڑا کمرے کے اندر ہوگا، مگر وہاں تو کچھ بھی نہ تھا۔

"پنگوڑا کہاں ہے بھائی جان؟" اس نے ادھر اُدھر نظریں دوڑاتے ہوئے پوچھا۔

فیروز نے دوسری مرتبہ تھوک نگلا اور دائیں ہاتھ میں جو ایک پوٹلی سی پکڑے ہوئے تھا اسے کھولنے لگا۔ وہ کھل گئی، تو چارپائی کے اوپر نصف درجن کے قریب پلاسٹک کے بنے ہوئے طرح

طرح کے کھلونے بکھر گئے۔ سکینہ کی آنکھیں ایک طنزیہ مسکراہٹ سے چمکنے لگیں۔ اس سے پہلے کہ عنایت بی بی یا سکینہ کچھ کہے فیروز بولا :

"پرانا پنگوڑا بھی پچیس سے کم نہیں ملتا۔"

"پھر یہ کیا اٹھا لائے ہو ؟" عنایت بی بی کے لہجے میں تلخی تھی۔

"کھلونے ہیں کھلونے۔ سوا چھ روپے خرچ کئے ہیں۔" فیروز نے یہ الفاظ ایسے لہجے میں کہے جو اس کے اندرونی جذبۂ تفاخر کی غمازی کر رہا تھا۔

عنایت بی بی بچے کو چھوڑ کر چارپائی کے نیچے پڑے ہوئے گندے برتن اکٹھے کرنے لگی، مگر سکینہ کو صبر کہاں : کہنے لگی :

"بھائی جان ! پنگوڑا لے آتے نا !"

"کہاں سے لے آتا ؟"

"انصاری صاحب لائے ہیں نا !"

فیروز نے سگریٹ کا لمبا کش لیا اور ایک لمحے کے لئے اپنی سالی کی طرف اس انداز سے دیکھا جیسے وہ اس کی دماغی صحت کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔ کہنے لگا :

"سکینہ ! جانتی ہو انصاری صاحب کی آمدنی کیا ہے ؟ کل ہی ایک بینک سے پچاس ہزار کا ٹھیکہ ہوا ہے۔ وہ تو دو ہزار کا پنگوڑا بھی خرید سکتا ہے۔ ہم اس کی ریس کر سکتے ہیں ؟"

عنایت بی بی جس نے سارے برتن جمع کر لئے تھے اور اب اٹھا کر باہر لے جانے والی تھی، اپنے اندر غم و غصے کی ایک شدید لہر سے بے تاب ہو گئی۔ اسے کسی نہ کسی طرح اس کیفیت کا اظہار کر کے اپنی گھٹن کو دور کرنا تھی، بولی :

"سکینہ ! گھر کا کام نظر نہیں آتا ؟"

سکینہ کی نظر صابن لگے ہاتھوں پر پڑی تو اسے یاد آ گیا کہ غسل خانے کے اوپر بہت سارے کپڑے اس کا انتظار کر رہے ہیں۔ وہ بڑبڑاتی ہوئی باہر چلی گئی۔ کمرے میں اب فیروز تنہا انصال کے

پاس رہ گیا۔ اس نے کھلونے اکٹھے کئے اور یہ کہتے ہوئے بچے کے چہرے کے پاس رکھ دیئے:

"لے شہزادے عیش کر!"

سکینہ بی بی کو جو دروازے کے پاس کھڑی تھی اس منظر کو دیکھتے ہی نہ جانے کیا ہوا کہ وہ دوپٹے کے پلو سے اپنی آنکھیں پونچھنے لگی۔

ماہ رمضان کا آغاز ہوا، اس کے ساتھ ہی عید کا تصور ذہنوں میں ہلچل مچانے لگا۔ عنایت بی بی نے پہلے ہی دن روزے کی افطاری سے پہلے اپنے شوہر سے کہہ دیا:

"کچھ پتا ہے؟"

فیروز کو خوب معلوم تھا کہ اس کی بیوی کی ان الفاظ سے کیا مراد تھی، مگر وہ انجان بن کر پوچھنے لگا:

"پتا کس کا؟"

"بڑے بھولے بنتے ہو۔ عید نہیں آرہی؟"

فیروز نے حسب معمول دانتوں کو زور سے بند کر کے تھوک نگلا اور آہستگی سے کہا:

"عید تو ہر سال آتی ہے۔ اس برس بھی آجائے گی۔"

اور اس سے پیشتر کہ گفتگو میں کسی قسم کی گرماگرمی پیدا ہو، وہ یہ کہہ کر باہر نکل گیا۔

"افطاری یونس کے ہاں ہوگی۔" یونس اس کے ساتھ چھاپے خانے میں مشین مین تھا۔

ایسے موقعے پر سکینہ کے لئے چپ رہنا ممکن نہیں تھا۔ وہ اس وقت پیاز چھیل رہی تھی اور اس کی آنکھوں اور ناک سے پانی نکل آیا تھا۔

"آپا! پتا ہے وہاں کتنے جوڑے آچکے ہیں؟"

وہاں سے اس کی مراد انصاری صاحب کا بنگلہ ہوتا تھا۔

عنایت بی بی کو بہن کی یہ مداخلت پسند نہ تھی، لیکن وہ خاموش رہتی اور اس کی باتیں سنتی تھی۔

"آپا! خدا جھوٹ نہ بلائے، دو سوٹ کیس بھر گئے ہیں اس کے کپڑوں سے اور ابھی نہ جانے

کتنے اور جوڑے گھر میں آئیں گے۔ آپا!"

عنایت بی بی نے چہرے پر نظر ڈالی۔ ایک اندرونی اضطراب اور خلش سے اس کے چہرے پر تشنج کے اثرات پھیل گئے۔

"ہمارا افضال، انصاری صاحب کے شاہد جیسا نہیں؟"

سکینہ نے یہ سوال پوچھ کر اپنی ذہنی کشمکش سے نجات پالی۔ مگر بہن کو ایک ٹھیس بھی دیدی۔

"کیا مطلب ہے تیرا؟" عنایت بی بی نے یہ سوال اس انداز سے پوچھا جیسے اس میں اس کا اپنا ارادہ شامل نہیں ہے۔

"آپا! ہمارا افضال، شاہد جیسا ہی تو ہے، بلکہ اس کا رنگ اُس سے گورا ہے"

عنایت بی بی نے اپنا ہاتھ غصے سے ہلا دیا۔ سکینہ آنکھیں ملتی ہوئی پرے جا بیٹھی

اس رات اس نے بچے کو دودھ پلاتے ہوئے سوچا: "آخر میرے بچے اور ان کے بچے میں فرق کیا ہے؟ فرق یہی ہے نا کہ وہ انصاری صاحب کا بچہ ہے جو پریس کا مالک ہے اور ہمارا بچہ استاد فیروز کا بیٹا ہے جو ایک جلد ساز ہے۔ بس اور فرق کیا ہے؟"

صبح اُٹھ کر جب وہ شوہر کو کام پر بھیج رہی تھی، اس نے تاکید کی:

"کوئی اور کام کر دے ڈھیر سارے پیسے لا۔ افضال کے لئے کپڑے خریدنے ہیں۔"

فیروز نے اس کے جواب میں صرف ایک لمحے کے لئے بیوی کو دیکھا اور اپنی پرانی سائیکل صحن سے باہر نکالنے لگا۔

عید کی آمد میں تین روز باقی تھے۔ سکینہ ہر تیسرے چوتھے روز انصاری صاحب کے بنگلے پر ہو کر آتی — اور واپس گھر آکر بہن کو بتاتی:

"آپا۔ آج شاہد کا دادا بہت ساری چیزیں لے کر آیا تھا۔ آج اس کی ماں خود تانگے کے لئے انارکلی گئی تھی اور شاہد کے لئے بڑے ہی خوب صورت کپڑے خرید کر لائی تھی۔"

عنایت بی بی کے دل سے ایک دھواں سا اٹھتا اور اس کی آنکھوں کے راستے آنسوؤں

ہیں منتقل ہوکر بہہ جاتا۔

اس شام فیروز ایک گٹھڑی سی اٹھائے گھر میں آیا۔

"لو، لے آیا ہوں . . . . " وہ گٹھڑی ہاتھ میں بلند کرتے ہوئے بولا۔

عنایت بی بی نے جو ہانڈی میں ڈوئی پھیر رہی تھی، جلدی سے دوپٹے سے ہاتھ پونچھا اور شوہر کے پاس آکھڑی ہوئی۔

فیروز چارپائی پر بیٹھ چکا تھا۔ سکینہ بھی کوئی کام بیچ میں چھوڑ کر فوراً آگئی۔

"بھائی جان کیا لائے ہیں؟ افضال کے لئے کپڑے ہیں نا؟" اس نے بے تابی سے پوچھا۔

فیروز نے گٹھڑی کھولی اور اس میں سے کیا نکلا؟ دو شرٹیں اور دو نیکریں۔ دونوں بہت معمولی، گھٹیا معیار کی اور صاف ظاہر ہے بہت کم قیمت پر خریدی گئی ہیں۔

مایوسی سے دونوں کے چہرے لٹک گئے۔

فیروز نے ان کی اس کیفیت کو فوراً بھانپ لیا۔ غصے کی ایک تیز و تند لہر اس کے دل سے اٹھی مگر اچانک اسے بھی خیال آگیا کہ آخر وہ اپنے بچے کے لئے لایا کیا ہے۔ اور غصے کی لہر اس کے چہرے پر اثر انداز نہ ہو سکی۔ دو تین لمحوں کے لئے اس کی آنکھوں میں سرخی نمودار ہوئی اور پھر ٹھنڈی پڑ گئی۔

عنایت بی بی اپنی جگہ پر بجھی بجھی سی تھی اور فیروز اپنی جگہ پر۔ سکینہ کی زبان وقتاً فوقتاً چلتی رہتی تھی۔ وہ اپنی آپا کے ذہن میں یہ یقین بٹھانے کی کوشش کر رہی تھی کہ افضال کے ابا کو اپنے بیٹے کا کچھ زیادہ خیال نہیں ہے۔ ایسے موقعے پر تو غریب سے غریب باپ بھی ادھار لے کر اپنے بچے کے لئے قیمتی کپڑے بنوا لیتا ہے، وہ کیوں نہیں بنوا لیتے۔

عید آگئی۔ فیروز کے گھر میں بھی عام دنوں کے مقابلے میں زیادہ رونق محسوس ہوتی تھی۔ فیروز عید کے لئے ضروری چیزیں لا چکا تھا۔ باورچی خانے میں سویاں بھی پلیٹوں میں ڈالی جا رہی تھیں اور پلاؤ کی چنی کے لئے کچھ گوشت بھی ہانڈی میں پک رہا تھا۔ تاہم ایک افسردگی تھی جو سب کی

آنکھوں میں بار بار جھلک اٹھتی اور ایک بیزاری کا احساس تھا جو انہیں عین مصروفیت کے عالم میں بھی کام کرنے سے روک دیتا اور وہ کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھنے لگتے۔

عنایت بی بی باورچی خانے سے باہر آئی، تو اس نے دیکھا کہ افضال کا باپ جو بچے کے لئے تین روز پیشتر کپڑے لایا تھا، وہ ایک پیڑھی کے اوپر پڑے ہیں، چارپائی پر افضال بھی دکھائی نہیں دیتا اور سکینہ بھی غائب ہے۔

اس نے خیال کیا کہ وہ بچے کو کپڑے پہنا رہی ہوگی، کیونکہ اس قسم کے کام اسی کے سپرد تھے مگر وہ بچے کو پہنا کیا رہی ہے، اس کے نئے کپڑے تو پیڑھی کے اوپر بکھرے ہوئے ہیں۔

"سکینہ!" اس نے آواز دی۔

کوئی جواب نہ ملا۔ اس نے دوسری مرتبہ پکارا۔ دوسرے کمرے سے سکینہ کی آواز آئی،

"جی آپا!"

"کیا کر رہی ہو؟" بہن نے پوچھا۔ "اور افضال کہاں ہے ——؟"

"کچھ کر رہی ہوں آپا۔ افضال میرے پاس ہے۔"

عنایت بی بی نے چاہا کہ کمرے کے اندر جائے لیکن جب اس نے دروازے میں قدم رکھا، تو معلوم ہوا دروازہ اندر سے بند ہے۔

"یہ کیا مصیبت ہے!" عنایت بی بی کو بڑا غصہ آیا۔ اس نے چیخ کر اس غصے کا اظہار کیا،

"دروازہ کیوں بند ہے؟ تو کیا رہا ہے؟ سکینہ کی بچی! دروازہ کیوں نہیں کھولتی؟"

سکینہ نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔

عنایت بی بی نے پہلے دروازے پر دستک دی، پھر اس پر زور زور سے ہاتھ مارے۔

"چڑیل! تو اندر کر کیا رہی ہے؟ کھول دروازہ! کھولتی ہے یا ۔ ۔ ۔؟" اس نے ایک خوفناک دھمکی دی۔ "دروازہ توڑ دوں گی!"

"کھولتی ہوں آپا! ٹھہر جاؤ۔ بس ابھی کھول دیتی ہوں۔"

"میں پوچھتی ہوں اندر ہو کیا رہا ہے ——؟" فرطِ خفگی سے عنایت بی بی کی آواز کانپ سی رہی تھی۔
کمرے کے اندر کھڑکھڑاہٹ ہوئی —— اور دروازہ کھل گیا۔

"آیا! تمہارا شہزادہ۔ دیکھو، آج ہے نا شہزادہ!"

عنایت بی بی نے سکینہ کی گود میں افضال کو دیکھا جو پہچانا ہی نہیں جاتا تھا۔ نہایت خوبصورت قیمتی اور رنگین لباس میں ملبوس تھا۔

عنایت بی بی سراپا استعجاب بن گئی۔

"آیا! ہے نا سچ مچ کا شہزادہ!"

"پر ——" عنایت بی بی اور کچھ نہ کہہ سکی۔

"اُدھر سے آئے ہیں —— انصاری صاحب کی بیگم نے ہمارے افضال کے لئے بھیجے ہیں کتنے اچھے لوگ ہیں آپا!"

اور سکینہ نے افضال کا منہ چوم لیا۔

عنایت بی بی اپنے بچّے کو دیکھ رہی تھی۔

"لو آپا شہزادے کو!"

عنایت بی بی نے ہاتھ بڑھا دیئے —— بچّے کو گود میں اٹھا لیا —— لگتا تھا بچّہ ابھی اس کی گود سے پھسل پڑے گا۔ اس نے اسے مضبوطی سے پکڑنے کی کوشش کی —— وہ اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہی تھی اور اس کے سامنے سکینہ تالیاں بجا بجا کر ناچ سی رہی تھی۔

"آپا چومونا اپنے شہزادے کو!"

عنایت بی بی نے بچّے کو ذرا اوپر اٹھایا۔ اس کے ہونٹ اس کی پیشانی کو چھونے لگے، مگر یک لخت اس نے ہونٹ بچّے کے ماتھے سے ہٹا لئے —— اسے یکایک ایک عجیب سا احساس ہونے لگا۔

"یہ افضال —— اس کا افضال نہیں —— اس کا اپنا افضال نہیں —— یہ بہت قیمتی کپڑے پہنے

ہو نے کون ہے ؟ کیا میرا اپنا ہی انفضال ہے ؟ نہیں نہیں، یہ تو۔ ۔ ۔"

اس کے بازوؤں کی گرفت مضبوط ہو گئی۔

وہ بچے کو گھور گھور کر دیکھتی رہی ۔۔ کئی لمحے دیکھتی رہی پھر سکینہ سے بلند اور تحکم آمیز لہجے میں بولی :

" سکینہ ! اُتار دو یہ کپڑے، پہناؤ وہ کپڑے " اس نے پیڑھی پر پڑے ہوئے کپڑوں کی طرف اشارہ کیا۔

سکینہ ایک دم سناٹے میں آ گئی ۔۔ اس نے بہن کی طرف دیکھا جو پوری سنجیدگی سے بچے کو اس کی طرف بڑھا رہی تھی ۔

درویش

وہ جب اس بستی میں داخل ہوا تو بھوک پیاس سے نڈھال اور تھکاوٹ سے چُور چُور ہو چکا تھا۔ ایک قدم اٹھانا بھی اس کے لئے دوبھر تھا۔ آج ہی وہ چار سال کی قید کاٹ کر جیل سے رہا ہوا تھا۔ گھر بار کوئی تھا نہیں اپنے تینوں دوستوں کی تلاش میں مارا مارا پھرتا رہا تھا۔ اس کو یہ تینوں دوست کہیں بھی نہیں ملے تھے۔ شاید قید کاٹ رہے تھے یا یہ محسوس کر کے کہ شہر میں کافی بدنام ہو چکے ہیں قسمت آزمائی کے لئے کہیں اور چلے گئے تھے۔

شام ہو چکی تھی۔ یہ بستی کا بیرونی اور قدرے غیر آباد حصّہ تھا کیونکہ یہاں لوگ بہت کم آتے جاتے تھے۔ گھروں سے روشنیاں پھوٹ رہی تھیں، دھواں نکل رہا تھا۔ کسی گھر تک پہنچنا اس کے لئے ایک دشوار امر تھا وہ تو چاہتا تھا کہ وہیں زمین پر لیٹ جائے۔ بھوک پیاس کی شدّت کا بھی خیال اس کے ذہن میں دب چکا تھا۔ اس نے ایک درخت کے تنے پر اپنا دایاں ہاتھ رکھا ہوا تھا اور اس کے نیچے لیٹنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ چند گز کے فاصلے پر اسے ایک عمارت کی دھندلی سی دیوار نظر آئی۔ وہ یہ سوچ کر اس کی طرف بڑھا کہ اس کے دروازے پر دستک دے گا۔ خود کو ایک تھکا ہارا مسافر بتائے گا۔ اور پیٹ بھرنے کے لئے روٹی اور رات گزارنے کے لئے تھوڑی سی جگہ کے لئے درخواست کرے گا۔ اس نے بارہا سنا تھا کہ قصبوں اور بستیوں کے لوگ مسافروں کے ساتھ بڑا اچھا سلوک کرتے ہیں اس لئے اس سے بھی اچھا سلوک کیا جائے گا

بڑی مشکل سے اس نے چند قدم اٹھائے۔ وہاں پہنچا۔ مگر یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ دیوار تو

کھڑی ہے مگر اس میں دروازہ کوئی نہیں۔ دو دیواروں کے درمیان ایک عام دروازے جتنا خلا ضرور تھا۔ جو شاید دروازے کا کام دیتا ہو گا۔ اگر کوئی اور وقت ہوتا تو وہ آگے بڑھ جاتا کسی اور عمارت کے دروازے پر جا کر دستک دیتا مگر اس وقت تو وہ اس قدر خستہ حال ہو چکا تھا کہ آگے چلنا اس کے لئے بہت مشکل تھا۔

وہ اندر چلا گیا۔ زمین پر درختوں کے ڈھیروں پتے پڑے تھے کئی درخت اس عمارت کے اردگرد کھڑے تھے۔ تیز ہواؤں سے انہی کے پتے وہاں جا گرے تھے۔ یہ کافی کشادہ جگہ تھی۔ اس سے ملحق جو جگہ تھی وہ ذرا اونچی تھی اور اس کے اوپر چھت پڑ چکی تھی۔

" یہ غیر مکمل عمارت کیا ہے۔ اسے اس حالت میں کیوں چھوڑ دیا گیا ہے ؟" اس کے دماغ میں ایک سوال ابھرا لیکن اس پر غور کرنے کی اس میں سکت نہیں تھی وہ چھت کے نیچے لیٹ گیا۔ ابھی چھت پوری نہیں پڑی تھی۔ آخری کڑی اور دیوار کے درمیان کم از کم ایک گز کا فاصلہ نظر آ رہا تھا۔ اس خالی جگہ میں سے نویں یا دسویں کے چاند کی روشنی چھن چھن کر اندر آ رہی تھی۔ موسم گرمیوں کے اختتام اور سردیوں کے آغاز کا تھا۔ آدمی بغیر چادر یا کمبل کے بھی سو سکتا تھا۔

لیٹنے کو تو وہ لیٹ گیا تھا مگر نیند اس کی آنکھوں سے دور تھی اسے یقین تھا کہ جیسے ہی وہ لیٹے گا گہری نیند سو جائے گا لیکن اتنی تھکاوٹ کے باوجود وہ کروٹ پر کروٹ بدل رہا تھا اور آنکھیں بدستور کھلی تھیں۔

ایسی حالت میں انسان لامحالہ کچھ سوچنے لگتا ہے۔ خاص کر اپنی زندگی کے گزرے ہوئے واقعات اور وہ بھی ماضی کے دھندلکوں میں ڈوبے اپنے اس زمانے میں چلا گیا جب وہ امرتسر کے ایک محلہ بازار بکرواناں میں پاؤں پاؤں چلتا تھا۔ باپ ایک معمولی دوکاندار تھا۔ جو کچھ کماتا تھا۔ اس سے گھر کی بنیادی ضرورتیں ہی پوری ہوتی تھی۔ نصیر ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا اس لئے نازونعم میں پرورش پا رہا تھا۔ ابھی اس کی عمر پانچ سال کی ہوئی تھی کہ پاکستان قائم ہو گیا۔ اس کے ماں باپ نہ جانے کتنے خطروں سے گزر کر اسے لاہور کے بھاٹی دروازے کے اندر لے آئے

جہاں ان کا ایک رشتہ دار پچھلے چالیس برس سے مقیم تھا۔ اس رشتہ دار نے انہیں رہنے کے لئے اپنے وسیع مکان کے نچلے دو کمرے دے دیئے۔ انہیں سہارا تو مل گیا تھا لیکن گھر کا خرچ چلانے کے لئے تو انہیں خود ہی انتظام کرنا تھا۔ نصیر کا باپ صرف دوکانداری جانتا تھا۔ لیکن یہاں اسے کوئی دوکان نہ مل سکی ناچار ایک پریس میں ملازم ہو گیا۔

افراتفری کا زمانہ تھا۔ کسی کو کسی کی پروا نہیں تھی۔ نصیر کا باپ صبح جاتا تھا اور سورج ڈھلے واپس آتا تھا۔ آتے ہی کچھ کھا پی کر سو جاتا تھا اور صبح تک اسے کچھ ہوش نہیں رہتا تھا۔ نصیر جب امرتسر میں تھا تو کسی مدرسے میں داخل نہیں ہوا تھا۔ لاہور آیا تو اگرچہ اس کی عمر اتنی ہو چکی تھی کہ کسی مدرسے میں داخل ہو جائے لیکن اسکے ماں باپ کی ساری سرگرمیاں صرف روٹی کپڑا مہیا کرنے تک محدود ہو چکی تھیں اس لئے نصیر کو محلے میں سارا دن کھیلنے کی آزادی تھی۔ باپ آتا تھا تو اسے کان سے پکڑ کر گھر کے اندر لے آتا تھا اور وہ بھی اس حالت میں کہ اس کے کپڑے گردآلود اور ہاتھوں اور چہرے پر مٹی کی تہیں جم چکی ہوتی تھیں۔

کھیل کا چسکا نصیر کو اس قدر لگ چکا تھا کہ وہ گھر میں ٹکتا ہی نہیں تھا۔ ادھر باپ پریس گیا اور ادھر وہ بھاگا بھاگا باہر پہنچ گیا۔

ایک سال یونہی بیت گیا۔ چھٹے سال میں اس کے باپ نے مار پیٹ کر اسے ایک قریبی مدرسے میں داخل کرا دیا۔ کچھ روز تو وہ بستہ اٹھا کر باقاعدہ کلاس میں جاتا رہا۔ پھر دہی کچھ ہونے لگا جو پہلے ہوتا رہا تھا۔ آدھی چھٹی کے وقت وہ اپنے خاص دوستوں کے ساتھ بھاگ جاتا تھا اور شام کے قریب واپس آتا تھا۔

اس طرح ایک اور سال ضائع ہو گیا۔ اس کی ماں نے اسے مسجد کے مولوی کے سپرد کر دیا۔ وہاں بھی اس کا یہی وطیرہ رہا۔ ناچار باپ نے اسے موٹروں کی ایک ورکشاپ میں کام سیکھنے کے لئے ورکشاپ کے بڑے مستری کے حوالے کر کے سمجھ لیا کہ چلو چار پیسے کی آمدنی ہو جانے پر گھر کا خرچ چلانے میں قدرے سہولت نکل آئے گی۔

دو سال تک اس کی توقع پوری ہوتی رہی۔ نصیر مستری سے تین روپے لا کر ماں کے ہاتھوں میں دیتا رہا۔ پھر ایک دن صبح ہی صبح مستری نے اس کے گھر آ کر آواز دی۔ نصیر کا باپ باہر آیا۔

"کیوں خیر تو ہے مستری جی؟"

"ہاں خیر ہے صدر دینا! میں یہ کہنے آیا ہوں کہ اپنے نصیر کو سمجھا لو۔"

"کیوں کیا ہوا ہے؟"

"ہونا کیا تھا چور اچکوں کی ایک پارٹی بنی ہوئی ہے سرفراز اس پارٹی کا لیڈر ہے چند روز ہوئے سرفراز تمہارے بیٹے سے ملنے کے لئے آیا تھا۔ مجھے اسی وقت شک پڑ گیا تھا پرسوں سے ورکشاپ سے پرزے پارٹ گم ہونے شروع ہو گئے ہیں سمجھ لیا!"

یہ بات صدر دین کی سمجھ میں نہ آئی سوالیہ نظروں سے مستری کو دیکھنے لگا۔ مستری کی پیشانی پر بل پڑ گئے اور وہ غصے سے بولا۔

"صدر دینا! تم کس دنیا میں رہتے ہو۔ سرفراز نامی گرامی گرہ کٹ اچکا ہے۔ وہ بے وقوف لڑکوں کو الو بنا کر ان کے ذریعے ورکشاپوں سے پرزے حاصل کرتا ہے اور بازار میں جا کر بیچ دیتا ہے۔ یہی اس کا دھندا ہے۔"

"تو میرے نصیر نے کیا کیا ہے؟"

مستری کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا مگر پھر سنبھلنے لگا۔

"تمہارے نصیرے نے یہ کیا ہے کہ ہماری ورکشاپ سے پرزے چرا کر اسے دیتا رہتا ہے اب تو صاف صاف سن لیا نا صدر دینا!"

پھر مستری کا لب ولہجہ ملائم ہو گیا۔ "تم ایک شریف آدمی ہو۔ اس لئے تمہارے بیٹے کے کرتوتوں سے تمہیں واقف کر دیا ہے اسے سمجھاؤ ورنہ نتیجہ بہت برا ہو گا۔"

یہ کہہ کر مستری چلا گیا۔ صدر دین نے یہ سارا قصہ اپنی بیوی کو بھی بتا دیا۔ وہ ہانڈی میں

ڈوئی پھیر رہی تھی۔ یہ بات سن کر اس کا ہاتھ وہیں رک گیا اور چہرہ پیلا پڑ گیا کافی دیر کے بعد اس کے منہ سے صرف یہ الفاظ نکلے۔ "نصیر دین کے ابا! میرا نصیر ایسا نہیں ہو سکتا۔" صدر دین نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ چپ چاپ چولہے کے پاس پیڑھی کے اوپر بیٹھا گھر کر آتے ہوئے سیاہ بادلوں کو گھورتا رہا۔

نصیر دین آیا۔ اس کے ہاتھ میں مٹھائی کی ٹوکری تھی جو اس نے ماں کے آگے رکھ دی اور اس توقع کے ساتھ اس کی طرف دیکھنے لگا کہ وہ ابھی اٹھ کر اسے سینے سے لگا لے گی اور اس کا ماتھا چوم کر ڈھیر ساری دعائیں دے گی۔ مگر اس سے پیشتر کہ وہ کچھ کہے یا کوئی حرکت کرے۔ اس کا باپ گرجا۔

"نصیرے یہ پیسے کہاں سے لائے تھے؟"

"مستری نے دیئے تھے۔"

"آج تو پندرہ تاریخ ہے۔ مہینے کی تنخواہ پندرہ کو کیسے مل گئی؟"

"نہیں چاچا! یہ تنخواہ کے پیسے نہیں ہیں مستری نے میرے کام پر خوش ہو کر دیئے ہیں۔"

غصے سے صدر دین کا چہرہ سرخ انگارہ ہو گیا۔ وہ پیڑھی سے اٹھ بیٹھا۔ پورے زور سے بیٹے کے گال پر تھپڑ مار کر بولا۔

"حرامزادے جھوٹ بولتا ہے۔ ورکشاپ کے پرزے چرا کر بدمعاش گرہ کٹ سرفراز کو دیتا ہے۔" نصیر تھپڑ کھا کر دیوار سے جا ٹکرایا۔ صدر دین نے چمٹا اٹھا لیا لیکن اس کی بیوی نے چمٹے والا ہاتھ پکڑ لیا۔ صدر دین دونوں کو گالیوں پر گالیاں دیتا رہا۔ آخر چمٹا اس نے بیوی کے ہاتھ میں دے دیا۔ "دیکھو زہرا! اسے کہہ دو آئندہ اس نے ایسی حرکت کی اور سرفراز سے یارانہ رکھا تو میں لت گھر سے نکال دوں گا۔ صاف صاف کہے دیتا ہوں۔"

وہ باہر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد زہرا نے وہ ساری روداد سنا دی جس نے صدر دین کے اندر غصے کی آگ بھڑکا دی تھی۔ اس نے بیٹے کا چہرہ دھلایا۔ اس کے بالوں

میں مادرانہ شفقت سے اپنی انگلیاں پھیریں اور بڑے پیار سے اسے سمجھاتے ہوئے کہا "نصیر میرے لعل! عقلمندوں نے کہا ہے کہ بڑوں کی صحبت میں نہیں بیٹھنا چاہیئے۔ آدمی خود بڑا ہو جاتا ہے تجھے کیا پڑی ہے کہ اس بدمعاش سرفراز سے یاری کرے۔ نہ بُرا نہ۔ ہم شریف لوگ ہیں تیرے ساتھ کچھ ایسا ویسا ہو گیا تو ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ اللہ عزت کی دال روٹی دیتا ہے۔ صبر شکر کر کے کھا لیتے ہیں۔"

ماں کے یہ الفاظ سن کر نصیر کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے مگر یہ ایک وقتی کیفیت تھی ایک ہفتے بعد ہی نصیر کو مار پیٹ کر ورکشاپ سے نکال دیا گیا۔ باپ اسے اپنے ساتھ پریس لے جانے لگا۔ پریس کے کام میں نصیر کا دل نہیں لگتا تھا۔ باپ کے ساتھ تو چلا جاتا مگر جب کاریگروں کو کھانا کھانے کی چھٹی ملتی وہ چپ چاپ پریس کے چور دروازے سے نکل کر سیدھا سرفراز کے ہاں چلا جاتا۔

سرفراز نے جسے وہ استاد کہہ کر پکارتا تھا اسے اپنے کرتب سکھانے شروع کر دیئے تھے۔ اور جیسے جیسے اس کی عمر بڑھتی جا رہی تھی وہ اپنے فن میں بھی ہوشیار ہوتا چلا جا رہا تھا۔ مگر اس نے ابھی تک چھوٹی چھوٹی وارداتیں کی تھیں۔ کوئی بڑا معرکہ نہیں مارا تھا۔

ماں اسے رو رو کر سمجھاتی رہتی تھی۔ باپ نے اس سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ وہ بیٹے کی طرف سے بالکل مایوس ہو گیا تھا۔ اسے خبر ہی نہیں ہوتی تھی کہ اس کا بیٹا کب گھر میں آتا ہے اور کب باہر نکل جاتا ہے۔ اور یوں وقت گزر رہا تھا۔

سولہ سال کی عمر میں نصیر نے بڑی کارروائی کی اور رنگے ہاتھوں پکڑا گیا۔ جیب تراشی کے جرم میں اسے اڑھائی سال کی سزا ہو گئی۔

ماں نے یہ خبر سنی تو اس پر بجلی گر پڑی۔ باپ کو معلوم ہوا تو وہ بیوی سے مخاطب ہو کر بولا "میں پہلے ہی جانتا تھا، یہ ہوگا۔ سمجھ لے تیرا بیٹا مر چکا ہے۔"

"کیسے سمجھ لوں" ماں نے سینے پر دوہتڑ مارتے ہوئے کہا۔ خدا کے واسطے کچھ کرو۔"

"میں کیا کر سکتا ہوں۔ مجھے بھی اندر کرانا چاہتی ہو؟"

وہ جیل میں آخری سال کی سزا کاٹ رہا تھا کہ ایک عزیز نے آکر خبر پہنچائی کہ تیری ماں مر گئی ہے۔

یہ خبر سن کر اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے اور وہ ساری رات سو نہ سکا۔

سزا کاٹ کر وہ گھر آیا تو باپ نے کہا: "کیا کرنے آئے ہو۔ تجھے سینے سے لگانے والی ماں مر گئی ہے۔ دفع دور ہو جاؤ میری نظروں سے۔ میرا تیرے ساتھ کوئی رشتہ نہیں ہے۔"

وہ اُلٹے پاؤں گھر سے نکل آیا۔

اس گھر کے سوا اس کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا اور یہاں سے اسے نکال دیا گیا تھا۔ وہ سیدھا ستی گیٹ میں سرفراز کے ہاں جا پہنچا۔ سرفراز نے اس کی پوری داستان سنی تو کہنے لگا: "یار اس میں گھبرانے کی بھلا کیا بات ہے۔ میرے پاس ایک کمرہ تو ہے نا دونوں مزے سے رہیں گے۔ اچھی رقم کہیں سے ہاتھ آجائے گی تو اپنا مکان خرید لیں گے۔ دونوں کوشش کرتے ہیں۔ اللہ رازق ہے۔"

سرفراز نے بزرگوں کی طرح اس کی پیٹھ پر تھپکی دی۔ بازار سے نان کباب لے آیا اور دونوں کھا کر سو گئے۔

اس کی مہم جاری رہی مگر کبھی سو روپیہ ہاتھ آجاتا۔ کبھی تین چار سو۔ یہی حالت سرفراز کی بھی تھی۔ اس طرح سات برس گزر گئے۔

ایک بار اس نے بس میں بڑھیا لباس میں ملبوس ایک بڑی بڑی مونچھوں والے فربہ اندام شخص کو دیکھا۔ سمجھ لیا اس کی جیب میں بہت کچھ ہوگا۔ تجربے نے اسے سکھا دیا تھا کہ ایسے لوگ بڑے ہوشیار ہوتے ہیں۔ سارا روپیہ ایک ہی جیب میں نہیں رکھتے۔ کئی جیبوں میں رکھتے ہیں۔ بس میں اتنا ہجوم تھا کہ تل رکھنے کی بھی جگہ نہیں تھی۔ یہ اس کے لئے سنہری موقع تھا۔ جب وہ بڑی مونچھوں والا بس سے نیچے اترنے لگا تو اس نے اس کی ایک جیب کی صفائی کر ڈالی۔ اور

بڑے سکون سے چلتا ہوا قریبی باغ میں چلا گیا۔ رقم گنی تو پانچ ہزار تھی۔ یہ کافی روپیہ تھا۔ وہ بڑے آرام سے مستی گیٹ کی طرف جانے لگا۔

یکایک اس کی نگاہ پھر اسی آدمی پر جا پڑی اب وہ دا تا دربار کی جانب قدم اٹھا رہا تھا۔ اس روز بڑا عرس تھا۔ لوگ جوق در جوق دربار کی طرف جا رہے تھے یا لوٹ رہے تھے۔ وہ نہر کے کنارے کنارے چلا جا رہا تھا۔ اور اس شخص سے کافی دور نکل آیا تھا۔

اس کی دوسری جیب میں مال ہوگا۔ اس نے سوچا کیوں نہ موقعے سے فائدہ اٹھایا جائے اور وہ پلٹ کر تیز تیز قدم اٹھانے لگا وہ شخص بھاٹی گیٹ سکول کی بیرونی دیوار کے ساتھ ساتھ چلا جا رہا تھا۔ اور اس کے اردگرد بے شمار لوگ آ جا رہے تھے۔

وار بھرپور نہ پڑا۔ مونچھوں والے نے اسے بری طرح جکڑ لیا۔ جیب میں ہاتھ ڈالا تو پانچ ہزار غائب تھے۔ یہ اس کی جیب میں سے نکل آئے۔ اب کیا تھا۔ کوئی صورت بچاؤ کی نہیں تھی۔ حوالات میں پہنچا اور حوالات سے چار سال کے لئے جیل میں۔ اور آج شام وہ جیل میں پوری سزا کاٹنے کے بعد رہا ہوا تھا۔

اس وقت آس پاس کوئی بھی نہیں تھا وہ تھا اور وہ ویران جگہ۔ اس نے اپنی پیٹھ دیوار کے ساتھ لگا دی اور آہستہ آہستہ پاؤں پھیلانے لگا۔ پاؤں پھیلا چکا تو اسے احساس ہوا کہ وہ بھوکا اور پیاسا ہے غیر ارادی طور پر اس کا ہاتھ ایک جیب کے اندر چلا گیا۔ کچھ نقدی تھی جو وہ جیل کے اندر داخل ہونے سے پہلے سپرنٹنڈنٹ جیل کے پاس رکھوا گیا تھا اور یہ وہی رقم تھی۔" اس سے کچھ دن پیٹ بھر سکتا ہے۔" اس کے ذہن میں خیال آیا اور وہ عمارت سے باہر آ گیا۔

بازار میں گھومتے گھومتے اس کی نظر ایک تنور پر پڑی جس کے اردگرد لوگ بیٹھے تھے۔ وہ اسی طرح پیٹ بھرنے کا عادی تھا۔ سرفراز کے ہاں اسے بارہا اس طرح پیٹ بھرنا پڑا تھا وہ تنور کے پاس جا بیٹھا تو تنور والی نے اسے بڑے غور سے دیکھا اس کی نگاہیں غیر مبہم

انداز میں کہہ رہی تھیں کہ تجھے اس سے پہلے یہاں کبھی نہیں دیکھا گیا۔ کہاں سے آ گیا ہے۔
اس نے تنور والی کی نظروں کا مفہوم سمجھ لیا مگر سر اس طرح جھکا لیا جیسے وہ اس سوال کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔

پیٹ بھرنے کے بعد وہ واپس اسی جگہ آ گیا۔ اب وہ لیٹا تو نیند کا غبار اس کی آنکھوں پر چھا گیا۔ ابھی وہ گہری نیند سو ہی رہا تھا کہ اس نے اپنے چہرے کے قریب آگ جلتی ہوئی محسوس کی۔ گھبرا کر اس نے آنکھیں کھول دیں۔

سورج اوپر چمک رہا تھا اور اس کی شعاعیں اس کے چہرے پر پڑ رہی تھیں۔

اس نے دیکھا کہ کئی لڑکے اس کے پاس کھڑے ہیں اور ایک لڑکا دوسرے سے کہہ رہا ہے۔ "یہ مسیت کا مولبی ہے۔"

مسیت کا لفظ سنتے ہی وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"مولبی جی! تم یہاں رہو گے؟" ایک لڑکے نے پوچھا۔

نصیر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تم لڑکوں کو پڑھاؤ گے؟ دوسرے نے پوچھا۔

وہ خاموش رہا۔

لڑکوں نے اسے گھیر رکھا تھا اور طرح طرح کے سوالوں سے اسے پریشان کر رہے تھے۔ یکایک وہ سب کے سب خاموش ہو گئے۔ ایک بوڑھا شخص جس نے نیلے رنگ کے دھسے کی ٹنگل مار رکھی تھی۔ للکار کر لڑکوں سے کہنے لگا۔

"او شیطانو! کیا مجمع لگا رکھا ہے مسجد کے اندر؟"

ایک لڑکے نے اس کی طرف رخ کیا "حاجی جی! یہ پتہ نہیں کون ہے مسیت میں آ بیٹھا ہے۔"

وہ شخص جسے لڑکے نے حاجی جی کہا تھا نصیر پر ترچھی نگاہیں ڈالتا ہوا آگے بڑھا اور اس

کے قریب آکر رُک گیا۔

"کون ہو تم جوان؟ کہاں سے آئے ہو۔ میری مسجد میں کیوں آ بیٹھے ہو؟" حاجی جی نے ایک ہی سانس میں تین سوال جڑ دیئے۔

جب وہ بچہ تھا تو اس نے اپنے باپ سے ایک کہانی سنی تھی جس میں ایک جن انسان کا روپ دھار کر ایک مسجد میں درویش بن کر بیٹھ جاتا ہے اور کئی سال مولوی سے سبق پڑھتا ہے۔ اس نے بے ساختہ کہہ دیا۔

"میں درویش ہوں؟"

"درویش ہو تو درویشوں والے کام کرو۔ اس طرح نکمے کیوں بیٹھے ہو؟"

حاجی صاحب نے کمبل کا سرا لہرایا اور دروازے سے نکل گئے۔ لڑکے بھی چلے گئے۔

نصیر نے اپنے دل سے سوال کیا میں اب کام کیا کروں؟ اس نے چاروں طرف نظر ڈالی۔ دیواروں پر گرد کی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ زمین پر کوڑا کرکٹ کے انبار لگے تھے۔ وہ مسجد سے باہر آیا۔ ایک دوکان سے جھاڑو خریدا اور مسجد کے اندر آکر جھاڑو دینے لگا۔

اس نے دیکھا کہ دروازے کے قریب لڑکے اسے دیکھ دیکھ کر مسکرا رہے ہیں۔ دوپہر کے وقت اسے بھوک لگی تو تنور پر آ گیا۔ پیٹ بھر کر روٹی کھائی اور پھر وہیں اپنی جگہ پہ جا کر لیٹ گیا۔ آنکھ اس وقت کھلی جب شام کی سیاہی پھیل چکی تھی۔

"مسجد میں تو روشنی بھی ہونی چاہیئے۔" اس نے اپنے آپ سے کہا۔ جس دوکان سے جھاڑو خریدا تھا وہاں سے تین موم بتیاں اور ایک ماچس خرید کر لے آیا۔ مسجد کے صحن میں ایک جگہ ڈبل اینٹوں کا ڈھیر پڑا تھا۔ نصیر نے دیوار کے ساتھ ایک گز تک دو دو اینٹیں کھڑی کر دیں اور ان کے اوپر ایک ایک موم بتی جلا دی۔

موم بتی کی یہ روشنی اس فضا میں عجیب سا منظر پیدا کر رہی تھی۔ یہ منظر دھندلا دھندلا سا اجنبی اجنبی سا اور بھیانک بھیانک سا۔ وہ ایک موم بتی کے پاس بیٹھ گیا۔ اور موم بتی کی لو کو

دیکھنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد یہ روشنی اسے بڑی پیاری لگی۔ جیل کی راتیں اندھیری ہوتی تھیں۔ چار سال تک مسلسل اندھیروں میں سانس لینے کے بعد اسے یہ پہلی روشنی نظر آئی تھی۔ جو اس کے عین سامنے پھیلی ہوئی تھی۔ اور جسے اس نے خود روشن کیا تھا۔

وہ دو اور اینٹیں لے آیا اور ان کے اوپر اپنا سر ٹکا دیا۔ آنکھیں بند کر لیں۔ دیر تک بند رکھیں۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ فضا میں کوئی تبدیلی واقع ہو گئی ہے۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ دونوں موم بتیاں ختم ہو رہی تھیں۔ اس نے تیسری بھی جلا دی۔

آدھی رات نہیں گزری ہو گی کہ تینوں موم بتیاں جل چکی تھیں۔

"یہ ٹھیک نہیں ـــــ میں لیمپ لاؤں گا۔"

اور صبح سویرے جیسے ہی دوکان کھلی وہ لیمپ لے آیا اور موم بتی کی جگہ اینٹوں کے اوپر رکھ دیا۔ ساری مسجد میں جھاڑو دی اِدھر اُدھر جو اینٹوں کے ڈھیر پڑے تھے انہیں باہر پھینک دیا۔ اس کام میں وہ اس طرح مصروف رہا کہ دوپہر کے وقت تنور پہ جا کر روٹی بھی نہ کھا سکا۔ اور جب دو بجے تنور پہ پہنچا تو وہاں سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ وہ واپس آ کر پھر کام میں لگ گیا۔

پانچ روز بیت گئے تھے۔ چھٹے روز حاجی صاحب اپنے نیلے کمبل کی بُکل مارے آ گئے۔

"لگتا ہے تمہارا گھر بار کوئی نہیں؟"

"کوئی نہیں۔"

"مسجد کی خدمت کرو گے؟"

"جی۔"

حاجی صاحب ایک منٹ خاموش رہے۔ پھر بولے۔

"اس سے پہلے کیا کرتے رہے ہو؟"

اس سوال کا جواب دینا اس کے لئے مشکل تھا۔ تاہم جواب دینا بھی ضروری تھا۔

"کچھ نہیں۔"

"یعنی ساری عمر تم نے کچھ نہیں کیا؟"

وہ خاموش رہا۔

"نام کیا ہے تمہارا؟"

"نصیر۔"

"اپنے گھر کیوں نہیں جاتے؟"

"میرا کوئی گھر نہیں ہے — ماں مرگئی تھی — باپ نے گھر سے نکال دیا ہے۔"

"کیوں نکال دیا ہے؟"

حاجی صاحب اب کے دو منٹ تک بڑے غور سے اس کے چہرے کا جائزہ لیتے رہے۔

"دیکھو نصیر! میرا نام حاجی اللہ دین ہے — وہ جو کمہار کی دوکان ہے نا اس کے سامنے میری حویلی ہے — پیلے رنگ کی میں نے تنہا اس مسجد کو بنوایا ہے پیسے ختم ہوگئے تو یہ نامکمل رہ گئی — میرا ایک چھوٹا مکان بھی ہے۔ اسے بیچنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ بک گیا تو اسے مکمل کردوں گا۔ تم یہاں پوری طرح درویش بن جانا۔ تنور پر بیٹھ کر روٹی مت کھایا کرو۔ دوپہر اور شام کو روٹی میرے یہاں سے لے آیا کرو۔ سن لیا ہے نا۔ میری حویلی وہ سامنے ہے کمہار کی دکان کے سامنے پیلے رنگ کی۔"

"اچھا جی"

اسے حاجی صاحب کے گھر سے روٹی ملنے لگی۔ تاہم اس نے خود بھی مٹی کا ایک پیالہ، ایک تھالی اور پانی پینے کے لئے شیشے کا ایک معمولی گلاس خرید لیا۔ کبھی کبھی دیر ہوجاتی تھی تو وہ حاجی صاحب کے گھر نہیں جاتا تھا۔ تنور سے دو روٹیاں پیالے میں دال لے لیتا تھا اور آتے ہوئے میونسپل کمیٹی کے نل سے اپنا گلاس بھی پانی سے بھر لیتا تھا۔ اپنی جگہ پر روٹی کھانے

لگتا تھا تو اسے عجیب قسم کی راحت ملتی تھی۔ ایک دوپہر وہ روٹی سے پیٹ بھر رہا تھا تو ایک چڑیا اوپر درخت کی کسی شاخ سے اڑ کر اس کے قریب بیٹھ گئی۔

"بھوک لگی ہے بچاری کو" اور اس نے روٹی کا ایک ٹکڑا الگ کیا اور اسے چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کر کے چڑیا کے آگے پھینک دیا۔ اتنے میں اور چڑیاں بھی آگئیں۔ وہ حاجی صاحب کے گھر سے اپنی روٹی لاتا تھا تو تنور سے ایک فالتو روٹی بھی خرید لیتا تھا۔ یہ روٹی چڑیوں کے لئے ہوتی تھی۔ چڑیوں کو پیٹ بھرتے دیکھ کر اسے ناقابل فہم خوشی ہوتی تھی۔ چڑیاں اس کے آتے ہی نیچے آجاتی تھیں۔

وہ ایک اور پیالہ لے آیا۔ اس میں وہ چڑیوں کے لئے پانی لے آتا تھا۔ اس کام میں اس کا دل بہل گیا تھا اور وقت کا کچھ حصہ بڑی خوشگوار کیفیت میں بسر ہو جاتا تھا۔

حاجی صاحب دوسرے تیسرے دن آکر یہ خبر سنا دیتے تھے۔

بات چل رہی ہے۔ اچھے پیسے مل جائیں تو چھوٹا مکان بیچ دوں۔ اتنے پیسے تو ہوں نا درویش! کہ مسجد مکمل ہو جائے۔"

"حاجی صاحب! اس نیک کام میں دوسرے لوگ شامل نہیں ہو سکتے؟" ایک روز نصیر نے پوچھ لیا۔

"واہ درویش! کیسی بات کہتا ہے۔ ساری بستی میں مشہور ہے کہ یہ مسجد حاجی الہ دین کی ہے۔ میں نہیں خرچ کروں گا تو اور کون کرے گا؟ درویش! اللہ سے دعا کر کہ مکان جلدی بک جائے۔ اللہ کے گھر کو اس حالت میں دیکھ کر دکھ ہوتا ہے۔" حاجی صاحب بولے۔

اور پھر کئی ہفتے خاموشی سے بیت گئے۔

نصیر مسجد کے کاموں میں گہری دلچسپی لے رہا تھا اور حاجی صاحب اس کے سامنے اور اس کی عدم موجودگی میں لوگوں سے کہتے رہتے تھے۔

"دیکھو ایسا ہوتا ہے درویش۔"

حاجی صاحب اس سے اس حد تک متاثر ہو چکے تھے کہ اس سے کئی بار کہہ چکے تھے: "درویش! تمہارے لئے یہاں ایک بہت شاندار حجرہ بنے گا جس میں تم بڑے آرام سے رہنا اور مسجد کی خدمت کرنا۔ تمہاری شادی بھی کر دی جائے گی" اور وہ اس کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے یہ خوشخبری سناتے "بڑے مزے سے رہو گے۔ کسی شے کی کمی نہیں ہو گی آج سے تمہارے خرچے پانی کا بھی انتظام کر دیا ہے جو بھی اللہ کے گھر کی خدمت کرتا ہے اسے اللہ بہت کچھ دیتا ہے سمجھ لیا نا؟"

انہی دنوں حاجی صاحب کا مکان معقول رقم پر بک گیا اور مسجد کی تعمیر ہونے لگی۔

حاجی صاحب نے نصیر کے سپرد سارے اختیارات کر دیئے تھے وہی بازار سے ضرورت کی چیزیں خرید کر لاتا تھا۔ کاریگروں اور مزدوروں کا حساب کتاب رکھتا تھا اور ان کاموں کے لئے ہر وقت اس کے پاس خاصا روپیہ جمع رہتا تھا۔

چار دن موسلا دھار بارش ہوئی تو تعمیر کا کام رک گیا۔ پانچویں روز بارش تھم گئی معمار اور مزدور آ گئے۔ سیمنٹ ریت اور لکڑی ــــ یہ چیزیں قریب قریب ختم ہو گئی تھیں اور چار بجے جب سب لوگ چھٹی کر کے گھروں کو جانے لگے نصیر نے مناسب سمجھا کہ جن اشیاء میں کمی واقع ہو گئی ہے وہ بازار سے خرید لائے اور وہ تانگہ کر کے بستی سے نکل پڑا۔ شہر آ کر سیمنٹ کی بوریاں اس نے ریڑھے پر لدوا کر ادھر بھیج دیں اور خود لکڑی خریدنے کے لئے ٹمبر مارکیٹ کی طرف جانے لگا۔

مال روڈ پر اس کا تانگہ جا رہا تھا کہ اس کی نظر دائیں طرف، باغ کے کنارے جنگلے کے سامنے ایک فقیر پر پڑی جو نٹ پاتھ پر نیم دراز تھا اور اس کا ہاتھ گدائی کے لئے پھیلا ہوا تھا۔

ایک بجلی سی اس کے ذہن میں کوند گئی: "کیا یہ ـــــ؟"

اس نے تانگہ رکوا لیا۔ نیچے اترا اور جنگلے کی طرف چل پڑا۔

اس کی نظروں کو دھوکا نہیں ہوا تھا۔ اس کے سامنے سرفراز ہی تھا۔

"استاد! تم ـــ" نصیر نے اس پر جھک کر کہا۔

"کون ہو؟" سرفراز نے پھیلا ہوا ہاتھ بے اختیاری کے عالم میں کھینچ لیا۔

"استاد!" نصیر کے ہونٹوں سے یہ لفظ ابل پڑا۔

"کون ہو؟" سرفراز نے اسے پہچان لینے کے باوجود استفسار کیا۔

"میں نصیر ہوں استاد!"

"نصیر! استاد مر گیا ہے — یہ اس کی لاش ہے جسے تم دیکھ رہے ہو — جاؤ — چلے جاؤ!"

"نہیں — نہیں استاد! میں تمہیں کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔ بتاؤ یہ کیا ہو گیا — کیسے ہو گیا — تم سڑکوں پر — استاد! میں کچھ سمجھ نہیں سکا۔ خدارا بتاؤ۔" سرفراز نے اپنا سر دونوں زانوؤں میں چھپا لیا

"استاد! استاد بتاؤ۔" نصیر اس کے پہلو میں بیٹھ گیا۔

"نہ سنو — جو ہونا تھا وہ ہو گیا ہے۔ بیماریوں نے کہیں کا نہیں رکھا۔ تباہ و برباد ہو گیا ہوں۔ موت نہیں آتی۔ بے شرمی سے جی رہا ہوں —" سرفراز نے اسی حالت میں یہ لفظ کہہ کر سر اور چھپا لیا۔

"استاد! چلو گھر چلیں —"

"کس کے گھر — کیسا گھر؟"

"تمہارے گھر — مین گیٹ والے گھر —"

سرفراز دو تین لمحے خاموش رہنے کے بعد بولا۔

"نصیر! میں کرایہ نہیں دے رہا تھا — اس لیے — مالک نے مجھے نکال دیا — گھر میں جو کچھ تھا — چھین لیا — کچھ نہیں رہا — میرے پاس کچھ نہیں رہا۔"

سرفراز کا بدن بری طرح لرز رہا تھا۔

نصیر کا اپنا سر جھک گیا۔ تانگے والا یہ منظر بڑی حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ وہ تانگے سے اتر کر ان کے پاس ہی آ گیا تھا۔

"استاد! میرے ساتھ چلو۔"

"کہاں لے جاؤ گے؟"

"جہاں مجھے پناہ ملی ہے۔"

نصیر نے کوچوان کی مدد سے سرفراز کو اٹھا کر تانگے پر بٹھایا اور تانگہ بستی کی طرف جانے لگا۔

حاجی صاحب اپنے چند عقیدت مندوں کے ساتھ مسجد کے دروازے پر کھڑے تھے جب تانگہ وہاں پہنچا تو وہ تانگے میں ایک اپاہج آدمی کو دیکھ کر پریشان ہو گئے۔

نصیر نے سرفراز کو تانگے سے اتارا اور اسے آہستہ آہستہ مسجد کی طرف لے آیا۔

"یہ کون ہے درویش؟" وہ بولے

"میرا پرانا دوست ——"

"اسے کیوں لے آئے ہو؟"

نصیر ایک منٹ خاموش رہا اور مسجد پر نظریں جمائے کھڑا رہا۔

"حاجی صاحب! میں نے سوچا تھا۔ اللہ کے گھر میں مجھے پناہ ملی ہے تو اسے بھی مل جائے گی"

نصیر یہ فقرہ کہہ رہا تھا اور حاجی صاحب کا ایک عقیدت مند ان کے کان میں کچھ کہہ رہا تھا جسے سن کر ان کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا تھا۔

"یہ تمہارا پرانا دوست ہے —— چور، اچکا، نامی گرامی گرہ کٹ —— کیسے یہاں لے آئے ہو۔ پاگل ہو گئے ہو درویش!"

نصیر سرفراز کو سہارا دیئے کھڑا تھا اور بوجھ سے اس کا جسم جھکا ہوا تھا۔

"حاجی صاحب! میں بھی اسی کا ساتھی تھا —— میں بھی وہی کچھ تھا —— حاجی صاحب ——"

حاجی صاحب کی مونچھوں کے بال شدید غصے میں پھڑ پھڑانے لگے۔

"تم اس کے ساتھی تھے —— تم بھی —— بدمعاش، پاجی، میں نے تمہیں درویش سمجھا تھا —— تم —— دفع ہو جاؤ۔ تمہارے لئے بھی یہاں کوئی جگہ نہیں —— دفع دور ہو جاؤ ——"

حاجی صاحب کی گرجتی ہوئی آواز فضا میں اس طرح گونجی کہ کئی گھروں کی کھڑکیاں

کھل گئیں۔

"ٹھیک ہے حاجی صاحب۔"

نصیر نے جیب میں ہاتھ ڈال کر نوٹوں کا بنڈل نکال کر حاجی صاحب کی طرف بڑھا دیا۔

"آپ کی امانت" اور یہ کہہ کر اس نے سرفراز کو اپنے بازوؤں پر اٹھا لیا۔

"چلو استاد! ایک میرا گھر بھی ہے۔ شاید وہاں پناہ مل جائے۔ نہ ملی تو سڑکیں ہیں۔ باغ ہیں۔ گھنیرے درخت ہیں۔ ان کے سایوں میں جی لیں گے۔" تھوڑی دیر بعد رات کے اندھیرے میں ایک تانگہ بستی میں سے نکل رہا تھا۔

کاغذ کی ناؤ

اس سال کی یہ تیسری تقریب تھی جو راشد کے گھر میں ہو رہی تھی۔ پہلی تقریب فروری کے آخری ہفتے میں ہوئی تھی اور یہ ایک مجلسِ مولود تھی۔ دوسری تقریب ایک سالگرہ تھی، راشد کی بھانجی کی جو چند روز کے لیے اس گھر میں آگئی تھی اور اتفاق یہ کہ چودہ جولائی کو اس کی سالگرہ کا دن تھا جب وہ یہیں مقیم تھی تو بچی کی نانی اس موقعے کو کیسے ضائع کر سکتی تھی انہوں نے شاہدہ کی سالگرہ بڑی دھوم دھام سے منائی اور بہت سے لوگوں کو اکٹھا کر لیا۔ اور اس روز اس کے اپنے بیٹے کی سالگرہ تھی۔ دن ستائیس نومبر کا تھا اور راشد کی امی ہفتوں سے اس کی تیاری کر رہی تھیں۔ محلے کے اندر اور محلے کے قرب و جوار میں جتنے بھی بڑے گھر تھے وہاں جا جا کر وہ گھر والوں کو بالخصوص لڑکیوں کو سالگرہ میں شرکت کی دعوت دے آئی تھیں اور انہیں توقع تھی کہ اس مرتبہ وہ اس مقصد میں ضرور کامیاب ہو جائیں گی جو ہر تقریب کے برپا کرنے میں ان کے پیشِ نظر رہتا تھا۔

تقریب رات کے نو بجے تک جاری رہی۔ بڑی رونق رہی۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ راشد کی امی نے جن جن لڑکیوں کو مدعو کیا تھا وہ سب کی سب آگئی تھیں۔

راشد جب تھک تھکا کر اپنی خوابگاہ کی طرف جا رہا تھا تو اس کی امی نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک لیا اور اپنے قریب آنے کے لیے کہا۔ راشد جانتا تھا کہ وہ کیا پوچھیں گی، اس لیے وہ مسکرا کر کہنے لگا: "چھوڑو نا امی! ہر بار کیا قصہ لے بیٹھتی ہیں آپ بہت اچھی تقریب ہوئی بہت خوبصورت تحفے ملے اور کیا چاہیے؟"

مگر راشد کی امی کو نہ تو سالگرہ کے شاندار ہونے سے کوئی دلچسپی تھی اور نہ خوبصورت تحفوں سے کوئی سروکار۔ وہ تو یہ معلوم کرنا چاہتی تھیں کہ اس کے ضدی بیٹے کو کوئی لڑکی بھی پسند آئی یا نہیں۔ تین سال سے وہ ایک ہی رٹ لگائے جا رہا تھا: "امی! جب تک مجھے کوئی لڑکی پسند نہیں آئے گی میں شادی کے معاملے میں ہاں نہیں کہوں گا۔" اور اس کی امی کسی نہ کسی بہانے سے درجنوں کے حساب سے لڑکیاں اسے دکھا چکی تھیں۔ مگر کسی موقع پر بھی "ہاں" اس کے ہونٹوں سے نہیں نکلی تھی۔

اس کی بیوہ ماں اپنی بڑی لڑکی کی شادی کر چکی تھیں۔ لڑکی تو ہوتی ہی ہے کسی غیر کے گھر کی امانت۔ وہ چلی گئی تو ماں کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ ان کے بیٹے کا گھر آباد ہو اور وہ برابر تین برس سے اسی تگ و دو میں مصروف تھیں لیکن ان کی ہر کوشش ابھی تک ناکام ثابت ہوئی تھی۔

"راشد بیٹا! کچھ بولو تو۔" راشد کی امی کا لہجہ بہت حد تک ملتجیانہ تھا اور راشد اس کو سمجھتا تھا لیکن ایسا جواب دینے سے خود کو قاصر محسوس کرتا تھا جس سے ماں کو تسلی ہو۔

"ٹھیک ہے امی! ٹھیک ہے، سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔" اپنی امی کو وہ عام طور پر اسی طرح ٹالا کرتا تھا۔

"کچھ کہو تو۔" امی کچھ کہلوانے پر مصر تھیں۔ انہوں نے کتنا وقت صرف کر کے کتنی کوشش کر کے اتنی ساری لڑکیوں کو جمع کر لیا تھا۔ ان میں سے تین چار تو ہر لحاظ سے بہت اچھی تھیں۔ حسین و جمیل، تعلیم یافتہ اور معزز خاندانوں کی چشم و چراغ، لیکن ان کے بیٹے کی ضد اپنی جگہ قائم تھی۔

"امی! فکر نہ کریں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آرام کیجئے، بہت تھک گئی ہیں آپ۔" یہ کہہ کر راشد نے پیچھا چھڑایا اور اپنے کمرے میں جا کر پلنگ پر گر پڑا۔ نیند اس پر غلبہ پانے لگی۔ یکایک ایک خیال اس کے ذہن میں سرسرانے لگا: "رفیعہ اب کے بھی اپنی چھوٹی بہن کو ساتھ نہیں لائی تھی۔ کیا وجہ ہے اس کی؟"

فصیحہ کو اس نے اس وقت دیکھا تھا جب وہ ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا اور وہ اپنی ماں کے ساتھ ان کے ہاں آئی تھی۔ بڑی شوخ گفتار لڑکی تھی۔ ایک منٹ بھی خاموش نہیں بیٹھتی تھی۔ راشد کا ہر طرح مذاق اڑایا کرتی تھی۔

اس کے بعد وہ اس سے کئی بار ملا اور ہر بار اس نے محسوس کیا کہ فصیحہ عام لڑکیوں سے بہت مختلف ہے۔ ایک مرتبہ اسے کالج کے زمانے میں بھی دیکھا تھا۔ کوئی مجلس مذاکرہ تھی جس میں وہ بھی شامل ہوئی تھی اور اپنی سحر بیانی سے اس نے سارے سامعین پر جادو سا کر دیا تھا۔
پھر وہ اس کو کہیں بھی نہ دیکھ سکا۔ اس کی بڑی بہن ہر تقریب میں شریک ہوئی لیکن وہ نہ آئی۔

"وہ کیوں نہیں آئی۔ ممکن ہے اس کی شادی ہو چکی ہو اور وہ کہیں بیرون ملک چلی گئی ہو۔"
اس نے سوچا اور ارادہ کر لیا کہ صبح جب امی سے ملے گا تو ان سے فصیحہ کے نہ آنے کا سبب ضرور دریافت کرے گا۔

نو بجے اسے اپنے بنک پہنچ جانا تھا جہاں وہ اسسٹنٹ مینجر تھا۔ پونے نو بجے تک اسے یاد ہی نہ رہا کہ رات اس نے امی سے کیا سوال پوچھنے کے بارے میں سوچا تھا۔ جب وہ بالکل تیار ہو کر گھر سے باہر قدم رکھنے والا تھا تو اسے اپنے سوال کا خیال آ گیا۔ اس کی امی ناشتے کے گندے برتن اٹھا کر نل کی طرف لے جا رہی تھیں۔

"امی!" اس نے دروازے کے پاس جا کر اپنی امی کو مخاطب کیا۔
امی رک گئیں۔

"رفیعہ کی چھوٹی بہن فصیحہ بھی تھی نا ___ وہ نہیں نظر آئی، کیوں؟" اس نے سوال کیا۔
"کیسے آ سکتی تھی؟" امی نے جواب دیا اور جس انداز سے دیا اس سے واضح طور پر محسوس ہوتا تھا کہ انہیں اس موضوع سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اس سے پیشتر کہ راشد مزید سوال کرتا وہ دھوبی سے گفتگو کرنے لگیں جو دھلے ہوئے کپڑے لے کر آیا تھا اور انہیں کرسی کے اوپر رکھنے ہی والا تھا۔

راشد چاہتا تھا کہ امی ذرا فارغ ہوں تو فصیحہ کے نہ آنے کی اصل وجہ پوچھے مگر وہ تو ایک ایک کپڑے کا جائزہ لے رہی تھیں اور راشد کو اندیشہ تھا کہ وہ اس کام میں کئی منٹ مزید صرف کر دیں گی۔ اس لیئے وہ بنک روانہ ہو گیا۔

بنک میں بہت مصروفیت رہتی تھی، تاہم جب بھی اسے فرصت کے چند لمحے میسر آتے تھے، وہ فصیحہ کے بارے میں خود سے ایک آدھ سوال پوچھ لیتا تھا۔ مثلاً کیا وہ شادی کے بعد کہیں باہر چلی گئی ہے یا وہ بیمار تو نہیں ہے۔ ماں کے اس جواب نے کیسے آسکتی تھی، اسے کچھ مضطرب کر دیا تھا اور وہ صورت حال جلد سے جلد معلوم کرنا چاہتا تھا۔

چھٹی کے وقت اسے یاد آیا کہ وہ چائے کی ایک دعوت میں مدعو ہے۔ اگر اسے وہاں نہ جانا ہو تو وہ لازماً رضیہ کے ہاں جاتا۔ مگر اتنی مدت بعد جانا اور بغیر کسی مقصد کے جانا اسے اچھا نہیں لگتا تھا۔

دعوت میں خاصا وقت گزر گیا۔ جب نوکر میز پر سے چائے کے برتن اٹھانے لگا تو اس نے دیوار پہ لگے ہوئے کلاک پر نظر ڈالی۔ پونے نو بج چکے تھے۔

"اس وقت وہاں جانا مناسب نہیں ہے۔" اس نے سوچا اور اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

امی نے اسے دیکھتے ہی کہا: "گرم کر دوں کھانا"

"نہیں امی وہاں بہت کچھ کھا لیا تھا۔"

ماں کا موڈ بگڑا ہوا محسوس ہوتا تھا اور وہ اس بگڑے ہوئے موڈ کی وجہ خوب جانتا تھا اس نے دو مرتبہ پہلے بھی ماں کو مایوس کیا تھا۔ اور اس بار بھی اس نے انہیں محرومی کا ہی احساس دلایا تھا۔

وہ میز پر سے کھانے کے برتن اٹھانے لگی تھیں کہ راشد نے پوچھا۔

"امی! اب کون سی تقریب ہو گی؟" یہ بات پوچھتے ہی وہ مسکرا دیا تاکہ ماں یہ احساس کر لے کہ وہ شرارتاً ایسا سوال کر رہا ہے، سنجیدگی سے نہیں، مگر ماں نے سنجیدگی ہی سے جواب دیا۔

"تم سوچیو؟"

"یہ کام تو آپ کیا کرتی ہیں امی!" وہ مسکرائے جا رہا تھا۔

ماں دو تین لمحے خاموش رہنے کے بعد بولیں "میں ہار چکی۔ تم جانو اور تمہارا کام!" امی نے یہ الفاظ کہہ کر پلٹ کر بیٹے کو دیکھا جس کے چہرے سے مسکراہٹ کی دھوپ غائب ہو چکی تھی راشد نے چاہا کہ اصل موضوع کی طرف آئے۔ کہنے لگا۔

"امی آپ نے محسوس کیا کہ رفیعہ کتنی سنجیدہ تھی۔ اس کی بہن فصیحہ ایسی نہیں تھی آپ کو معلوم ہے نا کتنی شریر — ماں کے چہرے پر بیزاری کے اثرات چھا گئے اور وہ کچھ کہے بغیر باورچی خانے کی طرف جانے لگیں۔

راشد نے لباس تبدیل کیا اور پلنگ پر لیٹ گیا۔

امی نے اس موضوع پر کچھ کہا ہی نہیں۔ معاملہ کیا ہے، ہو سکتا ہے وہ اس بات کو کوئی اہمیت نہ دیتی ہوں۔ مگر اہمیت نہ دینے کی وجہ۔ کوئی نہ کوئی وجہ تو ہونی چاہیئے۔

اسے یاد آیا کہ ایک مرتبہ دونوں نے مل کر کاغذ کی ایک کشتی بنائی تھی اور محلے کے اس نشیبی حصے میں جہاں دو روز تک لگاتار بارش کی وجہ سے دو تین فٹ گہرا پانی جمع ہو گیا تھا اپنی کشتی بہا دی تھی جب کشتی دور چلی گئی تو راشد نے اسے پکڑنے کی کوشش کی۔ اس کشمکش میں کشتی کے اندر پانی چلا گیا اور وہ نیچے چلی گئی — وہ خود پانی سے باہر آ گیا۔

نہ جانے کیا بات تھی کہ اس وقت راشد کو فصیحہ کا چہرہ غمگین نظر آیا۔

ایسی شریر لڑکی یوں غمگین بھی ہو سکتی ہے۔ اس نے ان لمحوں میں سوچا تھا اور اس وقت بھی کہ اس واقعے کو گزرے سالہا سال بیت چکے تھے، یہی سوال اس کے ذہن میں ابھر آیا تھا۔

ناشتے پر ماں سے چند عام سی باتیں ہوئیں۔ انہیں اپنی ناکامی کا احساس تھا یا بیٹے کی ضد نے افسردہ کر دیا تھا۔ کوئی نہ کوئی وجہ تو ہو گی۔

اتوار کا دن تھا اور یہ عام تعطیل کا روز تھا۔ وہ ماں سے کچھ کہے بغیر باہر آ گیا۔

اتنے برسوں کے بعد رفیدہ کے ہاں جاتے ہوئے اسے ایک عجیب سا احساس ہو رہا تھا جیسے وہ کوئی ایسا کام کر رہا ہے جس کی اس سے توقع نہیں کی جا سکتی جس زمانے میں رفیدہ اور فصیحہ ان کے ہاں آیا جایا کرتی تھیں، وہ چار پانچ ماہ میں صرف ایک بار ان کے گھر میں جاتا تھا اور وہ بھی کسی تقریب میں مدعو کرنے کی خاطر یا ان کی کسی تقریب میں شامل ہونے کے لئے۔ اور اب تو اسے کوئی ایسی ضرورت بھی نہیں تھی کیا ان کے گھر والے اسے اپنے ہاں دیکھ کر حیران نہیں ہو جائیں گے اور گو زبان سے کچھ نہ کہیں، ان کے دلوں میں تو یہ سوال ضرور سر اٹھائے گا کہ آخر وہ ان کے ہاں کرنے کیا آیا ہے۔

اس کے قدم رفیدہ کے گھر کی طرف اٹھ رہے تھے اور ذہن میں ایک ایسی کشمکش برپا تھی جو برابر بڑھتی جا رہی تھی۔

مکان ڈھونڈنے میں راشد کو خاصی دقت ہوئی۔ لاہور کے دوسرے علاقوں کی طرح سوہنی روڈ کے اس حصے میں بھی بے تحاشا مکان تعمیر ہو چکے تھے جہاں ایک گھر میں اسے جانا تھا۔ رفیدہ کے ابا جی تحصیلدار رہ چکے تھے۔ اردگرد ان کے نام کی شہرت تھی اس لئے وہ جلد ہی اپنی منزل پر پہنچ گیا۔

مکان پرانا نظر آ رہا تھا۔ دروازے کا رنگ و روغن اتر چکا تھا۔ دروازے کے ایک طرف نام کی تختی پر فضل حسین تحصیل دار کے مٹے مٹے سے حرف بمشکل پڑھے جا سکتے تھے۔ راشد نے کال بیل پر انگلی رکھنے سے پیشتر دو تین لمحوں کے لئے ادھر ادھر دیکھا گویا کوئی غیر مناسب کارروائی کرنے والا ہے۔

گھنٹی بجنے کے ایک دو منٹ بعد دروازے کے پیچھے سے رفیدہ کی ماں کی آواز آئی "کون ہے؟"

"جی میں ہوں راشد، خالہ جان!"

دروازہ فوراً کھل گیا۔

"ارے راشد بیٹا! سچ مچ تم ہو بیٹا۔"

"آپ پہچان نہیں سکیں خالہ جان"

"کمال کرتے ہو۔ اپنے راشد کو نہیں پہچانوں گی۔ آؤنا باہر دروازے پر کیوں کھڑے ہو۔"

رفیعہ نے مسکرا کر اس کا استقبال کیا اور اسے ڈرائینگ روم میں لے گئی۔

"ہوا یہ خالہ جان کہ میں ادھر اپنے ایک دوست کے ہاں آیا تھا۔ واپسی پر آپ کے مکان پر بھی نظر پڑ گئی۔" اس نے یہ بات ڈرائینگ روم میں داخل ہوتے وقت سوچ لی تھی۔

رفیعہ کا چھوٹا بھائی بھی آ گیا۔ بوڑھا باپ بھی۔ میز پر چائے کے برتن بھی ترتیب دیئے جانے لگے مگر اس ہستی کی اس نے ابھی تک ایک جھلک بھی نہیں دیکھی تھی جس کی خاطر وہ وہاں پہنچا تھا۔

باتیں ہوتی رہیں۔ رفیعہ اور اس کی ماں، دونوں نے اس سے پوچھا "اب شادی کب ہو رہی ہے؟"

اس کے جواب میں وہ فقط مسکرا دیا۔

جتنی رسمی باتیں تھیں سب تقریباً ختم ہو چکی تھیں۔ اب اسے چلا جانا چاہیئے تھا۔ وہ اٹھ بیٹھا۔

"خالہ جان!" اس کے لہجے میں جھجک نمایاں تھی۔

"وہ۔ ہاں خالہ جان! فصیحہ دکھائی نہیں دی۔" اس نے پوچھا۔

رفیعہ کی ماں نے ایک لمبی آہ بھری۔ "کیا دیکھ کر کرو گے بیٹا۔"

"کیوں۔ کیا بات ہے۔" راشد نے پوچھا۔ مگر اسے اس کے سوال کا کوئی جواب نہ ملا۔

ڈرائینگ روم سے نکل کر وہ صحن میں آیا۔ ایک کونے میں کرسی کے اوپر ہاتھوں کے درمیان کوئی اخبار پھیلا ہوا تھا جس کے پیچھے یقیناً کوئی چہرہ چھپ گیا تھا۔

"فصیحہ بیٹی! راشد آیا ہے۔"

ماں کے یہ الفاظ سن کر فصیحہ نے اخبار ہٹا دیا۔ اب راشد اپنے سامنے، تھوڑے سے فاصلے پر اس چہرے کو دیکھ رہا تھا جو کم از کم بارہ برس بعد اسے دکھائی دیا تھا۔ ایک لمحے کے لئے اس چہرے پر مسکراہٹ آئی۔ دائیں ہاتھ سے اس نے سلام کیا اور پھر بلا کی افسردگی اس پر چھا گئی۔

"راشد! ایکسیڈنٹ میں ایک گاڑی نے میری بچی کی ٹانگیں کچل دیں۔" اس کی ماں کہہ رہی تھی۔ "گھر سے نکلنا مشکل ہو گیا۔ کہیں آتی جاتی نہیں میری بچی۔" راشد نے اب دیکھا کہ فصیحہ وہیل چیئر پر بیٹھی تھی۔ وہ خاموش تھی۔ آنکھیں جھکی ہوئی بے جان دکھائی دے رہی تھیں۔

"کیا یہ وہی شریر فصیحہ ہے جو ایک لمحے کے لئے بھی چپ نہیں ہوتی تھی۔ اور اب کتنی خاموش افسردہ، پژمردہ ہے۔ راشد نے گھر کے دروازے سے باہر نکلتے ہوئے سوچا اور اس وقت بھی یہی احساس اس کے ذہن پر چھایا ہوا تھا جب کھانا کھانے کے بعد تازہ اخبار کی نمایاں سرخیوں پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈال رہا تھا۔ اس کی امی اس کی طرف اس توقع سے دیکھ رہی تھیں کہ وہ کچھ کہے گا۔ کچھ پوچھے گا۔ کسی اہم واقعے کا ذکر کرے گا لیکن وہ خاموش بیٹھا رہا انہوں نے اندازہ لگا لیا کہ راشد کچھ کہنے سننے کے موڈ میں نہیں ہے اس لئے اپنی کرسی سے اٹھنے لگیں۔ اخبار کا ایک ورق میز کے اوپر الگ پڑا تھا۔ انہوں نے یہ ورق اٹھا لیا اور اسے اپنی آنکھوں کے قریب لے آئیں۔ "راشد بیٹا! آج کل ضرورت رشتہ والے اشتہار زیادہ چھپنے لگے ہیں۔"

راشد کے چہرے پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ آئی اور دوسرے ہی لمحے میں غائب ہو گئی۔

"تم فیصلہ کیوں نہیں کرتے؟" ماں نے پوچھا۔

راشد خوب جانتا تھا کہ ماں کا اشارہ کس فیصلے کی طرف ہے مگر اس نے انجان بن کر پوچھا۔ "کس بات کا فیصلہ؟"

تم نہیں جانتے۔ تمہاری ماں تم سے کس بات کا فیصلہ چاہتی ہے۔ آج تمہاری بہن آئی ہوئی تھی بھائی جان ٹال مٹول کیوں کر رہے ہیں؟

"رشیدہ کو تو اور کچھ سوجھتا ہی نہیں امی۔"

راشد نے اپنی طرف سے اس موضوع پر مزید گفتگو کا دروازہ بند کر دیا اور وہ اخبار رکھ کر کرسی سے اٹھنے ہی والا تھا کہ ماں بولیں۔

"ٹھیک ہی تو کہتی ہے۔ تم سے عمر میں صرف دو سال بڑی ہے اس کی شادی ہو چکی ہے دو بچوں کی ماں بھی بن گئی ہے اور ایک تم ہو کہ "

راشد جانے لگا۔ "ہو جائے گا امی! ہو جائے گا۔ آپ کی ہونے والی بہو کہیں بھاگی نہیں جاتی"

یہ الفاظ کہہ کر وہ دروازے پر پہنچ گیا۔

"تم کہاں بھاگے جا رہے ہو؟" انہوں نے بیٹے کو روکنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"ابھی لوٹ آتا ہوں"

وہ فلم دیکھنے کا شائق نہیں تھا مگر اس رات اس نے دوسرا شو دیکھا اور دیر سے گھر پہنچا اور جب بستر پر لیٹا تو ایک بار پھر وہی افسردہ چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے آ گیا جسے اس نے چند گھنٹے پہلے دیکھا تھا۔

"اس نے صرف سلام کیا تھا اور وہ بھی صرف ہاتھ کے اشارے سے کچھ کہا نہیں تھا ایک لفظ تک اس کے ہونٹوں سے نہیں نکلا تھا" "ایک ایکسیڈنٹ میں گاڑی نے میری بچی کی ٹانگیں کچل دیں" نصیحہ کی ماں کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگے۔ خاصی دیر کے بعد اس کی آنکھوں میں نیند آ سکی اور سونے سے چند لمحے پہلے وہ اپنی زندگی کا ایک اہم فیصلہ کر چکا تھا۔

علی الصبح امی نے ناشتا لگایا تو بولا "امی آپ میرا فیصلہ سننا چاہتی تھیں نا۔"

امی جو فرائی انڈے کی پلیٹ بیٹے کی طرف بڑھا رہی تھیں، سانس روک کر اسے دیکھنے لگیں۔

"میں نے فیصلہ کر لیا ہے امی"

"اللہ تیرا شکر ہے۔ بتا دو نا"

"امی! میں نصیحہ سے شادی کروں گا"

ماں کی یہ کیفیت ہوئی جیسے اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے۔ جب ان کی حالت کچھ سنبھلی تو انہوں نے پوچھا "بیٹا راشد! تم نے کیا کہا ہے"

بیٹا جانتا تھا کہ اس نے جو بات کہی ہے وہ ماں نے پوری طرح سمجھ لی ہے اور امی بھی جانتی

جبکہ بیٹے کو اس کا علم ہے۔

"امی! میری خوشی اسی میں ہے۔"

"بیٹا! تم کیا کہہ رہے ہو؟"

راشد ناشتا کرنے لگا۔ ماں اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہی تھی۔

"امی! نصیحہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ آپ کو معلوم ہے نا۔ بہت۔ اچ۔ ح۔ چھی ــ امی"

"تم سچ کہہ رہے ہو؟" امی اسی طرح دیکھ رہی تھیں۔

"میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔ امی۔"

"نہیں راشد بیٹا تم ایسی بات نہیں کہہ سکتے۔" امی نے اپنا دایاں ہاتھ اس کے شانے پر رکھ دیا۔ وہ استہائی انداز سے دیکھ رہی تھیں جیسے جو کچھ اس نے کہا ہے وہ اس کا فیصلہ نہیں ہے۔ وہ ایسا فیصلہ کر ہی نہیں سکتا۔

"امی! آپ غالباً سمجھتی ہیں کہ میں نے سنجیدگی سے یہ الفاظ نہیں کہے حالانکہ پوری سنجیدگی سے کہے ہیں۔ دیکھیے امی اگر آپ کو اپنی بہو کا انتخاب خود کرنا ہوتا تو آپ کو اس تردد کی کیا ضرورت تھی۔ آپ کیوں تقریبیں کرتیں۔ کیوں اتنی دیر تک انتظار کرتی رہتیں۔ فیصلہ صرف آپ کو کرنا ہوتا تو میں کوئی اعتراض نہ کرتا۔ مگر یہ حق آپ نے مجھے دے دیا۔ میری خوشی کا خیال رکھا۔ کیوں امی! میں صحیح کہہ رہا ہوں؟"

اس کی امی نے اثبات میں سر ہلا دیا

"تو نصیحہ آپ کی بہو بنے گی۔"

"مگر بیٹا! وہ تو ــ"

"امی اس کی ٹانگیں بے کار ہو گئی ہیں۔ یہی کہنا چاہتی ہیں نا آپ۔ صرف ٹانگیں ہی بے کار ہوئی ہیں۔ زندگی تو بے کار نہیں ہوئی۔ امی! ذرا سوچیے تو اتفاقات پر کسی کو کیا اختیار ہو سکتا ہے؟"

امی خاموش رہیں۔ راشد نے محسوس کر لیا کہ وہ اب اس معاملے پر کچھ کہنا سننا نہیں چاہتیں۔

وہ کرسی پر بیٹھ گئیں اور راشد باہر نکل آیا۔

اسی شام وہ رفیعہ کے گھر میں کافی پی رہا تھا اور بار بار اس دروازے کی طرف دیکھ لیتا تھا جس کے پیچھے فصیحہ اپنی کسی سہیلی سے باتیں کر رہی تھی۔ کمرے میں اس وقت کوئی نہ تھا۔

راشد نے دیکھ لیا کہ اس کی سہیلی کمرے کے دروازے سے نکلتے ہوئے تیر ریز کہہ رہی ہے۔

اس نے پیالی ہاتھ میں پکڑے رکھی اور دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

"آپ کب آئے؟"

"پندرہ بیس منٹ ہوئے ہیں۔"

فصیحہ نے استفسار طلب نظروں سے اسے دیکھا۔

"میں آپ سے ملنے کے لئے آیا ہوں۔ مجھے کچھ کہنا ہے۔"

راشد نے دو تین گھونٹ پی کر پیالی میز کے اوپر رکھ دی۔ فصیحہ نے اپنی آنکھیں جھکالی تھیں

"فصیحہ مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ میں نے ایک فیصلہ کر لیا ہے۔ آپ کو میرا ساتھ دینا ہوگا۔ آپ میرا ساتھ دیں گی۔"

فصیحہ کی نظریں اوپر اٹھیں اور راشد جلدی جلدی قدم اٹھانے لگا۔

آٹھ روز کے بعد فصیحہ دلہن بن کر راشد کے گھر میں آگئی۔ سب رسوم بڑی سادگی سے ادا کی گئیں۔ فقط بہت قریبی عزیز تقریب میں شامل ہوئے۔ بہتوں کو اس واقعے کا علم ہی نہ ہو سکا۔ راشد کی امی بظاہر کھنچی کھنچی سی نظر آتی تھیں۔ تاہم ان کا رویہ ایسا تھا جس سے بہو کے ساتھ کسی بیزاری کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ وہ اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھتی تھیں اور ان کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ فصیحہ کو کوئی دقت اور تکلیف نہ ہو۔

راشد ماں کے اس رویے پر مطمئن ہو گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جو کچھ ہوا ہے اس پر اس کی امی قطعاً خوش نہیں ہیں مگر وہ یہ بھی جانتا تھا کہ وہ اپنے بیٹے سے اتنی محبت کرتی ہیں کہ گھر کے ماحول میں کوئی تلخی پیدا نہیں ہونے دیں گی۔

فصیحہ شرمائی شرمائی سی رہا کرتی تھی۔ راشد سمجھتا تھا کہ اس کا اس طرح شرمانا کوئی خلاف توقع چیز نہیں ہے۔ ہر دلہن سسرال میں شرمایا ہی کرتی ہے وہ اسے لطیفے سنا سنا کر ہنسانے کی کوشش کرتا تھا۔ دن کا بیشتر حصہ اس کے قریب رہتا تھا۔ سات دن چھٹی کے گزر گئے تو اس نے اپنا یہ معمول بنا لیا کہ بینک سے سیدھا گھر آتا اور کوئی نہ کوئی چیز مٹھائی یا پھل لے کر آتا۔

دو مہینے بیت گئے۔ فصیحہ کا وہی انداز رہا۔ وہی جھکی جھکی نظریں وہی کم گوئی اور وہی سیر و تفریح سے دلچسپی نہ لینے کا اظہار۔

ایک دن موسم بڑا سہانا تھا۔ چار بجے چائے پینے کے بعد راشد کی ماں تو گھر کے انتظام میں مصروف ہو گئیں اور راشد نے فصیحہ سے کہا "دیکھتی ہو موسم۔ ہے نا پر لطف۔ کیا خیال ہے باہر گھومنے چلیں؟"

فصیحہ چند لمحے تو چپ رہی پھر کہنے لگی۔ "جی چاہتا ہے تو چلے جائیں۔"

"تمہارے بغیر؟"

"اس میں حرج ہی کیا ہے؟"

"بہت حرج ہے فصیحہ۔ تمہارے بغیر سیر کا خاک لطف آئے گا؟"

فصیحہ کسی سوچ میں پڑ گئی۔

"کیا تم پہلے اس حالت میں گھر سے باہر نہیں نکلتی تھیں؟"

فصیحہ نے کوئی جواب نہ دیا۔

"وہیل چیئر بڑی آسانی سے ٹیکسی میں رکھی جا سکتی ہے۔ تمہیں کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوگی۔"

راشد اسے جناح باغ لے گیا۔ اسے ٹیکسی سے اتارا اور وہیل چیئر ایک طرف لے جانے لگا۔

"بڑا لطف آ رہا ہے۔ جب میں بچہ تھا تو ابو نے ایک بہت خوبصورت بچہ گاڑی میرے لئے کہیں باہر سے منگوا دی تھی ایک ملازمہ مجھے اس گاڑی میں بٹھا کر باغوں میں گھماتی پھرتی تھی

اور آج ۔ کیا سوچ رہی ہو فصیحہ؟

فصیحہ خاموش تھی۔ اس کے ہونٹ ایک لرزش خفی سے آہستہ آہستہ کانپ رہے تھے اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں اور پلکوں پر سائے سے لرزتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ راشد کے ہاتھ رک گئے اور وہ اس کے خاموش زرد، افسردہ چہرے کو دیکھے جا رہا تھا۔

" فصیحہ بتاؤ تو یہ کیسی سوچ ہے۔"

فصیحہ نے زبان سے کوئی لفظ ادا نہ کیا مگر نفی میں سر ہلا دیا۔

راشد وہیل چیئر کو گلاب کے سرخ پھولوں سے بھرے ہوئے ایک پودے کے قریب لے آیا

" فصیحہ! یہ پھول کتنے خوبصورت اور پیارے ہیں۔ تم بھی ایک پھول ہو۔"

فصیحہ مسکرائی۔ راشد وہیل چیئر کے پاس گھاس پر بیٹھ گیا۔

ہر طرف ہوا کے سرد جھونکے بہ رہے تھے۔ فضا میں پرندے اڑ رہے تھے اور اپنے گھروں کو جاتے ہوئے بڑی تیزی سے اپنے پروں کو حرکت دے رہے تھے۔ ایک قطار جانے کے بعد ایک پرندہ کچھ فاصلے پر نظر آ رہا تھا۔ راشد اس پرندے کو دیکھ رہا تھا اس کا سایہ ایک لمحے کے لئے فصیحہ کے چہرے پر لہرایا اور پھر جیسے اس پر چھائی ہوئی افسردگی کا ایک حصہ بن گیا۔

" فصیحہ! میں خوش تھا کہ تم مسکرائی ہو مگر اب پھر خاموش اور افسردہ سی ہو گئی ہو۔ ایسا ہونا نہیں چاہیے۔ تمہیں کوئی کمی محسوس ہوتی ہے؟ کوئی دکھ ہے جس کا اظہار کرنے سے خود کو قاصر سمجھتی ہو یا مناسب نہیں سمجھتیں۔ کچھ تو ہے فصیحہ! اس کی پردہ داری ہے۔"

راشد نے اپنا سر اس کی کرسی کے بازو سے لگا دیا تھا اور اسے خود محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ یہ الفاظ عام لہجے میں نہیں سرگوشی کے انداز میں کہہ رہا ہے۔ کیا وہ چاہتا نہیں تھا کہ یہ بات اس سے کہے۔

فصیحہ کی پلکیں جھکی ہوئی تھیں اور ان پلکوں کے نیچے رخساروں کی سفیدی۔ جیسے کسی شفاف جھیل کے پانیوں پر درختوں کی ایک لمبی قطار کا سایہ پھیلا ہوا ہو۔

"راشد! اس نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا: انسان کبھی کبھی ایک جذباتی فیصلہ کر بیٹھتا ہے وہ جذبات کی رو میں بہہ جاتا ہے، نہیں سوچ سکتا کہ اس کے فیصلے کا انجام کیا ہوگا۔ وہ کن نتائج سے دوچار ہوگا۔ میں جانتی ہوں تم نے اپنی زندگی کا سب سے اہم فیصلہ کرتے وقت کچھ سوچا نہیں تھا، اور مجھ پر بھی بالکل نہ سوچنے کی پابندی لگا دی تھی کہا تھا نا تم نے تمہیں میرا ساتھ دینا ہوگا تم میرا ساتھ دو گی۔ میں نے ساتھ دے دیا۔ تم نے ہاتھ بڑھایا اور میں نے اپنا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دے دیا۔"

فصیحہ کہے جا رہی تھی، "اگر تم نے نہیں سوچا تھا تو کم از کم مجھے ہی ——— لیکن میں ——— میں راشد! جب تم نے وہ لفظ کہے تھے تو تمہاری آنکھوں میں ایک ایسی سرخی جھلکنے لگی تھی جو ایک بہت مضبوط اور ناقابل شکست ارادے کی علامت ہوتی ہے جو ایک ایسا منہ زور دھارا بن جاتی ہے جس میں سب کچھ بہہ جاتا ہے تم مجھے لے آئے میں آ گئی۔ آگے کتنا طویل، کس قدر پیچیدہ، ناہموار، تاریک راستہ پھیلا ہے یہ راستہ کدھر جاتا ہے۔ کس منزل کی طرف جاتا ہے۔ راشد! ہم کہاں پہنچیں گے! میری چیز دھکیلتے ہوئے کہاں لے جاؤ گے؟"

راشد سنتا رہا اور اس کا چہرہ کرسی کے بازو سے الگ ہو گیا۔

"فصیحہ! ہر انسان کا راستہ پیچیدہ ہوتا ہے زندگی تو پیچیدہ راہوں ہی سے گزرتی ہے۔ میں تمہیں دھکیل کر کہیں نہیں لے جاؤں گا۔ ہم ایک دوسرے کا ساتھ دیں گے۔ ہمیں ہر قدم پر اپنی روشن منزل ملے گی میں اور کچھ نہیں کہوں گا۔"

فصیحہ نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں، راشد کو وہ اپنے سفید لباس میں ملبوس کاغذ کی اس کشتی کی طرح نظر آ رہی تھی جسے ان دونوں نے بہت مدت پہلے ایک گڑھے کے پانی میں بہا دیا تھا۔

"فصیحہ! کاغذ کی ناؤ اور پیار کی ناؤ میں بڑا فرق ہے کاغذ کی ناؤ پانی کی لہروں کا مقابلہ نہیں کر سکتی مگر پیار کی ناؤ تو طوفانوں سے گزر کر ساحل پہ جا پہنچتی ہے۔"

"طوفانوں سے گزر کر"

"کیوں نہیں فصیحہ! مجھے تمہاری یہ مایوسی بالکل پسند نہیں۔ ہنسو، مسکراؤ، میں تمہیں وہ سب کچھ نہ دے سکا جو مجھے دینا چاہیئے تاہم جو کچھ دے سکتا ہوں وہ تو دے دیا ہے۔"

فصیحہ کی پلکوں پر کچھ چمک رہا تھا اس نے ڈوبتی ابھرتی آواز میں کہا: "راشد! تم نے بہت کچھ دے دیا ہے۔ مگر میں نے کیا دیا ہے۔ میں کیا دے سکتی ہوں؟"

اس نے اپنے دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھ لئے۔ راشد نے اٹھ کر آہستہ آہستہ اپنے ہاتھوں سے اس کے ہاتھ آنکھوں سے ہٹائے۔

"ایسا مت کہو فصیحہ۔ تم نے بہت کچھ دیا ہے۔ تم میری زندگی میں آگئی ہو۔ اس سے زیادہ کیا دے سکتی ہو۔" راشد کا چہرہ اس کے چہرے کے بالکل قریب جھکا ہوا تھا۔

"تمہاری زندگی میں آگئی ہوں۔ بکلی ہوئی ٹانگیں لے کر۔"

فصیحہ نے دوبارہ اپنے ہاتھ آنکھوں کے اوپر پھیلا دیئے۔

"اس سے کیا ہوتا ہے فصیحہ؟"

"اس سے کیا ہوتا ہے — یہ پوچھتے ہو مجھ سے۔ اپنی امی کو دیکھا ہے۔ مجھے دیکھتی ہیں تو ان کی آنکھوں میں کتنی مایوسی ہوتی ہے۔ کتنا دکھ، کرب ہوتا ہے۔"

"بے وقوف مت بنو فصیحہ!"

"میں کچھ نہیں بن سکتی۔ کچھ نہیں۔ راکھ کا ڈھیر — راکھ کا ڈھیر۔" فصیحہ جب یہ الفاظ کہہ رہی تھی تو اس کا سارا بدن کانپنے لگا تھا۔

"نہیں فصیحہ نہیں! — ایسا نہیں ہونا چاہیئے۔ میری بات نہیں مانو گی۔ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ تم سے کیا کہہ رہا ہوں فصیحہ۔ تم سے جو میری اپنی ہو۔ میں اپنی فصیحہ سے کہہ رہا ہوں۔"

فصیحہ نے آنکھوں سے ہاتھ ہٹا لئے۔ لمحہ بہ لمحہ اس کی اندرونی طوفانی کیفیت ختم ہونے لگی۔

"اس وقت تم کتنی اچھی لگتی ہو۔" راشد نے مسکرا کر کہا اور فصیحہ کی آنکھوں میں تبسم کی ایک

ہلکی سی لہریں ابھریں جیسے دور افق کا کوئی کنارہ سورج کی اولین کرن سے چمک اٹھا ہو۔
دن گزرتے گئے، دھیرے دھیرے، جیسے وقت کسی غیر ہموار راستے پر سفر کر رہا ہو۔ اس گھر میں تینوں کی ذہنی کیفیتیں مختلف تھیں۔ راشد نفیسہ کے گلے میں اپنے بازو حائل کر دیتا تھا۔ اسے کوئی نیا لطیفہ سناتا تھا۔ کوئی مزیدار بات، نفیسہ زور سے قہقہہ لگاتی بھی تو اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی آجاتی تھی۔ پھر چند لمحوں کے بعد یہ چمک ڈوب جاتی تھی اور راشد محسوس کرتا تھا کہ نفیسہ جو ابھی اس کے بالکل قریب بیٹھی تھی جس کا چہرہ اس نے اپنی گرفت میں لے رکھا ہوتا، جو ہنس رہی تھی، اچانک کہیں چلی گئی ہے، کہیں غائب ہو گئی ہے۔ اور وہ اسے ڈھونڈ رہا ہے۔ اس کی تلاش میں سرگرداں ہے۔

ایسے میں وہ نفیسہ کو زور سے آواز دیتا۔
نفیسہ خوفزدہ نظروں سے اسے دیکھنے لگتی۔
"راشد!" راشد کو اس کی یہ آواز کہیں بہت دور سے آتی ہوئی لگتی۔

نفیسہ بیک وقت دو دنیاؤں میں جی رہی تھی۔ ایک دنیا بہت تابناک اور دوسری بڑی تاریک ایک دنیا میں سانس لیتے ہوئے وہ جلد گھبرا جاتی۔ اور بے اختیاری کے عالم میں یہ دنیا چھوڑ کر دوسری دنیا میں چلی جاتی۔

آدھی آدھی رات کو اس کی آنکھ کھل جاتی۔ اپنے پہلو میں وہ راشد کو دیکھتی "یہ میرا شوہر ہے۔ میری دنیا۔ میرا محبوب۔ میرا — میرا" — وہ اسے دیکھتی رہتی۔ اچانک اندھیروں کی دنیا اسے آواز دے کر بلا لیتی۔

"نہیں — نہیں۔ میں اس کے قابل نہیں ہوں۔ میں کیا ہوں۔ اپاہج۔ محتاج۔ ایک ناکارہ وجود" وہ تیزی سے خود کو پیچھے ہٹا لیتی۔ ایک ہچکی سی اس کے گلے میں پھنس جاتی۔

راشد کی امی چپ چاپ اپنے کاموں میں مصروف رہتی تھیں۔ صبح سویرے ناشتا تیار کرتی تھیں اور دونوں کو ناشتا کرواتی تھیں، بہو ناشتے کے بعد اخباروں کے مطالعے میں مصروف ہو جاتی

سمتی تو وہ سودا سلف لانے کے لئے بازار چلی جاتی تھیں۔

راشد کا اسلام آباد میں تبادلہ ہو گیا۔ لاہور میں اسسٹنٹ منیجر کے طور پر کام کرتے ہوئے اسے تین برس گزر چکے تھے اور اب اس کی ترقی کا امکان خاصا روشن تھا۔ اسے ترقی دے کر برانچ منیجر بنا دیا گیا۔ جب اسے اس امر کی اطلاع ملی تو اسے خوشی ہوئی لیکن جلد ہی یہ خوشی فکرمندی میں بدل گئی۔ اس کے ذہن میں یہ سوال ابھرا کہ کیا فصیحہ نئے ماحول سے مانوس ہو سکے گی۔ یہاں ہفتے میں کم از کم ایک بار اس کی بہن رفیعہ آ جاتی ہے۔ رفیعہ نہیں آتی تو بھائی سرفراز پہنچ جاتا ہے۔ اسلام آباد میں یہ ممکن نہیں ہے۔

اس نے گھر آ کر بیوی کو یہ خبر سنائی تو اس کے چہرے پر کوئی ایسا تغیر رونما نہ ہوا جس سے اس کے ذہنی ردعمل کا اظہار ہوتا۔

دس روز بعد وہ تینوں اسلام آباد کے ایک کوارٹر میں تھے۔

راشد کو نئی فضا میں کسی قسم کی تبدیلی کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ البتہ وہ یہ ضرور محسوس کرتا تھا کہ اس کی بیوی کی کم گوئی میں اضافہ ہو گیا ہے۔ ماں سے تو وہ پہلے ہی صرف مطلب کی بات کرتی تھی اور اب تو وہ ان سے کچھ اور دور ہو گئی تھی۔

فصیحہ شوہر کے بنک جانے کے بعد زیادہ تر اپنے کمرے میں ہی بیٹھی رہتی تھی۔ رسالوں کا مطالعہ کرتی رہتی یا کھڑکی کے قریب جا کر باہر دیکھتی رہتی۔

راشد کی امی آ کر کہتیں: "چائے لاؤں؟"

"خالہ جان! تکلیف نہ کریں۔"

راشد کو گھر آنے میں دیر ہو جاتی تو وہ فصیحہ کو کھانے کے لئے ڈائننگ روم میں چلنے کے لئے کہتیں مگر وہ نفی میں سر ہلا دیتی: "نہیں خالہ جان!"

"تمہیں بھوک نہیں لگی؟"

"نہیں، بالکل نہیں۔"

ساس منہ سے کچھ نہ کہتیں۔ مگر جاتے ہوئے جب زور سے کمرے کا دروازہ بند کرتیں تو صاف معلوم ہو جاتا کہ انہیں اپنی بہو کی یہ حرکت بالکل پسند نہیں ہے۔ راشد گھر لوٹتا تو حسب معمول اپنی امی سے پوچھتا۔ "ہر طرح خیریت ہے نا امی؟"

"ہاں خیریت ہی خیریت ہے۔ یہ تمہاری بیوی کو بھوک لگتی ہے نہ پیاس۔"

راشد ہنس پڑتا۔ "امی! آپ کیا جانیں میری بیوی کتنی صابر و شاکر ہے۔"

راشد قہقہہ لگا کر اس تلخی کو اپنی طرف سے ختم کر دیتا جس کا احساس اس کی امی کے لفظوں سے ہوتا تھا مگر آہستہ آہستہ خود بھی اس کے دل میں ایک ناخوشگوار ساجذبہ سر اٹھانے لگا تھا۔ فصیحہ کچھ زیادہ کھوئی کھوئی سی رہنے لگی تھی۔ کبھی کبھی وہ اس طرح اپنے اندر ڈوب جاتی تھی کہ شوہر کی آمد کا بھی اسے احساس نہیں ہوتا تھا۔

"فصیحہ! کیا حال ہے؟"

فصیحہ اسے یوں دیکھتی جیسے اس کے شوہر نے اس کے خیالوں کی دنیا پر چھاپہ مار دیا ہو۔

راشد اس کے پاس جا کھڑا ہوتا۔

"کتنے خوبصورت مناظر ہیں۔"

"ہوں!"

"آؤ باہر چلیں۔" وہ اس سے کہتا۔

"یہاں سب کچھ نظر آجاتا ہے۔ باہر جانے کی کیا ضرورت ہے۔" وہ اسے ٹال دیتی۔

راشد اپنا چہرہ اس کے بالکل قریب لے آتا۔ اس کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کرتا مگر وہاں اسے سوائے ایسے سایوں کے جو شام ہوتے ہی گھنان درختوں کی شاخوں میں اتر آتے ہیں اور کچھ بھی محسوس نہ ہوتا۔

اس کے ذہن میں خیال آتا۔ کیا یہ اپنے عزیزوں سے دور ہو گئی ہے، اس وجہ سے اس طرح چپ چاپ اور اداس سی رہتی ہے۔ کیا میں اسے وہ توجہ نہیں دے سکا جو مجھے دینا

چاہیئے تھی۔ وہ اپنے اس شبہ کا اظہار کر دیتا۔

"نہیں راشد! تم نے مجھے بھرپور توجہ دی ہے۔ میں تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتی۔"

راشد اور کوئی بات نہ کہتا اور اسلام آباد کے ایک کوارٹر کی کھڑکی سے دو چہرے لگے اس وقت تک اپنی نگاہیں ادھر ادھر، قریب اور دور بکھیرتے رہتے جب تک ابتدائی رات کے اندھیرے گہرے ہو کر اردگرد کے مناظر کو اپنے دامن میں ڈھانپ نہ لیتے۔

اس دن راشد اور فصیحہ کی شادی کی چوتھی سالگرہ تھی۔ راشد، فصیحہ کے لیئے ایک نئی ساڑھی اور کیک لئے شام سے پہلے گھر آ گیا۔ صحن میں اس کی امی کھڑی تھیں اور انہوں نے گود میں بسلائے کا ایک شیرخوار بچہ اس طرح اٹھا رکھا تھا کہ ان کے ہونٹ اس کے ماتھے کو چھو رہے تھے۔

راشد کو اندر آتے ہوئے دیکھ کر اس کی امی نے جلدی سے اپنے چہرے کا رخ دوسری طرف کر لیا مگر راشد کو ایک ہی لمحے میں ان کی آنکھوں میں جھلکتی ہوئی حسرت کا اندازہ ہو گیا تھا۔ اس نے ان سے کچھ نہ کہا۔ کمرے میں گیا۔ فصیحہ کھڑکی کے پاس نہیں تھی۔

دوسرے کمرے میں ہو گی۔ اس نے سوچا اور دروازے سے نکلتے ہی دالان کا اس کے کان میں ہلکی سی آواز آئی۔ کمرے میں قدرے اندھیرا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر بجلی کا بلب روشن کیا۔

فصیحہ کی کرسی دیوار کے ساتھ لگی ہوئی تھی اور وہ سامنے دیکھ رہی تھی، کمرے کی دوسری کھڑکی میں سے جو صحن میں کھلتی تھی۔

"فصیحہ!" راشد نے بیوی کو مخاطب کیا۔

فصیحہ اسی طرح کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی

راشد اس کی طرف قدم اٹھانے لگا۔

"فصیحہ! کیا ہے ـــــ" وہ اس کی طرف جھکا تا کہ ساڑھی کا پیکٹ اس کے حوالے کر دے کروں

لگا جیسے فصیحہ کا اندرونی بند ٹوٹ گیا ہے۔ وہ رونے لگی۔

"فصیحہ! دیکھو — دیکھو تو —"

"کیا تم نے شادی سے پہلے مجھے دیکھا نہیں تھا کیوں لے آئے مجھے۔ مجھ بیکار وجود کو۔ مجھ اپاہج کو — اس میں میرا کیا قصور ہے، کیا جرم کیا ہے میں نے کیا فریب دیا ہے تم لوگوں کو میں کچھ نہیں دے سکی۔ میں کچھ نہیں دے سکتی۔"

بے اختیار آنسو اس کی آنکھوں سے اور الفاظ اس کے ہونٹوں سے بہتے چلے جا رہے تھے۔ اس کا سارا بدن بری طرح کانپ رہا تھا۔ لگتا تھا کہ وہ اسی طرح کانپتی رہی تو وہیل چیئر سے گر پڑے گی۔

راشد نے پیکٹ پلنگ پر رکھ دیا اور اس کا بازو تھام لیا۔

"نہیں فصیحہ! ایسا نہیں کہتے۔"

"میں نے کب کہا تھا کہ مجھے اپنی زندگی میں لے آؤ۔ میں نہیں چاہتی تھی۔ میں کچھ بھی نہیں چاہتی تھی۔ کیا مجھے پتھر کا ٹکڑا سمجھ رکھا ہے کہ میں خالہ جان کی حسرت نہ سمجھ سکوں۔ تمہاری آرزو نہ جان سکوں۔ میں — بیکار ہستی، جلا ہوا کوئلہ — میں — اوہ میرے اللہ۔ میں مر کیوں نہ گئی۔ مر کیوں نہ گئی۔"

راشد نے اس کا دوسرا ہاتھ بھی پکڑ لیا۔

"فصیحہ تم بہت کچھ ہو۔ تم سب کچھ ہو۔ میں کہتا ہوں فصیحہ! تم میں کوئی کمی نہیں۔ تم ہزاروں میں ایک ہو۔"

فصیحہ کا رہا سہا ضبط بھی ختم ہو گیا۔ اس کے آنسو تھمتے ہی نہیں تھے۔ اس کے اندر شکست وریخت کا عمل تیزی سے جاری تھا۔

"راشد! راشد کی امی کی آواز گونجی۔ وہ ان کی طرف آ رہی تھیں۔

"آخر یہ کیا تماشا ہے۔ ہم نے اس کے ساتھ کیا بے انصافی کی ہے۔ اسے کیا کچھ نہیں دیا۔ اسے

کبھی سخت بات کہی ہے۔ کبھی بدسلوکی کی ہے۔ اس کا کوئی حق چھینا ہے اس نے ہم سے ہماری آرزوئیں چھین لیں۔ ہم نے تو اس سے کچھ نہیں چھینا۔

راشد بیوی کا بازو اور ہاتھ چھوڑ کر اپنی ماں کی طرف بھاگا۔

"امی کیا کرتی ہیں آپ — خدا کے لئے خاموش رہیے چپ ہو جایئے امی!" اور وہ ماں کو دروازے کی طرف لے جانے لگا۔

"میں پوچھتی ہوں۔ یہ لڑکی چاہتی کیا ہے آخر؟"

"کچھ نہیں چاہتی امی — کچھ نہیں چاہتی — خدا کے لئے امی — جایئے۔ امی جایئے۔" امی باہر جانے لگیں۔

"ہم نے تو اسے سینے سے لگا لیا تھا۔ زمین پر گری ہے تو گرے۔"

ماں چلی گئیں ان کی آواز باہر سے بھی آ رہی تھی۔ لیکن راشد نے اس کی طرف سے گویا کان بند کر لئے تھے۔ وہ بیوی پر جھکا ہوا تھا۔ نصیحہ کا بدن اب کانپ نہیں رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے جو کچھ نکلنا تھا وہ شاید نکل چکا تھا۔ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ بے حس بے جان راشد ڈر گیا۔ اسے بیوی کی یہ کیفیت خطرناک لگی۔ وہ اس کی ساری توجہ، سارا دھیان ایک ایسے موضوع یا معاملے میں منتقل کر دینا چاہتا تھا کہ اس کے دل میں پھیلی ہوئی تلخی ختم ہو جائے۔ اس نے ساڑھی پلنگ سے اٹھا کر اس کی گود میں رکھ دی۔

"میری طرف سے تمہیں پسند آئی؟"

"مہربانی۔ شکریہ۔"

"واقعی تمہیں پسند ہے؟"

نصیحہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اس کی بیوی کی کیفیت اطمینان بخش تھی لیکن ایک اندرونی خوف تھا جو راشد کے باطن میں رینگ رہا تھا۔

راشد کو نصیحہ آنے والے دنوں میں بالکل نارمل نظر آئی۔ اس کی کوئی حرکت، کوئی بات خلاف معمول محسوس نہ ہوئی۔

سال کا آخری ہفتہ گزر رہا تھا۔ ان دنوں بنک کا کام بہت بڑھ جاتا ہے۔ راشد ہر روز دیر سے گھر آتا تھا۔ اور ایک شام وہ سات بجے کے قریب آیا تو پہلی ہی نظر میں اس کی چھٹی حس نے اسے بتا دیا کہ کچھ ہو چکا ہے۔

اس کی امی باورچی خانے میں تھیں۔ ملازمہ بازار سے کچھ سودا لاکر باورچی خانے کی طرف جا رہی تھی۔

"نصیحہ کہاں ہے؟" اس نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

ملازمہ کچھ کہنے کے لئے رکی ہی تھی کہ باورچی خانے سے اس کی امی باہر آگئیں۔

"چلی گئی ہے۔"

"کون امی؟" راشد کو یقین نہیں آیا تھا کہ نصیحہ اس انداز سے چلی جائے گی۔

"کون جا سکتی ہے۔ اس گھر میں میرے تیرے سوا اور کون رہتا ہے؟"

"پر امی! اس نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی تھی۔"

"کیوں کرتی — مجھ سے رسمی طور پہ کہا تھا۔ میں جا رہی ہوں۔ اس کا بھائی ٹیکسی لے کر آیا تھا۔ تمہاری جیتی نے خط لکھ دیا ہوگا۔ باقاعدہ منصوبہ بنا کر آیا تھا۔"

اور اس کی امی ایک بار پھر پھٹ پڑی۔

"یہ ناز۔ یہ غرور۔ ہے کیا آیا ہیچ۔ اللہ بچائے ایسے لوگوں سے۔ نہ کسی کے احسان کا خیال۔ نہ اپنی بے کسی کا احساس — ہونہہ —" اس کی امی بولے جا رہی تھیں۔ وہ جلدی سے کمرے کے اندر گیا اور دروازہ بند کر لیا۔

تین ماہ گزر گئے بالکل خاموشی سے۔ راشد لاہور نہ گیا۔ ادھر سے بھی کوئی اطلاع نہ ملی۔ چوتھے مہینے کے دوسرے ہفتے کا پہلا دن گزر رہا تھا کہ وہ بنک سے گھر آیا تو اس کی امی

نے اسے ایک خط دیا۔ یہ خط نعیمہ کی طرف سے آیا تھا۔ بہت مختصر۔ صرف ایک سطر لکھی تھی۔

"میں انتظار کر رہی ہوں۔ آجائیے۔ خط میں اور کچھ نہیں لکھ سکتی۔"

اس نے خط پڑھا۔ دوسری مرتبہ پڑھا۔ اس کی امی اسے گھور گھور کر دیکھ رہی تھیں۔

"کیا ارادہ ہے؟" ماں نے سوال کیا۔

"اس نے مجھے بلایا ہے۔"

ان کا چہرہ یک لخت سرخ ہو گیا۔ "تم نہیں جاؤ گے۔ کیا ہم نے اسے گھر سے نکالا تھا۔ کیا ہم نے اشارہ بھی کیا تھا کہ اپنے میکے چلی جاؤ۔ خود گئی ہے۔ خود آئے۔"

"مگر امی۔ دیکھئے تو۔"

"کیا دکھانا چاہتے ہو اب۔ تم نے جو کہا وہ کر دکھایا۔ میں نے کوئی رکاوٹ ڈالی؟ تم کو منع کیا ــــ میں نے تو اس کے ساتھ اپنی محرومیوں کو بھی گلے سے لگا لیا۔ اور کیا چاہتے ہو۔ خود آئے۔ اس گھر کا دروازہ کھلا ہے۔ نہیں آتی تو نہ آئے۔"

اس نے ماں کی آنکھوں میں آنسو یا تو اس وقت دیکھے تھے جب اس کا باپ دنیا سے رخصت ہوا تھا یا اب دیکھ رہا تھا۔

"رو نہیں امی، رو نہیں۔" اور وہ ماں سے لپٹ گیا۔

خالی خالی کمرہ اداس دیواریں، فضا میں ایک گہرا کرب بسا ہوا۔

راشد خود کو بے اختیار کرسی میں گرا دیتا۔

کیا اس کمرے کی رونق اس سے تھی؟ اس کی شخصیت میں کتنا اثر تھا کہ اس نے اس کمرے کو اپنی ذات میں جذب کر لیا تھا۔ وہ نہیں ہے تو یہ سب کتنا بے جان، ویران، غم زدہ محسوس ہوتا ہے۔

وہ آنکھیں بند کر کے کھڑکی کے پاس بیٹھا رہتا۔ امی کھانے کے لیے آواز دیتیں تو وہ بوجھل

قدموں سے میز پہ جاتا۔ چپ چاپ نوالے منہ میں رکھتا رہتا۔ ماں پوچھتی، "کیوں بیٹا۔ خیر تو ہے۔"

"میں، وہ۔ امی! ٹھیک ہوں۔ ٹھیک ہی تو ہوں۔"

"کھانا اتنی بے دلی سے کیوں کھا رہے ہو۔ اچھا نہیں کیا۔ یہ رانی کی بچی، دھیان سے کھانا نہیں پکاتی۔

"کھانا مزیدار ہے۔ وہ امی۔ ذرا ایک دوست نے چائے کے ساتھ کئی چیزیں کھلادی تھیں۔"

ماں مسکرانے لگیں۔

"یہ تمہارا ایک دوست ہے روز اتنی ساری چیزیں کھلا دیتا ہے۔"

اس صبح وہ بنک جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ اسے یاد آیا کہ آج اسے پنڈی میں ایک میٹنگ میں شامل ہونا ہے۔ وہ ایک گھنٹہ بنک میں صرف کرنے کے بعد وہ ویگن میں بیٹھ کر پنڈی روانہ ہو گیا۔

میٹنگ مقررہ وقت سے پہلے ہی ختم ہو گئی۔ وہ دفتر سے باہر آیا اور ویگن کا انتظار کر رہا تھا کہ اچانک اس کا سانس تیز تیز چلنے لگا۔ اس سے چند قدموں کے فاصلے پہ ایک شخص وہیل چیئر کو دھکیل رہا تھا۔ کرسی پر ایک جوان عورت بیٹھی تھی۔

وہ مسلسل اس منظر کو دیکھتا رہا یہاں تک کہ وہ دونوں ۔۔ کرسی اور اسے حرکت دینے والا۔ دونوں اسغر بال کے ہجوم میں غائب ہو گئے۔ اس کے اندر ایک گرم رو چل رہی تھی جس کی حدت بڑھتی جا رہی تھی ۔۔۔ لحہ بہ لحہ بڑھتی جا رہی تھی۔

اسے معلوم ہی نہ ہو سکا کہ کب ویگن آئی اور اس کے قریب چند منٹ رک کر آگے بڑھ گئی۔ اور پھر وہ اچانک لاہور جانے والی ویگن میں سوار ہو گیا۔

اس کی ٹیکسی موہنی روڈ کے ایک پرانے مکان کے دروازے پہ رک گئی۔ کال بیل پہ انگلی رکھ کر وہ دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔

دروازہ کھل گیا۔ اس کی نظریں رفیعہ کی نظروں سے ٹکرائیں۔
رفیعہ نے اس سے ایک لفظ تک نہ کہا اور دروازے کے ایک طرف ہٹ گئی۔ وہ اندر گیا۔ رفیعہ اس کے آگے آگے آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہی تھی۔

ڈرائینگ روم میں پہنچ کر دونوں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔

"آپ آگئے ہیں ——" رفیعہ نے پہلی مرتبہ منہ دوسری طرف پھیر کر کہا۔

"فصیحہ ——"

"نہیں مل سکتے۔"

"مجھے ندامت ہے رفیعہ —— خط بھی مل گیا تھا —— اس سے کہو۔"

رفیعہ دوسری طرف دیکھ رہی تھی۔

"وہ اگر دنیا میں ہوتی تو ——"

راشد کو سانس اپنے سینے میں رکتا ہوا محسوس ہوا۔

"ہسپتال میں آپریشن ہوا —— اور —— وہ کمرے سے نکل گئی۔"

راشد صوفے کے قریب کھڑا تھا۔ کمرے کی ہر چیز اس کے سامنے گھوم رہی تھی۔ اسے رفیعہ کی آواز کسی دور دراز مقام سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

"اس نے کہا تھا۔ جب بھی تم آؤ —— یہ امانت تم کو دے دی جائے۔"

راشد نے سامنے دیکھا۔

رفیعہ چادر میں لپٹی ہوئی کوئی شے بازوؤں میں سنبھالے کھڑی تھی

"اس نے کہا تھا۔ مجھے معاف کر دینا۔ میں آپ کو کچھ نہ دے سکی۔"

بچہ رونے لگا تھا۔ رفیعہ اسے اٹھائے اپنی جگہ پر کھڑی تھی اور اس کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے۔

اندرونی طوفان پر قابو پانے کی کوشش میں اس کے چہرے کی لکیریں ابھر آئی تھیں۔ ڈھیلے ڈھیل سے گئے تھے۔

راشد کو معلوم ہی نہ ہو سکا کہ کس وقت وہ آگے بڑھا۔ کب اس نے اپنے بازو پھیلائے اور کب روتے ہوئے بچے کو اپنے سینے سے لگا لیا۔

علیا کی تتلی

وہ دن جمعرات کا تھا۔ رات کے پچھلے پہر ہی سے فضا میں بادل اُمڈے چلے آرہے تھے اور لحہ بہ لحہ ان میں اضافہ ہو رہا تھا صبح سے شام تک ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہا تھا کہ ابھی موسلا دھار بارش شروع ہو جائے گی اور جو لوگ گھروں سے باہر کام کاج میں معروف ہیں ان کے لئے واپس آنا ایک مسئلہ بن جائے گا۔ یہی وجہ تھی کہ ناصر علی چشتی دن بھر اپنے کمرے میں بیٹھا بور ہوتا رہا اور بے کیفی کے عالم میں وقت گزارتا رہا۔ وہ جب سے ریلوے کے محکمے میں سینتیس برس مختلف عہدوں پر فائز رہ کر ریٹائر ہوا تھا۔ دن کے تین چار گھنٹے لازماً اپنے پرانے اور نئے احباب سے ملاقات کرنے اور اِدھر اُدھر گھوم پھر کر گزارتا تھا۔ ایک لمبی مدت تک گرفتارِ قفس رہنے کے بعد اسے آزادی ملی تھی اور وہ اس آزادی سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ اب اس پر کسی قسم کی پابندی عائد نہیں ہو سکتی تھی۔ بچے برسرروزگار تھے۔ کسی کا وجود بھی اس پر بوجھ نہیں تھا۔ بیوی ذہین، سلیقہ مند اور متحمل مزاج خاتون تھی جو ناگوار سے ناگوار ماحول میں بھی خوش رہ سکتی تھی۔ اس لئے وہ ریٹائرمنٹ کے بعد بے فکری کی زندگی بسر کر رہا تھا۔

اس روز وہ گھر سے باہر نہ نکل سکا تو اسے بڑی کوفت ہوئی وہ سمجھ چکا تھا کہ اب مزید انتظار کرنا فضول ہے اور وہ باہر جانے کی تیاری کرنے لگا کہ بارش ہونے لگی۔ اس حالت میں وہ کیسے کہیں جا سکتا تھا!

بارش دو گھنٹے کے بعد تھم گئی۔ چشتی نے رسٹ واچ پر ایک نظر ڈالی۔ ۹ بج چکے تھے۔ وہ گیارہ

سے پیشتر پلنگ پر لیٹتا نہیں تھا۔ ایک گھنٹہ مطالعے کے بعد اس کی آنکھوں میں نیند آتی تھی۔ گویا ابھی سو جانے کی کوئی تک نہیں تھی۔ اس نے رین کوٹ پہنا، چھڑی ہاتھ میں لی اور اپنی بیوی کو اطلاع دے کر گھر کے دروازے سے نکل گیا۔

بادلوں کا ہجوم فضا میں معلق تھا۔ ہوا سرد تھی اور سڑکوں بازاروں میں پندرہ بیس منٹ کے بعد اکا دکا آدمی دکھائی دے جاتا تھا دن بھر کی کوفت دور کرنے کا ایک مناسب ذریعہ اس نے یہی خیال کیا کہ چلتا چلا جائے اور جب تک تھک نہ جائے واپس نہ آئے۔

اسے معلوم نہ تھا کہ وہ کہاں پہنچ گیا ہے، اچانک اس کے کان میں انجن کی سیٹی گونج اٹھی اس وقت اسے احساس ہوا کہ وہ سٹیشن کے قریب آ گیا ہے۔ تھوڑی دیر وہ مسافر خانے میں پھرتا رہا۔ تھکاوٹ محسوس کر کے ایک بنچ پر بیٹھ گیا اور پھر واپس جانے لگا۔

اپنے گھر کے دروازے سے کچھ دور رک کر اس نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ گیارہ بجنے میں تین منٹ باقی تھے: "دو گھنٹے گھومتا رہا ہوں۔۔۔" یہ بات اس نے اپنے آپ سے اس مقصد کے زیر اثر کہی کہ اب وہ تھک گیا ہے تو اس میں حق بجانب ہے۔

اپنے کمرے میں جا کر اس نے کوٹ اتار کر کرسی کے بازوؤں پر پھیلا دیا۔ چھڑی کونے میں رکھی۔ شب خوابی کا لباس پہننے ہی والا تھا کہ کمرے کی کھڑکی میں سے ڈرائینگ روم میں روشنی دکھائی دینے لگی۔

"رات کے گیارہ بجے ڈرائینگ روم میں روشنی!" اسے حیرت ہوئی۔ گھر میں اس کی بیوی کے سوا اور کوئی نہیں تھا اور رضیہ دیر تک یا دورچی خانے میں ہی مصروف رہتی تھی یا باورچی خانے کے باہر سلائی وغیرہ کا کام کرتی تھی۔ ڈرائینگ روم میں نہیں جاتی تھی تو آج ڈرائینگ روم میں روشنی کا مطلب! کیا کوئی مہمان آ گیا ہے یا کہیں گھر میں کسی کی طبیعت تو نہیں خراب ہو گئی ہے اسی اثنا میں دروازے کا پردہ ہٹا کر رضیہ آ گئی۔

"ایک صاحب پورے ایک گھنٹے سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔" رضیہ نے اسے بتایا۔

"کون ہیں؟" چشتی نے پوچھا۔

رضیہ اپنے شوہر کے اکثر احباب کو جانتی تھی۔ ان کی بیویاں اس کی سہیلیاں تھیں۔ کوئی دوست آتا تھا تو وہ اس کا نام لے کر ہی آنے کی خبر سناتی تھی۔

چشتی نے بیوی کو اس انداز سے دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو کیا تم اسے نہیں جانتیں۔ رضیہ نے اس کی نظروں کا مفہوم سمجھ لیا۔ بولی: "نہیں۔ میں نے آج تک اسے نہیں دیکھا تھا۔"

"کون ہے یہ شخص جو ایسے خراب موسم میں ایک گھنٹے سے اس کا منتظر ہے۔" اس نے خود سے سوال کیا اور ڈرائینگ روم کی طرف جانے لگا۔ "چلو۔ دیکھتا ہوں۔" شوہر کی زبان سے یہ لفظ سن کر رضیہ دروازے سے ہٹ گئی۔ اور اس غرض سے کھانے کی میز کے سامنے الماری میں سے چائے کے برتن نکالنے لگی کہ شاید اب اسے مہمان کے لئے پیالے تیار کرنی ہوگی۔

جب تک وہ برتن نکالے چشتی ڈرائینگ روم کے اندر جا چکا تھا۔ اس نے دیکھا کہ کرسی پر ایک بوڑھا آدمی بیٹھا ہے۔ لباس بہت سادہ، سر اور داڑھی کے بال بڑھے ہوئے۔ چشتی کو اندر آتے دیکھ کر وہ کھڑا ہو گیا۔

چشتی اپنی زندگی میں اسے پہلی مرتبہ دیکھ رہا تھا۔

"تشریف رکھیے۔" اس نے تکلفاً کہا اور کرسی کے پہلو میں صوفے پر بیٹھ گیا۔

"آپ ناصر علی چشتی ریل کے افسر ہیں نا؟" اس فقرے سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ کہنے والا اَن پڑھ ہے۔

"جی ہاں۔ فرمایئے اس وقت کیسے تکلیف فرمائی؟"

اجنبی نے ذرا غور سے چشتی کے چہرے کو دیکھا۔ اور بولا "ہسپتال میں ایک بیمار نے آپ کو بلایا ہے جی۔"

"ہسپتال میں ایک بیمار نے مجھے بلایا ہے۔ کون ہے وہ؟" چشتی نے پوچھا۔

اجنبی چند لمحے خاموش رہنے کے بعد کہنے لگا "آپ خود دیکھ لیں گے۔"

چشتی کے ذہن میں فوراً خیال آیا کہ اس کا کوئی دوست ٹریفک کے حادثے میں زخمی ہو گیا ہے یا ایسا حادثہ کسی عزیز کے ساتھ پیش آیا ہے بولا "مہربانی کر کے صاف کہیے کون ہیں وہ صاحب؟"

اجنبی نے وہی جواب دیا جو وہ پہلے دے چکا تھا۔

چشتی کے ذہن میں ایک کشمکش سی برپا ہو گئی۔ اسے جانا چاہیئے یا نہیں۔ اجنبی کے متعلق اس کے ذہن میں یہ تاثر بھی ابھرا کہ ممکن ہے کہ وہ کسی خاص منصوبے کے تحت اسے گھر سے باہر لے جانا چاہتا ہو۔ اور یہ احساس بھی پیدا ہوا کہ شاید کسی واقف کار کو جو اس وقت ہسپتال میں ہے، اس کی ضرورت پڑ گئی ہو اور اس نے اسے بلوایا ہو۔

اجنبی نے اس کے خیالات اس کے چہرے کے تاثرات سے بھانپ لئے تھے۔ کہنے لگا۔
"جناب، اللہ جانتا ہے میں آپ کو دھوکا نہیں دے رہا ہوں آپ کو دھوکا دے بھی کیسے سکتا ہوں۔ خدا کے لئے دیر نہ کیجئے۔ کیا پتا وہ ...."

چشتی نے دیکھا کہ یہ الفاظ کہتے ہوئے اس کی آواز گلوگیر ہو گئی ہے اور اس کے چہرے پر کرب اور دکھ کے گہرے سائے لہرانے لگے ہیں۔

ایک منٹ تک دونوں خاموش بیٹھے رہے چشتی کی کشمکش مدھم پڑ گئی۔ اس نے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے سوچا اگر بیوی سے اس سلسلے میں مشورہ طلب کرتا ہے تو وہ اسے ہرگز جانے نہیں دے گی۔ آدھی رات کو ایک اجنبی کے کہنے پر اس کے ساتھ گھر سے نکل جانا وہ کسی صورت میں مناسب نہیں سمجھے گی مگر اس کا دل کہتا تھا یہ شخص جھوٹ نہیں بول رہا۔

"چلئے صاحب! بہتر یہ تھا کہ آپ مجھے صحیح بات بتا دیتے۔ اس صورت میں ... خیر"
اجنبی نے اس کا دایاں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ "اللہ جانتا ہے ایک بیمار ہی نے آپ کو بلایا ہے، اس کی حالت بہت خراب ہے۔"

چشتی ڈرائنگ روم سے باہر نکلا۔ کچن کی لائٹ آف ہو چکی تھی۔ رضیہ خواب گاہ میں

چلی گئی تھی کیونکہ چشتی نے اسے چائے بنانے سے روک دیا تھا۔اس نے کوٹھی کے عقبی حصے میں جاکر راجو کو جگایا اور اسے ہسپتال چلنے کے لئے کہا۔

راجو نے پوچھا "کیوں صاب جی! خیر تو ہے۔

"خیر ہے راجو میاں! خیر ہے۔فکر کی کوئی بات نہیں۔فوراً چلو؟"

اجنبی اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور چشتی پچھلی سیٹ پر۔راجو کی بیوی نے کوٹھی کا مین گیٹ بند کر لیا۔گاڑی اسٹارٹ ہوئی تو بوندا باندی ہو رہی تھی اور جب وہ کچھ آگے بڑھی تو اچھی خاصی بارش ہونے لگی۔پندرہ سولہ منٹ بعد گاڑی ہسپتال کے اندر داخل ہو گئی۔گاڑی میں سے پہلے اجنبی اترا پھر چشتی باہر آیا۔ڈرائیور باہر نکل کر گاڑی کے پاس کھڑا ہو گیا۔اب کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں تھا مگر رہ رہ کر چشتی کے ذہن میں یہ خیال ابھر آتا تھا کہ آخر یہ معاملہ کیا ہے کسی شخص نے اسے اپنے پاس بلایا ہے!

اجنبی آگے آگے چلا جا رہا تھا اور چشتی پیچھے پیچھے۔یہ میو ہسپتال کی یا انکوٹ وارڈ تھی جس کے اندر اجنبی چشتی کو لے گیا تھا۔ایک بیڈ کے قریب پہنچ کر اجنبی کے قدم رک گئے۔اس بیڈ پر ایک بوڑھا شخص پڑا تھا۔سخت نحیف و نزار ہڈیوں کا ڈھانچہ۔اس آدمی کو بھی اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"چشتی صاحب! اسے پہچانتے ہیں؟"

چشتی ٹکٹکی باندھے اس اجنبی کو دیکھنے لگا۔مریض نے بیٹھنے کی سعی ناکام کی۔اس کا سر تکیے سے ذرا اوپر ہوا اور پھر گر پڑا۔فرطِ نقاہت سے اس کا چہرہ بالکل بے جان نظر آ رہا تھا۔

"یہ کون ہے؟" چشتی کے ذہن سے اس کی اپنی آواز ٹکرائی ۔ ۔ ۔ "آخر یہ کون ہے؟" آواز دوسری مرتبہ ٹکرائی۔مریض کی آنکھیں بند ہو گئی تھیں اور پہلا اجنبی اس کے سر کے نیچے تکیہ درست کر رہا تھا۔

جب سوال دوسری مرتبہ چشتی کے دماغ میں اُبھرا تو اپنے پیچھے ایک مبہم سی ایک غیر واضح سی حقیقت کا نقش بھی چھوڑ گیا۔"ان لوگوں کو ضرور غلط فہمی ہوئی ہے۔یہ اجنبی غلط آدمی کو لے آیا

ہے۔ میرا اس مریض سے کوئی تعلق واسطہ نہیں ہے۔ میں نے اس سے پیشتر اپنی پوری زندگی میں اسے کبھی دیکھا ہی نہیں۔"

مریض کے چہرے پر ایک کھنچاؤ سا آ گیا تھا۔ شاید اس وجہ سے کہ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا اور کہہ نہیں سکتا تھا۔ پہلے اجنبی نے تکیہ درست کر لیا تھا اور اب وہ چشتی کو اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے پوچھ رہا ہو "کیوں آپ نے اسے پہچان لیا ہے۔" چشتی بدستور حیران و پریشان کھڑا تھا۔ اچانک ٹن کی سی آواز آئی اور چشتی نے دیکھا کہ اجنبی نے مریض کے تکیے کے پاس پڑی ہوئی ایک ٹلی کو اٹھایا اور اسے ٹیبل کے اوپر رکھ دیا۔ ہسپتال میں ایسی ٹیبل مریض کو اپنی چیزیں رکھنے کے لئے ہسپتال کی انتظامیہ کی طرف سے دی جاتی ہے۔

"ٹن ٹن ٹن ٹن" چشتی کے کانوں میں ٹلی کی آواز مسلسل گونجنے لگی اور مریض کے بکھرے ہوئے نقوش ایک دوسرے سے پیوست ہو کر ایک چہرے کے خدوخال میں منتقل ہونے لگے۔ وہ ہسپتال کے ماحول سے دور ہونے لگے۔ دور ہوتا چلا گیا اور ایک منظر اس کی نگاہوں کے سامنے پھرنے لگا۔

ایک دوپہر، چلچلاتی ہوئی دھوپ۔ چشتی اس روز ذرا علیل تھا۔ دفتر نہیں جا سکا تھا۔ چھت کا پنکھا فل سپیڈ پر چھوڑ کر کھڑکی کے پاس بیٹھا تھا۔ اتنے میں نیچے سڑک پر ادھیڑ عمر کا ایک شخص ڈھول بجانے والے کے ساتھ ٹلی بجاتا ہوا گزر رہا تھا۔ وہ کسی فرم کے سفید اور ارزاں آٹے کا اعلان کر رہا تھا۔ ٹلی والے نے چشتی کو دیکھا تو رک کر ٹلی بائیں ہاتھ میں لے کر دائیں ہاتھ کی ہتھیلی ہونٹوں سے لگانے لگا۔ صاف ظاہر تھا کہ پانی مانگ رہا ہے۔

چشتی فوراً اٹھا، نیچے آیا اور ٹلی والے کے ساتھ ڈھول والے کو بھی ڈرائنگ روم میں لے آیا۔ دونوں کو دو دو گلاس شربت کے دیئے۔ اور وہ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد شکریہ ادا کر کے چلے گئے۔

"کیا یہ وہی ٹلی والا ہے؟ یقیناً وہی ہے۔

اجنبی نے تیسری مرتبہ اسے استفسار طلب نظروں سے دیکھا تو چشتی میں ایک ایسی تبدیلی آگئی کہ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا گویا اسے پہچان چکا ہے۔ "کب سے یہ حالت ہے؟" چشتی نے پوچھا۔

اجنبی نے اپنے دائیں ہاتھ کی پانچوں انگلیوں کو لہرا دیا۔ اس کا مطلب پانچ ماہ بھی ہو سکتا تھا اور پانچ دن بھی۔ مریض نے آنکھیں کھول دی تھیں۔ اس نے سر کو ذرا جنبش دی۔ اجنبی نے جھک کر اپنا دایاں کان اس کے ہونٹوں کے قریب کر دیا۔ مریض کی آواز بہت نحیف اور کمزور تھی۔ چشتی کو کچھ بھی سنائی نہ دیا۔

اب اجنبی نے اپنا کان مریض کے ہونٹوں سے ہٹا لیا اور بولا" علیا کہتا ہے۔ میں مر رہا ہوں۔ ڈاکٹر نے جواب دے دیا ہے ـــــ یہ ٹلی میری روح ہے ـــــ میں اسے کسی کو نہیں دے سکتا۔ یہ مجھے بہت ہی پیاری ہے۔ یہ میری نشانی ہے آپ کو دیتا ہوں" مریض نے ٹلی پر ہاتھ رکھ دیا۔ پھر اسے ذرا اوپر اٹھا لیا۔

"لے لو باؤ" اجنبی نے کہا۔ چشتی نے ٹلی اپنے ہاتھ میں پکڑ لی۔

" پر اس کا کوئی بیٹا بیٹی ؟"

مریض نے چشتی کو کچھ کہتے ہوئے پایا تو اجنبی کو انگلی کے اشارے سے قریب بلایا۔

"باؤ کہتا ہے علیا کا اپنا کوئی بیٹا ـــــ" اجنبی نے ذرا لہک کر کہا۔

مریض نے تو کچھ نہ کہا، اجنبی بولا: "دنیا میں صرف ایک بیٹا ہے"

مریض کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے ـــــ اس کا سارا جسم کانپنے لگا۔

" چلو باؤ ـــــ علیا کی حالت بہت خراب ہو گئی ہے"۔ اور اجنبی چشتی کو گاڑی کے پاس چھوڑ کر واپس اپنے مریض کی طرف جانے لگا۔

گاڑی کب سٹارٹ ہوئی، کس رفتار سے چلی، کن راہوں سے گزری، چشتی ان باتوں سے بے خبر تھا۔ وہ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھا تھا ٹلی اس کے پہلو میں پڑی تھی اور وہ ابھی تک اپنی

آنکھوں کے سامنے اس کمزور ضعیف اور بے بس مریض کو دیکھ رہا تھا جس نے اسے یہ ٹلی دی تھی۔ کیا وہ اسے اپنے کسی وارث کے سپرد نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا اپنا ایک بیٹا بھی تو ہے جس کے ذکر پر اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے تھے۔ کیا وہ بیٹا کہیں بہت دور چلا گیا ہے۔ جہاں سے وہ اپنے مرتے ہوئے باپ کو آخری مرتبہ دیکھنے کے لئے نہیں آ سکتا۔ بیٹا نہ سہی کوئی اور رشتہ دار تو ضرور ہو گا۔ میں نے اس کی پیاس بجھائی تھی۔ یہ بہت معمولی نیکی ہے۔ اس نیکی کا بدلہ اس نے مجھے یہ دیا ہے کہ اپنی ٹلی جو اسے بہت عزیز ہو گی میرے سپرد کر دی ہے۔ میں اسے کیا کروں گا۔ میرے لئے تو یہ ایک بے کار سی شے ہے، کہاں رکھوں گا اسے؟

گاڑی کوٹھی کے دروازے پر رک گئی تھی۔ ایک منٹ گزر گیا تھا اور گاڑی کا پچھلا گیٹ نہیں کھلا تھا۔ چشتی ان خیالوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ خود دروازہ کھول کر باہر نکلتا تھا مگر اس نے کوئی حرکت نہ کی تھی۔ راجو نے باہر نکل کر گیٹ کھولا اس وقت چشتی کو صورت حال کا علم ہوا۔ اس نے ٹلی پکڑی اور باہر آ گیا۔

راجو نے ٹلی کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ "صاب جی! یہ کیا ہے؟"

"کچھ نہیں ــــ دروازہ کھلواؤ۔"

راجو نے کال بیل پر انگلی رکھ دی۔ اس کی بیوی جو غالباً جاگ رہی تھی، اس نے آ کر جلدی سے دروازہ کھول دیا۔ خواب گاہ میں کوئی روشنی نہیں تھی۔ رضیہ کو اس ساری کارروائی کا کوئی علم نہیں ہو سکا تھا۔ چشتی نے ٹلی ڈرائینگ روم کی تپائی پر رکھ دی۔ لائٹ آف کی اور چاہا کہ خواب گاہ میں چلا جائے مگر نہ جانے کیا بات تھی کہ اس کے پاؤں دروازے کی طرف اٹھتے ہی نہیں تھے۔ وہ صوفے پر بیٹھ گیا۔ ایک بار پھر علیا اس کے سامنے آ گیا اور ایک بار پھر وہی سوال اس کے ذہن میں گردش کرنے لگا۔ . . . علیا نے اپنی ٹلی اس کے حوالے کیوں کی ہے؟

وہ قریب قریب ایک گھنٹے تک جاگتا رہا۔ آخر غنودگی ایک غبار کی صورت میں اس کی آنکھوں میں اتر آئی اور وہ وہیں سو گیا۔ اور اس وقت بیدار ہوا جب اس کی بیوی اس کے

اُوپر جھکی ہوئی حیرت زدہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"رات آپ بستر پر نہیں لیٹے؟" رضیہ کو اس کا احساس ہو گیا تھا کیونکہ پلنگ کی پائنتی پر چادر ویسی کی ویسی پڑی تھی۔ اس کا شوہر سوتے وقت چادر اپنے اوپر ڈال لیتا تھا۔ یہ اس کی عادت تھی۔ جشتی نے اسے ساری روداد سنا دی۔

"یہ معاملہ میری سمجھ میں نہیں آسکا۔" وہ بولی۔

"میری سمجھ میں بھی نہیں آیا ـــــ بہرحال وہ ٹلی پڑی ہے۔"

رضیہ نے ٹلی کو غور سے دیکھا۔ "یہ ضرور اسے بہت پیاری ہو گی۔ نیکی کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔"

"تم کہنا یہ چاہتی ہو کہ اس نے ٹلی دے کر اس نیکی کا بدلہ چکایا ہے؟" جشتی نے سوال کیا۔

"وہ اور کیا دے سکتا تھا؟"

رضیہ نے چند سیکنڈ کے لئے ٹلی کو اٹھایا اور پھر اسے وہیں رکھ دیا۔

"آج جمعہ ہے۔ رات آپ ٹھیک طرح سو نہیں سکے، ناشتہ کر کے سو جائیں۔" یہ کہہ کر رضیہ ڈرائننگ روم سے نکل گئی۔

ساڑھے نو بجے تھے جب جشتی ناشتہ کر کے، اخبار پڑھ کر اور تین ضروری خط لکھنے کے بعد فارغ ہوا اور لباس تبدیل کر کے وہ خواب گاہ میں چلا گیا۔ بستر پر لیٹ بھی گیا لیکن اس وقت سونا وہ پسند نہیں کرتا تھا۔ اچانک اسے علیا کا خیال آ گیا۔

"اب اس کی کیا حالت ہو گی ـــــ مجھے ہسپتال جانا چاہیئے۔"

اس کے ذہن میں ایک خلش سی ہونے لگی۔ اس نے ایک جاں بلب مریض کو دیکھا تھا وہ اس سے کیسے بے نیاز رہ سکتا تھا؟ رضیہ سے راجو کے متعلق دریافت کیا تو پتا چلا کہ وہ کسی کام کے لئے بازار گیا ہے۔ تھوڑی دیر تک آ جائے گا۔ جشتی صحن میں آ گیا۔ آدھ گھنٹہ گزر گیا اور راجو نہ آیا۔ جشتی گھر سے باہر آیا کہ رکشا لے کر چلا جائے کہ رات والا اجنبی اسے قریب سے اپنی طرف آتا ہوا دکھائی دیا۔

"باؤجی! علیا نے آپ کو سلام کہا تھا۔" اجنبی نے قریب آ کر کربناک لہجے میں کہا۔
چشتی نے اسے دیکھا۔ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ چہرہ ویران اور افسردہ تھا۔ گالوں پر جا بجا دھبے سے پڑے رہے تھے۔

"آپ چلے آئے تو تھوڑی دیر بعد اس کی حالت خراب ہونے لگی اور جب صبح کے چھ بجے ہوں گے کہ وہ ـــــ"

"مر گیا!" چشتی نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"جی ہاں۔ باؤجی ـــــ"

"بہت افسوس ہوا" چشتی نے یہ الفاظ کہہ کر ایسے انداز سے دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو کہ پھر کیا ہوا

"باؤجی علیا کے بہت سارے دوست ہیں۔ میں نے ایک آدمی کے گھر جا کر اسے بتا دیا اور واپس آ گیا۔ ایک گھنٹے کے اندر تیرہ چودہ لوگ آ گئے اور علیا کو میانی صاحب میں دفنا دیا ـــــ باؤجی علیا نے دو کم پورے پچاس برس تک ٹلی بجائی تھی۔ ہر دنگل میں ہر عرس میں اور ہر میلے میں وہی ٹلی بجاتا تھا۔ فرموں اور کارخانوں کے مالک اپنی چیزوں کی مشہوری کرانے کے لئے اسی کو بلواتے تھے۔ باؤجی، علیا! بڑا بدنصیب تھا بے چارا۔ بیوی جوانی میں مر گئی۔ اس نے دوسرا بیاہ نہ کیا کہ سوتیلی ماں اس کے لڑکے سے اچھا سلوک نہیں کرے گی، پر اللہ کو تو کچھ اور ہی منظور تھا۔ باؤجی، علیا کا بیٹا منظور ابری صحبت سے خراب ہو گیا۔ اس کا بڑا دکھ تھا علیا کو۔ وہ نشہ پانی کرتا ہے، تکیوں میں پڑا رہتا ہے۔" وہ خاموش ہو گیا۔ اس نے سب کچھ ہی اگل دیا تھا۔

"تم اس کے دوست تھے؟" چشتی نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ میرا لنگوٹیا یار تھا جی۔ اگر اس سے پوچھا جاتا کہ سب سے اچھا دوست کون ہے تو وہ ضرور کہتا ابراہیم!"

"تم ابراہیم ہو؟"

"جی ہاں"

"تو ابراہیم ایک بات بتاؤ۔ تم کہتے ہو تم علیا کے لنگوٹیا یار تھے۔"

"سچ کہتا ہوں باؤجی۔" ابراہیم بے تابی سے بولا۔

"میں اسے سچ ہی مانتا ہوں۔۔۔۔ مگر میں ایک بات نہیں سمجھ سکا وہی تم سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ تم سب کو چھوڑ کر علیا نے ٹلی مجھے کیوں دی؟"

ابراہیم کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ یہ سوال سن کر وہ مضطرب ہو گیا ہے۔

"اللہ جانے باؤ۔ یہ بات میں بھی نہیں سمجھ سکا۔ کئی دفعہ اس نے تمہارا ذکر بڑے پیار سے کیا تھا۔ کہتا تھا چشتی صاحب نے شربت پلایا تھا تو میری جان میں جان آئی تھی۔ تمہارا بڑا احسان مانتا تھا باؤجی اور کوئی بات نہیں تھی۔"

ابراہیم کچھ دیر اور بیٹھا رہا وہ علیا ہی کی باتیں کرتا رہا۔ پھر جانے لگا۔

"اچھا باؤجی۔ اللہ تمہارا بھلا کرے علیا کے لئے دعا مانگ دیا کریں۔ بڑا اچھا آدمی تھا باؤجی۔"

"کہاں جاؤ گے؟"

"میں علیا کے لئے کراچی سے آیا تھا باؤجی۔ وہاں میرے دونوں لڑکے رہتے ہیں۔ اچھا کاروبار ہے ان کا۔ ان کے پاس رہتا ہوں۔"

ابراہیم چلا گیا۔

اس روز مہمان آ گئے۔ چشتی میزبانی کے فرائض میں منہمک ہو گیا۔ لیکن وہ سوال بار بار اس کے ذہن میں کھٹکنے لگتا تھا کہ علیا نے اپنی ٹلی اس کے سپرد کیوں کی تھی۔ جب مہمان رخصت ہو گئے اور صرف خواتین رہ گئیں جنہوں نے رضیہ کو گھیر رکھا تھا۔ چشتی فارغ تھا وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ رات کے دس بج چکے تھے وہ دو روز پرانے اخبار کے صفحات پر سرسری نظر ڈالنے لگا۔ ایک خبر پر اس کی نگاہ رک گئی۔ لکھا تھا "علیا ٹلی والا جس نے نصف صدی تک ٹلی بجا کر بے شمار دنگلوں، عرسوں اور میلوں کی رونق بڑھائی تھی۔ رات طویل علالت کے بعد فوت ہو گیا۔ ایک

دلچسپ پہلو یہ ہے کہ سنا جاتا ہے اس نے اپنی زندگی بھر کی رفیق ٹلی اپنے بیٹے یا کسی دوست کو نہیں دی تھی کسی خاص شخص کو بلا کر اس کے حوالے کی تھی۔ جو نرس ڈیوٹی پر تھی اس نے ہمارے نمائندے کو بتایا کہ میں نے اس شخص کو دیکھا ضرور ہے جسے علیا نے اپنی ٹلی دی تھی مگر اسے بالکل نہیں جانتی۔"

اس نے اخبار تہہ کر کے میز پر پھینک دیا۔ "یہ اخبار والے بھی عجیب ہوتے ہیں۔ ہر خبر کو خواہ مخواہ سنسنی خیز بنا دیتے ہیں۔" وہ اپنے کمرے سے نکل کر خواب گاہ کی طرف جانے لگا کہ ٹن ٹن ٹن ٹن کی آواز آنے لگی۔

"یہ ٹلی کون بجا رہا ہے؟" اور وہ ڈرائینگ روم کے دروازے پر پہنچ گیا۔

چند خواتین رہ گئی تھیں جن کی گاڑیاں انہیں لے جانے کے لئے ابھی تک پہنچی نہیں تھیں۔ اس نے دیکھا کہ ٹلی اس کے ماموں کی بیٹی کے ہاتھ میں ہے۔

"بھائی جان! آپا تو جواب نہیں دے سکیں۔ آپ بتائیں گے؟" اس نے پوچھا

"کیا بتاؤں؟"

"بھائی جان! علیا نے اپنی ٹلی آپ کو کیوں دی ہے۔ کیا آپ اس کے دوست رہ چکے ہیں؟"

"نہیں۔ میں کبھی اس کا دوست نہیں رہا تھا۔"

"پھر اپنی ٹلی اس نے مرتے وقت آپ کو کیوں دی؟" لڑکی نے سوال کیا۔

کیا بتاؤں۔ میں نے اس کے ساتھ ایک بہت معمولی قسم کی ہمدردی کی تھی۔ بھلا کسی پیاسے کو پانی وانی پلانا بھی کوئی بڑا احسان ہوتا ہے۔ اس نے اسے بڑا احسان سمجھ لیا۔"

"اچھا!"

"۔۔۔۔ تو اور کیا!"

باہر سے ہارن کی آواز آئی اور خواتین اپنے سروں پر دوپٹے درست کر کے بھاگنے لگیں۔ چشتی نے ٹلی کو اٹھایا اور اسے اپنے کمرے کی الماری میں رکھ دیا۔

صبح بیڈ ٹی کے بعد وہ اخبار دیکھ رہا تھا کہ اس کی نظر ایک عنوان پر ٹھہر گئی۔ عنوان تھا۔ علیا ٹلی والا" اور ابتدائی سطر تھی "اب وہ آواز ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی ہے جو گذشتہ نصف صدی سے گونجتی رہی تھی۔"

چشتی کی آنکھوں میں مسکراہٹ تیرنے لگی۔ اس نے اپنی بیوی کو آواز دی "رضیہ! رضیہ.....!!"
رضیہ جو باورچی خانے میں ناشتہ تیار کرنے میں مصروف تھی، شوہر کی آواز سن کر تیزی سے آ گئی۔ "کیا ہے.....؟"

"رضیہ! ایک عجیب معاملہ ہو گیا ہے۔ میں تو اب سمجھا ہوں کہ علیا ٹلی والا ایک بڑا آدمی تھا۔ دیکھو اس پر پورا فیچر چھپا ہے۔ دیکھو تو ....." اور یہ کہتے ہوئے چشتی نے اخبار بیوی کے ہاتھ میں دے دیا۔ رضیہ اخبار دیکھنے لگی۔

"ارے!"

"کیا ہوا؟" چشتی کے منہ سے نکلا۔

"آپ نے فیچر کا یہ حصہ نہیں دیکھا" اور وہ پڑھنے لگی "یہ بات ابھی تک ایک معمہ ہے کہ علیا نے اپنی عمر بھر کی رنیق ٹلی کس کے حوالے کی تھی؟ ہسپتال میں وہ کون اجنبی آیا تھا جو اس سے ٹلی لے کر چلا گیا تھا؟ حالانکہ علیا کا اپنا بیٹا بھی ہے اور اس کے احباب بھی بہت بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ امید ہے چند روز تک یہ معاملہ حل ہو جائے گا۔ ہمارا نامہ نگار یہ معاملہ حل کرنے میں بڑی تگ و دو کر رہا ہے۔" رضیہ نے اخبار کے صفحے سے نظریں ہٹائیں۔ چشتی کی آنکھوں سے حیرت و استعجاب کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

"میں کہتا ہوں ان اخبار والوں کو ایسا موقع خدا دے۔"
"لیکن آپ کیوں فکر کرتے ہیں۔ کرنے دیں ان لوگوں کو تگ و دو۔ جب مسئلہ حل ہوگا تو" رضیہ ہنسنے لگی "کھودا پہاڑ اور نکلی چوہیا! اور وہ بھی___"
"یہ تو ہوگا ہی" چشتی نے مسکرا کر بیوی کی بات کی تائید کی۔

ساڑھے سات بجے وہ اپنے دوست رحمت خاں کے گھر کے دروازے پر کال بیل پر انگلی رکھے کھڑا تھا۔

"آیئے چشتی صاحب!" رحمت نے کسی قدر حیرت کے عالم میں اس کا خیر مقدم کیا کیونکہ چشتی اس سے پہلے کبھی اتنے سویرے اس کے ہاں نہیں آیا تھا۔ "اندر آ جایئے۔" رحمت اسے کمرے میں لے گیا۔ "ناشتہ تو ضرور کریں گے نا!" رحمت نے تکلفاً پوچھا۔

"نہیں خاں صاحب! ناشتہ کر کے آیا ہوں۔ کوئی نئی تازہ خبر؟"

"اخبار دیکھا ہے۔ بین الاقوامی قسم کی تو کوئی خاص خبر نہیں۔"

"اور اپنے ملک کی خبر! ـــــ وہ بیچر ـــــ"

یہ لفظ سن کر رحمت خاں ہنس پڑا۔ "دیکھا ہے۔ لکھنے والے نے ٹلی لے جانے والے واقعے کو ایک معمّا بنا دیا ہے۔"

"دیکھ لیں ہمارا کمال!"

رحمت خاں چشتی کے اس فقرے پر بھونچکا سا ہو گیا۔ "اس میں آپ کا کمال کیا ہے؟"

"وہ ٹلی اس خاکسار ہی کو تو دی گئی تھی!"

رحمت خاں کو بہت حیرت ہوئی اور چشتی اس کی اس حیرت پر مسکرانے لگا۔

"مگر چشتی صاحب آپ کا علیا سے کیا واسطہ؟"

بظاہر کوئی واسطہ نہیں۔ میں کہاں، وہ کہاں۔ بس ایک چھوٹا سا واقعہ ہوا تھا کئی سال پہلے۔" اور چشتی نے اسے پوری روداد سنادی۔

"اسے کہتے ہیں رائی کا پہاڑ بنانا۔" رحمت خاں نے کہا۔ "اور ہاں ایک مشورہ بھی ہے۔"

"مشورہ کیا ہے رحمت خاں؟"

"مشورہ صرف یہ ہے کہ ابھی یہ بات کسی کو بتایئے نہیں۔ دیکھئے ہوتا کیا ہے؟" رحمت خاں نے سرگوشی کی۔ وہ رحمت خاں کے ہاں آدھ گھنٹہ بیٹھا اور اس دوران میں علیا ٹلی والے کے علاوہ

اور کسی موضوع پر بہت کم گفتگو ہوئی اور جس وقت وہ اپنے گھر کی طرف چلا تو زندگی کا وہ ایک سایہ سا جو اس کے ذہن پر محیط ہو گیا تھا اب دور ہو چکا تھا۔

دوسرے روز چشتی نے اخبار ایک توقع کے ساتھ اٹھایا۔ اس میں علیا ٹلی والا کے متعلق کوئی خبر، کوئی اطلاع نہیں تھی۔ پانچ روز بیت گئے۔ چشتی وقت گزاری کے لئے جاسوسی ناول کے مطالعے میں مصروف تھا کہ کال بیل بجی اور دو تین منٹ بعد راجو نے آکر بتایا "صاب! ایک آدمی آیا ہے!"

"کون آدمی؟"

"پتا نہیں جی کون ہے؟"

"اچھا۔ بٹھاؤ اسے آتا ہوں۔"

چشتی نے ناول بند کرکے میز پر رکھ دیا اور دھیرے دھیرے ڈرائینگ روم کی طرف چلا۔ ایک صاحب جن کی عمر تیس بتیس برس ہوگی کوچ پر بیٹھے تھے، چشتی کو دیکھ کر تعظیماً کھڑے ہو گئے۔

"تشریف رکھیے جناب"۔ وہ صاحب بیٹھ گئے۔ بیگ کھول کر انہوں نے اپنا وزیٹنگ کارڈ نکالا اور چشتی کے سامنے رکھ دیا۔ چشتی نے پڑھا یہ ایک معروف روزنامے کے نمائندہ خصوصی تھے۔

"میں معافی کا خواستگار ہوں۔ زحمت دے رہا ہوں۔ میرا نام زبیر علی انصاری ہے جیسا کہ آپ نے کارڈ میں ملاحظہ فرما لیا ہو گا۔"

"جی ہاں آپ سے تعارف ہو چکا ہے۔ فرمائیے میں کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

انصاری نے اپنا بیگ کھولا۔ اس میں سے اخبار نکالا۔ "اس میں ایک فیچر چھپا تھا ——— علیا ٹلی والا کے بارے میں ——— لوگوں نے بہت پسند کیا ہے۔ اخبار کے سارے پرچے ہاتھوں ہاتھ نکل گئے ہیں۔" انصاری یہ لفظ کہہ کر اپنے فقرے کے ردِ عمل کا انتظار کرنے لگا۔

"بہت خوب" چشتی نے کہا۔ انصاری کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

چشتی صاحب! یہ نہ پوچھیے آپ کی تلاش میں کیسے کیسے ہفت خواں طے کرنے پڑے۔ ہسپتال والوں نے تو کورا جواب دے دیا کہ ہمیں اس آدمی کا کوئی علم نہیں جسے علیا نے تلی دی تھی۔ مگر جناب یہ اخبار والے بھی بڑی بلا ہوتے ہیں۔"

"اس میں کیا شک ہے؟" انصاری صاحب کی آنکھوں کی چمک دگنی ہوگئی۔

"دیکھ لیجئے آپ کے ہاں پہنچ گیا۔ کس طرح پہنچا یہ ایک الگ روداد ہے۔ بہرحال۔۔۔"

"جی۔ دیکھ لیا ہے۔ آپ کو میرا پتا کس نے بتایا؟" چشتی نے پوچھا۔

"معاف کیجئے یہ راز کی باتیں ہیں!۔۔۔ کبھی نہیں جا سکتیں" نامہ نگار نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے آپ کو رحمت خاں نے بتایا ہے؟"

"ممکن ہے یہ بات درست ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ درست نہ ہو۔ مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہمیں اطلاع ملنا تھی سو مل گئی۔ آج اس سلسلے میں انٹرویو کے لئے حاضر ہوا ہوں۔" نامہ نگار ذرا ٹھہر کر بولا۔

"کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ علیا سے آپ کے تعلقات کیسے تھے؟" چشتی نے دروازے کی طرف رخ کر کے ذرا بلند آواز سے "چائے بھجوایئے" کہا اور اخبار کے نامہ نگار سے مخاطب ہو کر بولا۔ "صاحب، تعلقات کیسے تھے اور کیسے نہیں تھے اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ علیا کے ساتھ میرے تعلقات تھے ہی نہیں!"

"تعلقات نہیں تھے ۔۔۔ تو پھر۔۔۔"

"آپ شاید یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اس نے مجھے ہسپتال میں بلا کر اپنی تلی کیوں دی؟"

"جی ہاں!"

بس دے دی ۔۔۔ اس کا جی چاہا دے دی۔ آپ کو یا کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟" چشتی نے اپنی طرف سے خوشگوار موڈ کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"جی اعتراض کیا ہو سکتا ہے لیکن آپ کو جو ترجیح دی تو یقیناً اس کی کوئی وجہ ضرور ہوگی؟"

"ہو گی۔ ضرور ہو گی صاحب!"

نامہ نگار نے پہلی مرتبہ اپنی نوٹ بک پر کچھ لکھا۔ چشتی نے اسے کنکھیوں سے یہ حرکت کرتے ہوئے دیکھا اور اس کا کوئی نوٹس نہ لیا۔

"ایک اور سوال ہے چشتی صاحب!"

"ارشاد۔"

"آپ کے نزدیک اس تاریخی ٹی کا مصرف کیا ہے میری مراد ہے آپ اس کا کیا کریں گے؟"

چشتی کو اس سوال کی توقع نہیں تھی۔ اس پہلو پر تو غور کرنے کا اسے موقع ہی نہیں ملا تھا۔

"آپ کہتے ہیں یہ تاریخی ٹی ہے . . . " چشتی نے اپنا فقرہ ابھی مکمل نہیں کیا تھا کہ نامہ نگار جھٹ بول اٹھا۔

"تاریخی ٹلی نہیں تو اور کیا ہے پچاس برس تک اس نے اپنے مالک کا ساتھ دیا ہے سنا گیا ہے کہ علیا اسے جان سے زیادہ عزیز سمجھتا تھا۔"

"انصاری صاحب!"

"فرمائیے بندہ پرور!"

"فرض کیا یہ ٹلی آپ کو مل جاتی تو ـــــ" چشتی نے اپنی طرف سے نامہ نگار کو آزمائش میں ڈال دیا تھا۔

انصاری نے دو چار لمحے غور کرنے کے بعد جواب دیا "آپ پوچھنا چاہتے ہیں کہ میں کیا کرتا۔ میں اسے نوادر میں شامل کرتا۔ آپ کو معلوم ہو گا کہ شہر میں کئی ایسے لوگ ہیں جنہوں نے اپنے گھروں میں نوادر جمع کر رکھے ہیں۔ کبھی کبھی ان نوادر کی نمائش کرتے رہتے ہیں۔ شائقین دور دور سے آکر انہیں دیکھتے ہیں۔ اخباروں میں ان کے بارے میں مضامین لکھے جاتے ہیں۔ بڑی شہرت ہوتی ہے ان کی!"

"مجھے اس کا علم نہیں ہے۔" چشتی نے بلا تکلف اپنی لاعلمی کا اعتراف کر لیا۔

راجو چائے لے آیا اور بڑے خوشگوار ماحول میں چائے پی جانے لگی۔

نامہ نگار کے جانے کے بعد چشتی نے نامہ نگار سے اپنی ملاقات کی روداد ہنس ہنس کے اپنی بیوی کو سنا دی مگر رضیہ ہنسی میں اس کا ساتھ نہ دے سکی۔

شام کے سات بجے ہوں گے۔ چشتی اپنی بیوی کے ساتھ ٹیلیویژن دیکھ رہا تھا اور راجو کی بیوی جو باورچی خانے میں برتن قرینے سے الماری میں رکھ رہی تھی، اس نے کال بیل سن لی۔ بیرونی دروازے کی طرف گئی۔ اس نے دیکھا کہ دو شخص کھڑے ہیں۔

"چشتی صاحب تشریف رکھتے ہیں؟" ایک نے پوچھا۔

"دیکھ کر بتاتی ہوں۔" اور ڈرائینگ روم میں آکر اس نے ان دو آدمیوں کے آنے کی اطلاع دی۔

"بلا لاؤ۔" چشتی نے کہا۔

رضیہ اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ چشتی نے ٹیلیویژن بند کر دیا۔ چند منٹ بعد وہ آ گئے۔

"سلام علیکم چشتی صاحب!" دونوں نے ایک ساتھ سلام کیا۔

چشتی نے انہیں دیکھتے ہی اندازہ لگا لیا کہ یہ بھی کسی اخبار ہی کی طرف سے آئے ہیں۔ ایک کے دائیں شانے پر کیمرہ لٹک رہا تھا۔

"فرمائیے کیا حکم ہے؟" چشتی نے انہیں صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"شکریہ۔ ہم اپنا تعارف کرا دیں۔ ہم اخبار "شش جہت" کی طرف سے آئے ہیں۔ آپ کو ایک زحمت دینا چاہتے ہیں۔ اس معاملے پر ایک نقاب پڑی ہے، ہمیں توقع ہے کہ آپ یہ نقاب ہٹا دیں گے یعنی ہمیں ٹھیک ٹھیک صحیح صحیح بتا دیں گے کہ کیا واقعہ کیا ہے۔ کیوں علیا نے . . ."

چشتی کو ذرا غصہ آ گیا۔ "اگر آپ اسے ایک راز سمجھتے ہیں تو راز ہی رہنے دیں۔ اور کچھ فرمائیے۔"

چشتی کے یہ الفاظ سن کر دونوں نمائندے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھنے لگے۔

"چشتی صاحب! اگر لوگوں کو حقیقت حال کا علم نہیں ہوگا تو وہ طرح طرح کی باتیں بنائیں گے۔"

ایک بولا۔

"بلانے دیجئے۔" چشتی کا غصہ کچھ اور بڑھ گیا تھا۔

"آپ کی مرضی۔ ہم آپ کو مجبور نہیں کر سکتے۔ کیا وہ مشہور و معروف تلی دکھا سکتے ہیں؟" دوسرے نے کہا۔

چشتی اٹھ بیٹھا۔ دو منٹ بعد واپس آیا تو تلی اس کے ہاتھ میں تھی۔ وہ بیٹھا ہی تھا کہ اچانک فضا میں روشنی کی ایک جھلک سی ہوئی اور ایک سیکنڈ میں غائب ہو گئی۔

"بس شکریہ چشتی صاحب" دونوں صوفے سے اٹھ بیٹھے۔

"چائے آ رہی ہے!" چشتی نے انہیں روکنے کی کوشش کی۔

"پھر کبھی سہی!" وہ دونوں چلے گئے اور چشتی بھی اپنے کمرے کی طرف جانے لگا۔ اس کا موڈ خراب ہو گیا تھا اور اس وقت تلی کے بارے میں ایک لمحے کے لئے بھی سوچنا نہیں چاہتا تھا، کمرے میں جا کر آرام کرسی میں دھنس گیا۔ وہ جب سے ریٹائر ہوا تھا، پندرہ بیس روز کے بعد اپنے محکمے میں چلا جاتا تھا۔ اس کے کچھ وہ پرانے رفیق جن کی دو دو تین تین سال میعادِ ملازمت باقی رہ گئی تھی بڑی محبت سے اس کا خیر مقدم کرتے تھے اور چشتی دیر تک ان کے ساتھ مختلف موضوعات پر باتیں کرتا رہتا تھا۔ دوستوں کی صحبت میں گزری ہوئی یہ گھڑیاں اسے بہت عزیز تھیں۔ اخباری نمائندوں سے ملاقات کرنے کے تیسرے روز بعد وہ اپنے محکمے میں جا پہنچا۔ اس کا پرانا دوست ارشاد کمرے کے باہر ہی مل گیا۔ ارشاد کی ملازمت بھی ختم ہو گئی تھی۔ مگر اسے ایک برس کی توسیع مل گئی تھی، چشتی کا بے تکلف دوست تھا اسے دیکھتے ہی بولا: "آیئے تلی والے چشتی صاحب!" چشتی نے ارشاد کی کسی بے تکلفی کا برا نہیں مانا تھا مگر اس کے یہ الفاظ اسے برے لگے اور خلافِ معمول اس نے تلخ لہجے میں پوچھا: "کیا مطلب ہے تمہارا؟" چشتی کے لہجے میں درشتگی تھی لیکن ارشاد نے اسے محسوس نہ کیا۔

"مطلب! کیا ہو سکتا ہے اس کا۔ ایک تھا وہ علیا تلی والا اور ایک ہے ہمارا چشتی تلی والا۔"

ارشاد برابر مسکرائے جا رہا تھا۔

"بڑی بے ہودہ بات کہہ رہے ہو ارشاد؟" چشتی کا لہجہ اور تلخ ہو گیا تھا۔

ارشاد کو اب محسوس ہوا کہ اس کے دوست کا موڈ خراب ہو گیا تھا۔

"آؤ کینٹین چلتے ہیں۔ محمود، رفعت اور ظہیر، سب وہیں بیٹھے ہیں۔"

ارشاد نے چشتی کا ہاتھ پکڑا اور اسے کینٹین میں لے آیا۔ محمود، رفعت، ظہیر نے فوراً اٹھ کر اسے گھیرے میں لے لیا۔

"چشتی یار۔ کیا ریٹائرمنٹ کے بعد ٹلی بجانی شروع کر دی ہے؟" محمود بولا۔

"ویسے ٹلی تمہارے ہاتھوں میں بجتی خوب ہے!" رفعت بولا اور ہنسنے لگا۔

"چشتی بھائی! میں سوچ رہا ہوں ریٹائرمنٹ کے بعد میں ڈھول بجایا کروں گا۔ ٹلی والا تو مل ہی گیا ہے!"

چشتی کا غصہ لحمہ بہ لحمہ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ وہ ضبط نہ کر سکا۔ آخر اس کا اس کا مطلب کیا ہے؟ اس نے خفگی سے کہا۔

ارشاد کے سوا باقی تمام دوست حیرت سے اس کا چہرہ دیکھنے لگے۔ ارشاد کونٹر پہ گیا جو صاحب کونٹر پہ تھے ان سے کچھ کہا۔ انہوں نے میز کی دراز کھولی اور ایک تہہ کیا ہوا اخبار ارشاد کے ہاتھ پہ رکھ دیا۔ ارشاد واپس آیا۔ اس نے اخبار کا صفحہ کھولا اور اسے چشتی کے آگے پھیلا دیا۔ اخبار کے اس صفحے پر چشتی کو ہاتھ میں ٹلی لئے ایک کوچ پہ دکھایا گیا تھا اور نیچے یہ سطر درج تھی!

"ریلوے کے سابق افسر ناصر علی چشتی اسی پُراسرار ٹلی کے ساتھ جو انہیں علیا ٹلی والے نے نامعلوم وجوہ سے دی تھی"

چشتی کے تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی۔ "ان لوگوں کا یہ حوصلہ۔ یہ کیا بکواس لکھ دی ہے؟" اس نے اخبار پرے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"یہ آپ جانیں" محمود نے کہا۔

"چشتی صاحب، کچھ اور بھی معلوم ہے۔ ایک اخبار نے لکھا ہے کہ" ظہیر یہ کہہ کر کنکھیوں سے چشتی کے چہرے پر اپنی بات کا ردّ عمل تلاش کرنے لگا۔

"کیا لکھا ہے؟"

"اس نے لکھا ہے کہ ریٹائرمنٹ کے بعد چشتی صاحب نے نوادر جمع کرنے کا کام شروع کر دیا ہے۔ اور یہ ٹی بڑی بھاری قیمت پر نوادر کے کسی شائق کے ہاتھوں فروخت کرنا چاہتے ہیں۔"

ظہیر ذرا رکا "یہ خبر پرسوں کے اخبار میں تھی۔ اخبار میرے گھر میں ہے۔"

"بکواس، لغو، مہمل" چشتی کی آنکھوں سے شرارے سے نکلنے لگے۔

ارشاد نے اندازہ لگا لیا کہ اس گفتگو کو آگے بڑھایا گیا تو مزید تلخی پیدا ہو جائے گی۔ وہ چشتی کا ہاتھ پکڑ کر اسے کینٹین سے باہر لے آیا۔

"چھوڑو یار! یہ بھی کوئی غصہ کرنے کی بات ہے۔ وہ ٹی تم نے بھلا پاس کیوں رکھ چھوڑی ہے؟"

"تو کیا کروں؟"

"کیا کرو۔ اس مسئلے پر سوچنا چاہیئے۔"

چشتی گھر پہنچا تو اس کا موڈ بہت خراب تھا اور جب بیوی نے اسے بتایا کہ اس کی غیر موجودگی میں ایک اخباری رپورٹر آیا تھا تو وہ گرج کر بولا "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ بیٹھے بٹھائے کس مصیبت میں گرفتار ہو گیا ہوں۔ میں ان بدمعاشوں پر کیس کر دوں گا۔ خواہ مخواہ ایک شریف اور معزز آدمی کو پریشان کر رہے ہیں۔" رضیہ نے اس کی بات کا کوئی نوٹس نہ لیا اور گھر کے کاموں میں مصروف رہی۔ دو گھنٹے بعد وہ اس کے پاس آ بیٹھی اور بولی "دیکھیئے یہ مسئلہ اس طرح حل نہیں ہو گا۔"

"تو کس طرح ہو گا؟" رضیہ دو تین منٹ خاموش رہنے کے بعد کہنے لگی "اس ٹی کا جائز حق دار علیا کا بیٹا ہے۔"

چشتی کو احساس ہو گیا کہ اس کی بیوی کوئی معقول تجویز بتانے والی ہے۔ "تو پھر!" اس نے

سوال کیا۔

"حق، حق دار ہی کو ملنا چاہیئے۔ ہم بھی اس مصیبت سے نجات پا لیں گے۔"

چشتی کو احساس ہو گیا کہ جس تجویز کو وہ معقول سمجھ رہا تھا وہ اتنی معقول نہیں تھی۔

"رضیہ تم اس بات کو بھول گئیں کہ علیا کو اپنے بیٹے پر اعتماد نہیں تھا۔ ابراہیم نے بتایا تھا کہ اس کا بیٹا منظورا بڑی صحبت میں خراب ہو گیا ہے۔ تکیوں میں پڑا رہتا ہے۔"

"یہ سب کچھ آپ مجھے بتا چکے ہیں۔ مگر ہمیں اس مصیبت سے اسی صورت میں نجات مل سکتی ہے کہ نئی علیا کے بیٹے کے حوالے کر دیں۔

یہ اخبار والے ہمیں جینے نہیں دیں گے کوئی نہ کوئی شوشا چھوڑتے رہیں گے!"

چشتی اور رضیہ دیر تک اس موضوع پر غور کرتے رہے۔ آخر طے پایا کہ چشتی منظورے کو ڈھونڈے گا۔ وہ شہر کے کسی نہ کسی تکیے میں ضرور مل جائے گا۔ دوسرے دن سے چشتی نے اپنی مہم کا آغاز کر دیا۔ تکیے میں جانا اسے بڑا عجیب لگا۔ وہ اپنی پوری زندگی میں کسی تکیے کے قریب سے بھی نہیں گزرا تھا۔

وہ ایک تکیے میں پہنچا اور ابھی اس نے اپنی زبان سے ایک لفظ بھی نہیں نکالا تھا کہ لسے یوں محسوس ہوا جیسے بدبو سے اس کا دماغ پھٹ جائے گا۔ اس نے یہ بھی دیکھا کہ جو لوگ وہاں بیٹھے تھے وہ بڑی عجیب نظروں سے اس کا جائزہ لے رہے ہیں وہ باہر نکل آیا۔ گھر آکر اس نے یہ فریضہ راجو کے سپرد کر دیا۔ راجو ہر روز دو تین گھنٹے گھر سے باہر آوارہ گردی کرتا تھا۔ اور واپس آکر بتاتا تھا "صاب جی! منظورا نامی کوئی آدمی نہیں ملا۔"

چار دن بعد وہ خبر لایا "منظورا مل گیا ہے۔ صاب جی!"

"کہاں ہے؟"

"ایک تکیے میں۔ پر آپ اسے دیکھیں گے تو ڈر جائیں گے۔ بڑی خراب حالت ہے اس کی۔"

چشتی اسی وقت راجو کے ہمراہ روانہ ہو گیا۔

موچی دروازے کے اندر ایک تکیے کی پھٹی پرانی چٹائی کے اُوپر ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ پڑا تھا جسے راجو نے منظورا کہہ کر پکارا تو وہ اسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ چشتی اسے گاڑی میں بٹھا کر اپنی کوٹھی میں لے آیا۔

وہ بہکی بہکی باتیں کرتا تھا چشتی نے مناسب سمجھا کہ جب اسے ہوش آ جائے تب ٹلّی اس کے حوالے کر دے۔ دوسرے روز صبح نو بجے اس کی حالت میں اچھی خاصی تبدیلی آگئی۔ باپ کی موت کا ذکر سن کر زار و قطار رونے لگا۔ بڑی مشکل سے چشتی نے اسے ناشتہ کروایا اور ٹلّی اس کے حوالے کر دی۔ منظورے نے ٹلّی کو کئی بار چوما، اور چلا گیا۔

اسی وقت چشتی نے ایک خبر بنائی "عالیا کی ٹلّی اس کے بیٹے منظورے کو دے دی گئی ہے اب ناصر علی چشتی کو ٹلّی سے کوئی واسطہ نہیں رہا۔"

ٹلّی گھر سے چلی گئی تو چشتی کو یوں محسوس ہوا جیسے ایک کانٹا جو اس کے ذہن میں چبھ رہا تھا دور ہو گیا ہے۔

اس نے جو خبر اخباروں کو بھیجی تھی وہ چھپ گئی تھی اب اس نے پھر اپنے روزمرہ معمولات پر عمل کرنا شروع کر دیا تھا لمبی لمبی سیریں کرتا تھا اور پرانے دوستوں کے ہاں بے فکری کے عالم میں گفتگو کرتا تھا۔

اسی عالم میں تین ہفتے گزر گئے۔

اس روز اور وہ دن اتوار کا تھا جب وہ شام کے قریب اپنے ایک دوست کے بچے کی سالگرہ میں شامل ہونے کے بعد گھر واپس آیا، اور جیسے ہی ڈرائنگ روم میں پہنچا، اس کی آنکھوں تلے ایک شعلہ سا لہرا اٹھا۔ ٹلّی تپائی کے اوپر پڑی تھی۔ "رضیہ! رضیہ!" وہ چیخا۔

رضیہ بھاگی آئی۔ "کیا ہوا؟"

"یہ کیا ہے۔ کیا مصیبت ہے؟" اس نے ٹلّی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"وہ منظورا ـــــ مر گیا ہے تکیے میں ـــــ اس نے وصیت کی تھی کہ ٹلّی آپ کے ہاں پہنچا دی

جائے۔ ٹکے والے دے گئے ہیں ـــ میں کیا کرتی؟"

حشمت گرجنے لگا: "مگر تم نے کیوں لے لی ـــ واپس کر دیتیں ـــ کہہ دیتیں ہمارے گھر میں نہیں رہے گی۔ تم کو پتا نہیں تھا کہ اخبار والے جان نہیں چھوڑیں گے؟"

رضیہ کچھ کہنے ہی والی تھی کہ راجو دروازے کے اندر آیا: "صاب جی ـــ وہ آئے ہیں جی ـــ وہی جی۔ اخبار والے!"

"کیا!" اور حشمت دونوں ہاتھ کنپٹیوں پر رکھ کر صوفے میں گر پڑا۔

اس کی خاطر

چند روز ہوئے میرے ایک دوست نے یہ واقعہ سنایا تھا اور آج میں اسے اپنے الفاظ میں ڈھالنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

میرے دوست نے کہا تھا۔

ساڑھے ستائیس برس تک صبح سے لے کر شام تک کام کرنے کے بعد میں بڑی طرح تھک گیا اور محسوس کرنے لگا کہ بقول مرزا غالب "اب عناصر میں اعتدال کہاں ؟" سب سے بڑی مشکل یہ آن پڑی کہ پہلے اکبری دروازے سے ملتان روڈ تک سائیکل چلانا کوئی تکلیف دہ بات نہیں تھی لیکن جب میری کمپنی نے ملتان روڈ سے گلبرگ میں اپنا دفتر منتقل کر لیا تو ٹانگیں جواب دینے لگیں۔ بیوی نے مشورہ دیا کہ دفتر چھوڑ دو اور جو رقم دفتر سے ملے تو اس سے کوئی کاروبار کر کے گزارے کی اچھی صورت نکل آئے گی۔ میں بھی اس کے لئے تیار ہو گیا مگر کمپنی کا چیئرمین مجھ جیسے تجربہ کار و ڈرافٹسمین سے محروم ہونا پسند نہیں کرتا تھا۔ اس نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا۔ میری پرانی خدمات کا ذکر کیا تنخواہ میں پچاس روپے کا اضافہ کر کے یہ رعایت بھی دے دی کہ اگر تم چاہو تو کمپنی تمہیں کار خریدنے کے لئے مناسب رقم بلاسود قرض دے سکتی ہے جسے تم آسان قسطوں میں لوٹا دینا۔

یہ کوئی خاص سہولت نہیں تھی مگر اس وقت ایک بڑی رحمت محسوس ہوئی۔ سوچا ساری عمر ٹانگوں کو گھمایا ہے اب ذرا کار گھما کر بھی دیکھنا چاہیئے کہ اس میں کیا راحت ملتی ہے۔

میرے ایک دور کے عزیز ہیں۔ پیشے کے لحاظ سے ٹھیکیدار ہیں۔ انہوں نے ٹھیکیداری میں

فائدہ کم اور نقصان زیادہ اٹھایا تھا لیکن جب ان کے دو بڑے بیٹے دوبئی میں بہ سلسلہ ملازمت چلے گئے تو گویا پیسے کی بارش ہونے لگی اب تو میاں بیوی پرانی چیزیں اپنی شان سے کم تر خیال کرنے لگے۔ چنانچہ پرانے ماڈل کی ڈاٹسن کار نظروں سے گر گئی۔ نئی ویٹ خرید لی۔ پرانی کار کا وجود فضول تھا۔ انہیں کسی طرح پتہ چل گیا کہ مجھے میری کمپنی کار خریدنے کے لئے معقول رقم دینے پر آمادہ ہے۔ فوراً غریب خانے پر تشریف لائے اور بولے۔ "پچاس ہزار کا مال ہے۔ تیس ہزار میں جا رہا ہے لے لو بعد میں پچھتاؤ گے۔" میں بعد میں پچھتانا نہیں چاہتا تھا۔ کمپنی کے چیئرمین سے گفتگو کر کے مطلوبہ رقم ان صاحب کے حوالے کر دی اور گاڑی خرید لی

گاڑی آ گئی۔ میں نے زندگی بھر سائیکل چلائی ہے۔ گاڑی کا تو کبھی خواب بھی نہیں دیکھا تھا۔ گاڑی آئی تو ڈرائیور کو بھی آنا چاہیئے تھا۔ گاڑی والے دوستوں سے مشورہ کیا۔ انہوں نے مدد کی اور ہر روز ایک نئے ڈرائیور کا انٹرویو ہونے لگا معلوم ہوا کہ یہ لوگ بڑے لوگوں کی گاڑیاں ڈرائیو کرتے رہے ہیں۔ چھوٹی رقم ان کی نظروں میں نہیں جچتی اور ادھر میری یہ مجبوری کہ اگر آدھی تنخواہ ڈرائیور ہی کو دے دوں تو گاڑی کی قسط اور گھر کے اخراجات کے لئے روپیہ کہاں سے لاؤں۔

گاڑی جتنی آسانی سے میسر ہوئی تھی۔ ڈرائیور کا حصول اسی قدر مشکل ہو گیا۔ سوچا خود ہی کوشش کر کے ڈرائیونگ سیکھ لوں مگر یہ مسئلہ اتنا آسان نہیں تھا۔ پہلے دن ہی پسینہ پسینہ ہو گیا اور یہ بھی انکشاف ہوا کہ طویل اور سخت محنت نے مجھے اعصابی مریض بھی بنا دیا ہے۔ ایک اعصابی مریض کے لئے کار ڈرائیونگ خطرے سے خالی نہیں بس ڈرائیونگ کے نام سے کانوں پر ہاتھ رکھا اور ایک بار پھر ڈرائیور کے لئے کوشش کرنے لگا۔

ایک شام کا ذکر ہے کہ ایک اچھے ڈیل ڈول کا آدمی دروازے پر آ کر بولا۔ صاحب جی! آپ کو ڈرائیور چاہیئے۔ میرا نام حسن ہے آپ کو چوہدری فتح محمد نے بتایا ہو گا کہ میں کیسا ڈرائیور ہوں۔ مجھ سے کسی فتح محمد نے اس کا ذکر نہیں کیا تھا۔ تاہم میں مصلحتاً خاموش رہا۔

چاہتا تھا کہ یہ اگر مناسب تنخواہ مانگے تو اسے رکھ لوں۔

اس کے جثے پر ایک نگاہ ڈالی۔ توانا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ عمر پینتیس سال سے کم کیا ہوگی ٹھوڑی پہ بالشت بھر داڑھی۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی۔ رنگ زرد، گال پچکے ہوئے، پیشانی فراخ پہلی نظر ہی میں پتا چل گیا کہ زندگی نے اس کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا۔ نہ جانے کن کن تلخ تجربات سے گزر چکا ہے۔

میں نے پوچھا۔

"تمہیں ڈرائیونگ کا کتنا تجربہ ہے؟"

اس نے سوال سنتے ہی کئی ایسے صاحبوں کے نام گنوا دیے جن کی گاڑیاں ڈرائیو کر چکا تھا۔

"میرا دوسرا سوال یہ تھا کہ تنخواہ کیا لوگے؟"

"جو بھی آپ خوشی سے دے دیں۔"

یہ فقرہ خطرے سے خالی نہیں تھا نہ جانے کیا مانگ بیٹھے۔ مگر چونکہ اس نے تنخواہ کے بارے میں کسی بڑے آدمی کے ڈرائیور کی طرح گفتگو نہیں کی تھی۔ اس لئے میں نے کہہ دیا "کل سے کام شروع کردو تنخواہ کا فیصلہ ہو جائے گا۔"

اس کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اسے میرے فیصلے سے خوشی ہوئی ہے۔ بے اختیار مصافحے کے لئے اس کے ہاتھ میری طرف بڑھ گئے۔ مگر مجھے اس کی یہ حرکت پسند نہ آئی۔ وہ نوکر تھا۔ نوکر اپنے مالک سے مصافحہ نہیں کرتا۔ تاہم میں نے مصافحہ کر کے اسے رخصت کر دیا۔

جس روز اس نے گاڑی سٹارٹ کی میرا دل بڑی طرح دھڑک رہا تھا۔

میں نے اپنی طرف سے بڑی کم تنخواہ بتائی اور وہ بھی اس نے قبول کر لی۔ اس پر میں پریشان ہو گیا کہ کہیں ناتجربہ کاری کی وجہ سے کوئی ایکسیڈنٹ نہ کر دے۔ جی چاہا کہہ دوں "حسن! مہینہ بھر کی تنخواہ لو اور چھٹی کرو" لیکن نہ جانے کیوں احساس ہونے لگا کہ اسے میری اس بات سے بڑا دکھ ہوگا۔ اس لئے اس سے کچھ نہ کہا۔

دن پر دن گزرتے گئے اور وہ باقاعدہ طور پر میرا ڈرائیور بن گیا۔

حسن کی ایک بات جو مجھے پسند آئی وہ یہ تھی کہ اس سے جو کچھ بھی کہا جاتا تھا بڑی پھرتی سے کر دیتا تھا۔ گھر سے آتے ہی کار صاف کرتا تھا۔ بڑی اچھی طرح اس کا جائزہ لیتا تھا کہ کوئی خرابی تو نہیں ہے۔ میں ناشتہ کر کے دروازے ہی پر ہوتا تھا کہ وہ جھٹ اپنی سیٹ پر جا بیٹھتا تھا۔ اس کی یہ پھرتی دیکھ دیکھ کر میں خوش ہوتا تھا لیکن کبھی کبھی نہ جانے یہ خیال کیوں آجاتا تھا کہ وہ اتنا پھرتیلا ہے نہیں صرف مجھے خوش کرنے کے لئے تیزی دکھاتا ہے۔

میری کوشش یہی تھی کہ وہ مجھے مالک سمجھتا رہے اور خود کو نوکر مگر یہ سلسلہ دیر تک چل نہ سکا۔ ایک روز جب اس نے مجھے اپنے حالات بتائے تو وہ مصنوعی دیوار جو ہم دونوں کے درمیان کھڑی تھی گر گئی۔

اس نے بتایا۔ صاب جی! میرا کوئی رشتہ دار نہیں ہے۔ گھر میں صرف ایک بہن ہے۔"

"اور کوئی نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں صاب جی! اور کوئی نہیں۔ صاب جی! کلثوم مجھ سے گیارہ برس چھوٹی ہے۔ کسی اچھے گھر میں ہوتی تو اب تک اس کا بیاہ ہو چکا ہوتا۔"

"تو تم نے اس کا بیاہ کیوں نہیں کیا؟"

"جی مرد کی ذات بھلا کیا کر سکتی ہے۔ یہ کام مائیں کرتی ہیں۔ اس کی ماں نہیں ہے۔"

اس دن بس اتنی ہی گفتگو ہوئی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ اور کہنا چاہتا ہے لیکن کہہ نہیں سکا۔ حسن اپنی ڈیوٹی بڑی مستعدی کے ساتھ پوری کرتا رہا۔ مجھے اس سے کسی قسم کی شکایت نہ ہوئی وہ اتوار کو بھی آجاتا تھا اور پوچھتا تھا۔ کیوں صاب جی! آپ کہیں باہر تو نہیں جاتا مگر میں چھٹی کے روز بچوں ہی کے ساتھ رہنا پسند کرتا ہوں کہیں بھی جاتا آتا نہیں ہوں۔

ایک اتوار وہ اس طرح آگیا تو میں نے کہا۔

"دیکھو حسن! جب میں نے تم سے کہہ رکھا ہے کہ اتوار کو مت آیا کرو۔ پھر آج کیوں آگئے ہو؟"

یوں لگا وہ کچھ کہتے ہوئے ہچکچا رہا ہے۔

"کیوں حسن! کچھ کہنا چاہتے ہو۔ تنخواہ پیشگی چاہیئے؟"

"جی نہیں۔"

"پھر کیا معاملہ ہے؟"

وہ دو تین منٹ گاڑی کے بارے میں باتیں کرتا رہا۔ پھر بڑی لجاجت سے بولا۔

"صاب جی! بہن کی بڑی بھاری ذمے داری ہے مجھ پر۔"

میں نے سمجھ لیا کہ وہ بہن کی شادی کے لئے رقم مانگتا ہے۔ میں خود قرض میں جکڑا ہوا تھا اس کی کیا مدد کرتا۔

"حسن!" میں نے کہا۔ "میں نے تم کو بتایا نہیں تھا کہ یہ گاڑی کمپنی کے پیسے سے خریدی تھی اور میں ہر ماہ اس کی قسط دیتا ہوں۔ گھر کے اخراجات الگ ہیں۔"

"صاب جی! میں ادھار کب مانگتا ہوں؟" وہ بے تابی سے بولا۔

"ادھار نہیں مانگتے تو کیا چاہتے ہو۔؟"

اس نے رک رک کر اپنا عندیہ واضح کر دیا۔ اصل میں اسے بہن کے لئے مناسب رشتہ ڈھونڈنے میں بڑی دقت پیش آ رہی تھی۔ اس کے خیال کے مطابق یہ کام عورتوں کے ہوتے ہیں۔ مردوں کے نہیں۔ اور وہ چاہتا تھا کہ میری بیوی اس معاملے میں اس کی مدد کرے اور کوئی موزوں بر ڈھونڈ دے۔

"اچھا میں کوشش کروں گا۔"

میں نے اسے تسلی دی۔ اس نے میری بیوی کو بھی آمادہ کر لیا کہ وہ کوئی مناسب بر ڈھونڈ دے گی۔

کام کی مصروفیت میں میں اس کی درخواست بھول گیا۔ سات روز گزرے ہوں گے کہ وہ پھر چھٹی کے دن آ گیا۔

"صاحب جی! کچھ کیا ہے آپ نے؟" اس نے آتے ہی سوال کیا۔
مجھے سخت غصہ آیا۔ کیا احمق انسان ہے۔ بر ڈھونڈنا کوئی مذاق ہے۔ آٹھ دن میں کیسے رشتے کی بات چل سکتی ہے؟
"حسن! پاگل ہو گئے ہو تم؟ اتنی جلدی کیا ہو سکتا ہے؟ صبر سے کام لو۔"
"پر صاب جی! ــ وہ ــ صاب جی! مجبوری ہے نا۔"
"مجبوری کیا ہے؟" مجھے اس کی بات پر سخت غصہ آ گیا۔
وہ خاموش رہا اور اس کی صورت بتا رہی تھی کہ اس کے اندر کوئی کشمکش جاری ہے۔
مجھے اپنے لہجے پر افسوس ہونے لگا اس لئے ذرا نرمی سے کہا۔
"حسن! ایسے معاملات کچھ سوچ کر کئے جاتے ہیں۔"
حسن نے رندھے ہوئے گلے سے ہوں کہا اور گاڑی صاف کرنے لگا۔
میری بیوی نے یہ ساری گفتگو سن لی تھی۔ میں اندر گیا تو بولی۔
"آپ نے اچھا نہیں کیا۔ ہماری رضیہ بھی جوان ہونے والی ہے یہ مسئلہ امیر ہو غریب ہر ایک کو پیش آتا ہے۔"
اچانک میری نظر اپنی بیٹی پر پڑی جو بارہ برس کی ہو چکی تھی۔ اس وقت میرے ذہن میں خیال آیا کہ حسن کی بہن دوگنی عمر کی ہوگی جبھی تو وہ اس قدر پریشان ہے
انہی دنوں میرے دفتر میں ایک لڑکا بطور کلرک کام کرنے کے لئے آیا۔ کم گو، اطاعت شعار نیک خصلت۔ ایک ہفتہ بعد ہی میں اس کے بارے میں سوچنے لگا۔ سوچا اگر یہ کنوارا ہو تو حسن کی بہن کے لئے رشتے کی صورت نکل سکتی ہے۔
باتوں ہی باتوں میں میں نے اس کے حالات معلوم کر لئے وہ ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا باپ ریلوے سے ریٹائر ہو کر اپنے محلے کے اندر ایک چھوٹی سی دکان میں عام استعمال کی چیزیں بیچتا تھا۔ میں نے اندازہ لگا لیا کہ اس کے چھوٹے سے کنبے کی مالی حالت اس قابل نہیں ہے کہ

وہ کسی اچھے گھر کا دروازہ کھٹکھٹائے۔ اس لئے ممکن ہے کہ اس کے والدین حسن کی بہن کو بہو بنانے پر رضامند ہو جائیں۔ بیوی سے ذکر کیا تو اس نے کہا۔

پہلے یہ پتہ چلا لو کہ کہیں تمہارے اس کلرک کی منگنی نہ ہو چکی ہو اگر منگنی ہو گئی ہو تو اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں کیا جا سکے گا۔

بات معقول تھی۔ یوسف سے دریافت کیا تو اس نے منگنی سے انکار کر دیا۔ اب میری بیوی کا مشورہ یہ تھا کہ حسن کے ہاں جا کر ایک نظر اس کی بہن پر بھی ڈال لینی چاہیئے۔ کہیں زیادہ عمر کی نہ ہو۔

حسن سے اس کے ہاں جانے کا ذکر کیا تو وہ اس طرح خوش نظر آنے لگا جیسے اسے کوئی خوشخبری مل گئی ہے۔

وعدے کے مطابق اتوار کے دن ہم اس کے ہاں جا پہنچے۔ دو کمروں پر مشتمل اس کا گھر تھا لیکن ہمیں یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ ہر میں اعلیٰ درجے کا فرنیچر بڑی سلیقہ مندی سے رکھا ہوا ہے۔ ہر شے صاف ستھری تھی۔ اور اس وقت ہماری حیرت اور بڑھ گئی جب ہم نے حسن کی بہن کلثوم کو دیکھا اس نے ایسا لباس پہن رکھا تھا جو میری بیوی کو بھی میسر نہیں تھا۔ پھر اس نے اس خوش سلیقگی سے ہماری خاطر مدارات کی کہ میں تو متاثر تھا ہی میری بیوی مجھ سے بھی زیادہ متاثر ہوئی۔

ہم گھر سے نکلنے لگے تو حسن نے راستہ روک لیا۔

بیگم صاحب جی! میری کلثوم ہی میرے لئے سب کچھ ہے۔ میں اسے دیکھ دیکھ کر جیتا ہوں۔ بیگم صاحب جی! خوش خوش اپنے گھر میں رہے تو مجھے دنیا کی سب نعمتیں مل جائیں گی میری بس ایک حسرت ہے۔ اس کا جلدی بیاہ ہو جائے۔ ایک اندرونی جذبے سے اس کی آواز گلوگیر ہو رہی تھی۔ ہم نے اسے تسلی دی کہ اگر خدا نے چاہا تو تمہاری بہن کے ہاتھ جلد ہی پیلے ہو جائیں گے اور وہ اپنے گھر میں خوش رہے گی۔

میں نے یوسف کے باپ سے پوچھا کہ اگر آپ کے لڑکے کا رشتہ ایک ایسی لڑکی سے طے پا جائے جس کا باپ ڈرائیور ہو تو کیا آپ کو اعتراض ہوگا؟"

بولا "نہیں جناب! - اگر لڑکی سگھڑ ہے تو مجھے اس پر قطعاً کوئی اعتراض نہیں ہوگا کہ اس کا باپ ایک ڈرائیور ہے - میں خود کیا ہوں آخر ایک چھوٹی سی دکان میں بیٹھ کر ہلدی، مرچ، گرم مصالہ بیچنے والا۔ یوسف! آپ کا بیٹا ہے - اس کے رشتے کا آپ کو پورا پورا اختیار ہے"۔

"دونوں گھروں میں شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں اور ایک دن کلثوم دلہن بن کر یوسف کے گھر چلی گئی۔

دوسرے روز حسن میرے گھر آیا تو شکریہ ادا کرنے کی کوشش میں اس کے ہونٹوں سے الفاظ تک نہیں نکلتے تھے - میں نے دیکھا کہ اس کی پلکیں آنسوؤں سے بوجھل ہو گئی ہیں - یہ خوشی اور احسانمندی کے آنسو تھے۔

وہ بدستور اپنی ڈیوٹی پر آنے لگا - مگر میں نے محسوس کیا کہ اب اس میں پہلی سی پھرتی نہیں۔ کام باقاعدگی سے کر رہا تھا - اس لئے مجھے کچھ کہنے سننے کی کیا ضرورت تھی۔

ایک دن ہفتے کی شام کو آیا اور کہنے لگا۔

"صاب جی! - آپ نے مجھ پر ایسا احسان کیا ہے کہ میں جب تک زندہ ہوں - یہ بھول نہیں سکتا - میری کلثوم بڑی خوش ہے - اللہ آپ کو اس کا اجر دے - اور صاب جی! کل وہ جو ہمارے گھر کے سامنے خان صاحب رہتے ہیں نا وہی لال مکان والے - آپ کے دوست ہیں - وہ صاب جی! بال بچوں کے ساتھ مری گئے تھے وہ دیکھنے کے لئے جی - وہ کیا ہوتی ہے سنو۔"

اس نے فقرہ مکمل بھی نہیں کیا تھا کہ میرے بچے سنوفال سنوفال کا شور مچانے لگے۔

"لے چلوں گا - لے چلوں گا" حسن بھی شور مچانے لگا۔

نیز حسن [illegible] میں نے انکار اس وجہ سے کیا تھا کہ ایک تو بڑوں کا [illegible] رہا تھا اس کے علاوہ ایک دو روز [illegible] میں نے ایسا محسوس کیا تھا جیسے وہ ہمارے گاڑی سے نکلتے وقت اس کے

قدم ڈگمگانے لگے تھے۔

"صاب جی! میں اتنا گیا گزرا نہیں ہوں کہ بچوں کی یہ چھوٹی سی خواہش بھی پوری نہ کردں۔ آپ تنخواہ میں سے پٹرول کے پیسے کاٹ لیں۔"

"نہیں۔ تم شاید بیمار ہو۔ پٹرول کے خرچ کی تو کوئی بات نہیں۔"

"میں ٹھیک ہوں صاب جی! میں ٹھیک ہوں۔ بھلا مجھے کیا ہوا ہے۔ کل اتوار ہے۔ میں صبح آجاؤں گا۔ ہاں صاب جی! اجازت دیں تو اپنی کلثوم اور یوسف ــــ"

"کیوں نہیں۔ انہیں ضرور ساتھ لے آنا۔"

اتوار کا پورا دن بڑی مسرت کے عالم میں گزرا۔ سب نے خوب خوب لطف اٹھایا۔ مگر میں نے دیکھا کہ حسن گاڑی ہی میں زیادہ وقت بیٹھا رہا۔ باہر نکل کر گھوما پھرا نہیں۔

پیر کو بھی چھٹی تھی۔ حسن نہ آیا۔ منگل اور بدھ کے دن بھی گزر گئے۔ میں اس کے گھر جانا چاہتا تھا کہ بیوی نے منع کر دیا۔

"آدمی بیمار شیمار ہو جاتا ہے۔ چند روز اسے گھر میں آرام کر لینے دو۔"

آٹھ دن میں رکشے ہی میں دفتر آتا جاتا رہا۔ چار دن دفتر سے چھٹی لے کر عزیزوں کی شادیوں میں شرکت کی۔ اب تو اسے آجانا چاہیئے تھا۔ کیوں نہیں آیا۔ میں نے سوچا۔

دو دن اور گزرے تو اس کے ہاں گیا۔ دروازے پر دستک دی تو کلثوم آئی۔

"تمہارا بھائی کہیں بیمار تو نہیں؟" میں نے پوچھا۔

میرے الفاظ سن کر اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔

"کیوں کلثوم! کیا ہوا ہے؟"

"جی ۔ وہ تو ۔ وہ تو" اور کلثوم کی ہچکی بندھ گئی۔

بڑی مشکل سے اس نے بتایا کہ حسن مر گیا ہے۔

"کب؟"

"جس روز ـــ ہم مری سے آئے۔ وہ گھر آکر بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ ہم ہسپتال میں لے گئے ڈاکٹروں نے کہا انہیں سرطان ہے پرانا۔ اور ہفتے کی رات کو وہ چلے گئے۔ انہوں نے کبھی اپنی بیماری کا ذکر نہیں کیا تھا۔ وہ ۔ وہ "

"ہاں کلثوم بیٹی! وہ صرف تمہارے لئے جیتا تھا ـــ میں جانتا ہوں"

اور جب میں گھر کی طرف لوٹ رہا تھا تو حسن کے الفاظ بار بار میرے کانوں میں گونج اٹھتے تھے "میری کلثوم ہی میرے لئے سب کچھ ہے۔ میں اسے دیکھ دیکھ کر جیتا ہوں۔ میری بس ایک حسرت ہے۔ اس کا جلدی بیاہ ہو جائے۔

ایک منزل، کئی راہیں

اس رات راشد کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ کئی بار کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کر چکا تھا مگر نیند تو جیسے اس کی آنکھوں سے غائب ہو چکی تھی۔ اس سے پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں اسے ہر روز کم و بیش چودہ گھنٹے کام کرنا پڑتا تھا۔ اس کے بعد وہ اس قدر تھک جاتا تھا کہ بستر پہ لیٹتے ہی سو جاتا تھا۔ اس رات بھی غنودگی کا غبار اس کے اعصاب پر چھا گیا تھا مگر معاملہ یہیں تک رہا تھا، اور تھوڑی دیر بعد یہ غنودگی بھی ختم ہو گئی تھی۔

راشد پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر تھا، عام ڈاکٹروں کی طرح صحت مند، توانا، قوی، کسی ہسپتال سے وابستہ ہونے کی بجائے اس نے پرائیویٹ پریکٹس ہی کو ترجیح دی تھی اور اس سے اتنی آمدنی ہو جاتی تھی کہ جب سے ڈاکٹر بنا تھا معاشی مسئلہ گویا اس کی زندگی ہی سے نکل گیا تھا۔ مہینے میں تمام اخراجات پورے کر کے بھی، اس کی بچت کبھی ڈیڑھ اور کبھی دو ہزار ہو جاتی تھی جو وہ بنک میں جمع کرا دیتا تھا۔

اس کے پاس صرف اس کی ماں رہتی تھی، دونوں بھائی امریکہ میں تھے اور بہنیں بھی اپنے گھروں میں آباد ہو چکی تھیں اور لندن میں رہتی تھیں۔ ماں کی بڑی آرزو تھی کہ اس کے گھر میں بہو آئے، مگر وہ ابھی اس کے لئے تیار نہیں تھا، شاید وہ کسی اچھے وقت کا انتظار کر رہا تھا یا کسی ایسی لڑکی کی تلاش میں تھا جسے بخوشی اپنی رفیقۂ حیات بنا کر گھر میں لے آئے۔ ماں کا نقطۂ یہ خیال تھا کہ وہ خوشگوار مستقبل کے لئے روپیہ جمع کر رہا ہے اور یہ روپیہ ابھی کافی مقدار

میں فراہم نہیں ہوا۔

دُور سے گھڑیال کی آواز آنے لگی۔ ٹن ٹن کی آواز دو مرتبہ گونجی۔ دو بج گئے ہیں اور میں جاگ رہا ہوں۔ یہ احساس اسے عجیب سا لگا۔ وہ مریضوں کو بار ہا سکون آور دوا دے چکا تھا اور اس رات وہ خود سکون سے محروم تھا۔

وہ خود بھی دوا استعمال کر سکتا تھا لیکن اس کی چھٹی حس اسے بتا رہی تھی کہ اس کا جاگتے رہنا ہی ضروری ہے۔

"کہیں امی کو کوئی تکلیف تو نہیں۔" اور یہ سوچتے ہی اس نے اپنی خوابگاہ کا دروازہ آہستہ سے کھولا صحن کی بتی جلائی، اپنی امی کے کمرے میں جھانکنے کی کوشش کی۔ وہاں مکمل سکوت تھا، جو ظاہر کر رہا تھا کہ وہ گہری نیند سو رہی ہے۔

واپس کمرے میں آکر اس نے ٹیبل لیمپ روشن کیا اور کتابوں کے ریک سے ایک کتاب اٹھالی۔ طالب علمی کے زمانے میں ادبی کتابوں کا مطالعہ کرتا رہا تھا اس لئے اس کے یہاں میڈیکل کتابوں کے علاوہ کچھ شعر و ادب کے مجموعے بھی قرینے سے رکھے رہتے تھے جنہیں وہ کبھی کبھی فرصت کے اوقات میں کچھ دیر پڑھ لیتا تھا۔ اس وقت اس نے جو کتاب اٹھائی تھی وہ بانگِ درا تھی اس نے کتاب کھولی اور نظم کے عنوان پر اس کی نظر پڑی بھی نہیں تھی کہ یک لخت اسے یہ احساس ہوا کہ کوئی دروازے پر آیا ہے اور اس نے کال بیل پر اپنی انگلی رکھ دی ہے۔

رات کے وقت کسی مریض کے یہاں جاتے ہوئے اُسے خاصی تکلیف ہوتی تھی مگر وہ اسے ڈاکٹر کی ڈیوٹی سمجھ کر سہہ لیتا تھا کبھی اس نے اس معاملے میں شکوہ نہیں کیا تھا۔ اس کے کمرے کے دالان کی طرف کھلنے والی کھڑکی کا شیشہ چمک اٹھا تھا۔ دالان کی بتی جلائی گئی تھی۔

"امی کے سوا اور کون جلا سکتا ہے؟" اس نے سوچا اور دوسرے ہی لمحے میں اس کی امی کی آواز آئی۔

ڈاکٹر کو گوشت پوست کا نہیں لوہے کا آدمی سمجھتے ہیں ۔۔"

"کوئی آیا ہے امی ؟"

بوڑھی خاتون نے بیٹے کے سوال کا جواب دینے کے بجائے اپنا فقرہ مکمل کیا" جیسے آرام کی ضرورت نہیں ہوتی۔"

"کوئی بات نہیں امی مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔"

"کیوں راشد بیٹا ؟"

"پتہ نہیں امی ! کیوں ۔۔۔ ؟" اور وہ باہر جانے لگا۔ بیرونی دروازہ کھولا تو ہوا کا ایک تیز و تند جھونکا اس کے چہرے سے مَس کر کے کہیں چلا گیا۔ نیم روشن اور نیم تاریک فضا میں وہ آنے والے کا چہرہ نہ دیکھ سکا صرف آواز سن سکا۔

"جناب ڈاکٹر صاحب ! مہربانی کیجئے۔"

"کوئی SERIOUS CASE ہے ؟"

وہ رات کو آنے والے شخص سے یہ بات ضرور پوچھتا تھا۔

"جی ہاں ۔۔۔۔ مہربانی کیجئے۔"

دالان میں جو بلب جل رہا تھا اس کی روشنی میں اس وقت راشد اجنبی کے چہرے کو بخوبی دیکھ سکتا تھا لمبی ناک، کشادہ پیشانی، سر پر گھنگھریلے بال جن میں کوئی چیز چمک رہی تھی۔

"کہاں سے آئے ہیں ؟" راشد نے سوال کیا۔

"پرانی انار کلی سے ۔۔۔ جناب ! میں دوپہر آیا تھا آپ نے سکون آور گولیاں دی تھیں ۔۔۔ مریضہ کے لئے ۔۔۔ اب اس کی حالت بڑی خراب ہے جناب ! آپ کو یاد آ گیا ہوگا۔"

"ٹھیک ہے ۔۔۔ دن میں بے شمار مریض آتے ہیں۔"

"جناب ! ٹیکسی مل نہیں سکی ۔۔۔"

"چلتے ہیں۔" راشد اندر گیا، اس کی امی دروازے پر کھڑی تھی۔

"امی! قریب ہی جانا ہے، پرانی انارکلی میں، آپ سو جائیں، غفور کو آواز دے کر جگالیں دروازہ کھول دے گا۔" امی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ راشد نے میز کی درازمیں سے گاڑی کی چابی نکالی اور واپس جانے لگا۔

غفور کو جگانے کی ضرورت نہیں پڑی، وہ شور سن کر بیدار ہو چکا تھا اور گیراج کے پاس کھڑا تھا۔ دو منٹ بعد گاڑی سنسان روڈ پر چلی جا رہی تھی۔

ہوا میں تیزی اور تندی تھی، اوپر فضا میں بادل چھائے ہوئے تھے، بارش کا آغاز نہیں ہوا تھا، راہیں خاموش تھیں کبھی کبھی کوئی رکشا یا گاڑی قریب دکھائی دیتی تھی اور پھر نظروں سے اوجھل ہو جاتی تھی۔

اجنبی راشد کے پاس بیٹھا تھا، آگے کی طرف جھکا ہوا بار بار باہر دیکھ لیتا تھا۔ ایک مقام پر پہنچ کر اس نے راشد کو رکنے کے لئے کہا۔ گاڑی پرانی انارکلی کے وسطی حصے میں ایک دو منزلہ مکان کے سامنے ٹھہر گئی تھی۔

"آیئے ڈاکٹر صاحب" اس نے جلدی سے دوسری طرف جا کر گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔ وہ جب راشد کا بکس اٹھائے اس کے آگے آگے سیڑھیاں طے کر رہا تھا تو اس نے ذرا بلند آواز میں کہا: "ڈاکٹر صاحب آگئے ہیں۔"

کمرہ کافی وسیع تھا۔ ایک طرف پلنگ کے اوپر ایک لڑکی آنکھیں بند کئے نظر آرہی تھی۔

"یہ ہے مریضہ، ڈاکٹر صاحب!"

یہ الفاظ اس آدمی نے نہیں ایک خاتون نے کہے تھے جو کرسی کھسکا کر مریضہ کے پلنگ کے قریب لے گئی تھی۔

راشد نے کرسی پر بیٹھ کر مریضہ کی طرف غور سے دیکھا۔ لڑکی کیا تھی سنگ مرمر سے تراشی ہوئی ایک گڑیا تھی۔ سیاہ زلفیں رخساروں کو چھو رہی تھیں۔ اس طرح آہستہ آہستہ سانس لے رہی تھی کہ تنفس کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا۔

"کیا ہے اسے؟" راشد نے سوال کیا۔

خاتون نے جواب دیا: "معلوم نہیں ڈاکٹر صاحب! دو تین گھنٹے ہوئے اسی طرح پڑی ہے، بولتی نہیں، آنکھیں بھی نہیں کھولتی۔"

راشد نے نبض دیکھی، بہت کمزوری سے چل رہی تھی، ہاتھ بڑا گرم تھا، شدید بخار میں مبتلا تھی۔

"کیا نام ہے اس کا؟"

"فاخرہ ــــ میری چھوٹی بہن۔"

راشد نے دوبارہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اسے تین چار بار ہلایا۔ فاخرہ کہہ کر اسے پکارا بھی۔ مریضہ نے آنکھیں کھول دیں اور اسی لمحے وحشیانہ انداز میں بیٹھ گئی۔

"فاخرہ! یہ ڈاکٹر صاحب ہیں۔"

اس نے ایک بار گھور کر راشد کو دیکھا اور پھر آنکھیں جھکا لیں۔ اس کے ہونٹوں سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔

راشد اس سے اس کی تکلیف کے بارے میں دریافت کرتا، مگر وہ خاموشی سے کبھی اس پر ایک نگاہِ غلط انداز ڈال لیتی تھی اور کبھی اپنا رُخ دوسری طرف پھیر لیتی تھی۔ لگتا تھا وہ قوتِ گویائی سے محروم ہو گئی ہے یا اس کے اندر ایک ایسی کشمکش طاری ہے کہ کچھ کہنا اس کے لیے مشکل ہو گیا ہے۔

راشد نے اسے چیک اپ کیا۔ وہ حیران تھا کہ یہ لڑکی بظاہر تندرست معلوم ہوتی ہے پھر اس کی ایسی کیفیت کیوں ہے!

"کیا اسے ذہنی صدمہ تو نہیں پہنچا؟" ڈاکٹر نے پوچھا، اور جواب کا انتظار کرنے لگا۔ وہ آدمی بھی خاموش تھا اور وہ خاتون بھی۔ مگر خاتون کی آنکھوں سے کچھ ایسا تاثر ترشح تھا گویا دل کی بات کہنا چاہتی ہے مگر کہہ نہیں سکتی۔

"خیر ــــ یہ دوا دے دیتا ہوں ــــ صبح ٹھیک ہو جائے تو اسے میرے کلینک میں لائیے ــــ جلدی نہیں ــــ بارہ بجے کے قریب رش کم ہوتا ہے اچھی طرح دیکھوں گا۔" راشد نے یہ الفاظ مرد سے کہے تھے جو خاتون کے پاس کھڑا تھا۔

"بہتر جناب!"

راشد نے نسخہ لکھ دیا۔

"سوہسپتال کے پاس دو تین دکانیں کھلی ہوں گی۔"

"مجھے معلوم ہے جناب!"

مریضہ اسی طرح خاموش، بے حس و حرکت بیٹھی تھی۔ اس کی لانبی لانبی پلکوں نے آنکھوں کے نیچے سائے سے ڈال رکھے تھے۔

راشد جب گاڑی میں بیٹھا تو وہ شخص پوچھ رہا تھا،

"فیس، جناب!"

راشد نے دائیں ہاتھ کے اشارے سے "جو مناسب سمجھو دے دو" کا اظہار کیا۔ اس آدمی نے جیب سے نوٹوں کا ایک بنڈل نکالا اور راشد کے سامنے پیش کر دیا۔ راشد نے بغیر کسی اندازے کے چار پانچ نوٹ نکالے اور جیب میں ڈال لئے۔ بکس گاڑی کے اندر رکھا جا چکا تھا۔ راشد نے خدا حافظ کہا اور گاڑی سٹارٹ کر دی۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر وہ آرام کرسی میں دھنس گیا۔ سامنے کھڑکی کے دونوں پٹ کھلے تھے اور ہوا کے جھونکوں سے بار بار آپس میں ٹکرا کر کمرے کے سکوت کو مجروح کر رہے تھے۔ اس کی امی آ گئی۔ وہ اس سے یہ نہیں پوچھتی تھی کہ مریض یا مریضہ کا کیا حال ہے، اس کی بجائے وہ چائے کے لئے پوچھتی تھی۔

"پیو گے؟"

"نہیں، امی! ذرا آرام کروں گا، باہر سرد ہوا چل رہی ہے۔"

"خود کو ڈھانپ لونا ــــ گرم چائے ٹھیک رہے گی۔"

امی کمرے سے باہر نکل گئی۔ راشد نے اپنے پاؤں آرام کرسی کے آگے تپائی کے اوپر پھیلا دیئے۔ معاً اس کے سامنے مریضہ کی شکل آ گئی۔ وہ اس کا کوئی مرض تشخیص نہیں کر سکا تھا "کیا بیماری ہے اسے؟" اس نے خود سے سوال کیا، کوئی جسمانی بیماری تو نہیں ــــ پھر کیا نفسیاتی بیماری ہے۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کا چہرہ اس کے بالکل قریب آ گیا ہے۔ سفید رنگت جس میں کہیں کہیں لہو کی بہت ہی ہلکی اور مدھم سرخی، لانبی لانبی پلکیں، ہونٹ بھینچے ہوئے۔

وہ اپنے کلینک میں ہر روز کئی عورتوں اور لڑکیوں کو دیکھا کرتا تھا۔ کئی بار گھروں میں جا کر بھی اس نے متعدد ایسے چہرے دیکھے تھے جو حسین اور دلآویز کہے جا سکتے ہیں مگر آج تک کوئی چہرہ بھی کلینک سے یا کسی گھر سے اس کے ساتھ کمرے تک نہیں پہنچا تھا۔ چند منٹ آرام کرسی میں بیٹھ کر جب وہ گرم گرم چائے کے گھونٹ حلق سے اتارنے لگتا تھا اور اس کی امی گھریلو مسائل پر اس سے کچھ گفتگو کرتی تھی تو وہ دن بھر کی کارروائی بھول جاتا تھا اور جب کھانا کھانے کے بعد کمرے سے چہل قدمی کے لئے نکلتا تھا تو خود کو ایک نئے ماحول میں پاتا تھا۔ جہاں نہ تو مریضوں کی مرجھائی ہوئی کربناک صورتیں ہوتی تھیں اور نہ مختلف دواؤں کے تصورات اس کے ذہن کو پریشان کرتے تھے۔ مگر یہ عجیب بات تھی کہ اس رات اس نے جو چہرہ دیکھا تھا وہ ابھی تک اس کے ساتھ تھا وہ اس چہرے کے تمام خدوخال واضح طور پر دیکھ رہا تھا۔

"ضرور اس کی زندگی میں کوئی خاص واقعہ ہوا ہے ورنہ اچھی خاصی صحت مند ہے۔" اس نے سوچا "کسی واقعے کی وجہ سے وہ نفسیاتی مریضہ بنی ہے ــــ یہ واقعہ کیا ہو سکتا ہے۔ نوجوان لڑکیوں کو عام طور پر ایک ہی بیماری ہوتی ہے ــــ محبت میں ناکامی کے بعد کوئی نفسیاتی الجھن ــــ شاید اسے بھی ــــ ہو سکتا ہے ــــ علاج ممکن ہے۔"

"راشد بیٹا! کیا معاملہ ہے؟"

اس نے چونک کر دائیں طرف دیکھا، اس کی امی چائے کی پیالی ہاتھ میں لئے کھڑی تھی۔

"امی! کیوں تکلیف کی آپ نے؟"

اس کی امی نے زبان سے کوئی لفظ نہ کہا پیالی اس کے ہاتھ میں دے دی۔

"SERIOUS CASE ہے؟"

یہ سوال خلافِ معمول کیا گیا تھا۔

"نہیں امی! کوئی ایسی بات نہیں، ٹھیک ہو جائے گی۔"

"کوئی عورت ہے؟"

راشد نے سر کے اشارے سے ہاں کہہ دیا۔

امی دیر تک کھڑی تھی۔

"آپ آرام کریں امی! تھوڑی دیر کے لئے شاید میں بھی سو جاؤں گا۔"

وہ آہستہ آہستہ چائے پیتا رہا، کھڑکی کے پٹ زور سے ٹکرائے۔ اس نے ادھر دیکھا چاند ایک سیاہ بادل میں غائب ہو رہا تھا۔ اچانک پھر وہی چہرہ اس کے سامنے آگیا۔ پیالی اس کے ہونٹوں کے قریب آتے آتے رک گئی۔

"وہ آدمی اس کی حالت بتانے کے لئے کلینک میں آئے گا۔ اس کا مریضہ سے رشتہ کیا ہے۔ وہ خاتون تو اس کی بڑی بہن ہے۔ اس نے خود ہی بتا دیا تھا ــــــ"

ہوا زیادہ تیز و تند ہو گئی تھی کیونکہ کھڑکی کے پٹ زیادہ زور سے ٹکرا رہے تھے۔ اس نے دیکھا کہ کھڑکی کی طرف ایک ہاتھ بڑھ رہا ہے۔

"امی! ابھی تک یہیں ہیں اور کھڑکی کے پٹ بند کر رہی ہیں۔" وہ شرمندہ سا ہو گیا۔

چائے کی پیالی اس کے ہاتھ میں تھی جو قریب قریب خالی ہو چکی تھی۔ اس نے پیالی تپائی پر رکھ دی۔ پاؤں سمیٹے اور کھڑا ہو گیا۔

"امی!"

"تم آج کچھ فکرمند ہو ـــ ہاں یاد آیا، کوکب کی ماں آئی تھی ـــ" یہ کہہ کر اس کی امی نے بیٹے کے چہرے کو متجسس نظروں سے ٹٹولا۔ مگر جس جذبے کی اسے تلاش تھی وہ نظر نہ آیا۔

"ٹھیک ہے امی!"

ماں نے ایک بار پھر بیٹے کے چہرے کو غور سے دیکھا اور بولی:

"وہ امید باندھے بیٹھی ہے۔"

"امی!" راشد نے دو تین لمحے رک کر جواب دیا "دنیا میں کیسی کیسی امیدیں باندھی جاتی ہیں، کون کسی کو امید باندھنے سے روک سکتا ہے ـــ نہ میں ـــ نہ آپ۔"

"سوچنا تو چاہیئے۔"

"سوچ لیں گے امی! وقت آنے پر یہ بھی ہو جائے گا۔"

"وقت کب آئے گا؟"

"دیکھیے کب آتا ہے ـــ"

ماں چلی گئی آہستہ آہستہ قدم اٹھا کر، راشد نے محسوس کیا کہ وہ کچھ مایوس ہو کر گئی ہیں۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ ماں کو روک دے اور کہے "امی! ابھی مجھے کام کرنا ہے، مجھے شادی کی زنجیر میں کیوں جکڑتی ہو!"

مگر وہ خاموشی سے اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ دروازہ بند ہو گیا اور وہ کرسی میں نیم دراز ہو گیا۔

صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو کھڑکی کے شیشے چمک رہے تھے۔ "مائی گاڈ! اتنی دیر ہو گئی۔" وہ کرسی سے اٹھ بیٹھا، غفور چائے کی پیالی لیے دروازے سے داخل ہو رہا تھا۔

"تیسری بار آیا ہوں صاحب جی!"

"مجھے جگا دیا ہوتا بابا!"

راشد نے کلائی کی طرف دیکھا۔ سات بج گئے تھے۔ اس وقت تک تو وہ ناشتہ کرکے اخبار بھی دیکھ لیتا تھا۔ اس نے غفور سے چائے کی پیالی لے لی۔ چند گھونٹ لئے اور بولا:

"امی کیا کر رہی ہیں؟"

"جی صاحب جی! وہ آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔"

"ابھی آتا ہوں۔"

راشد باتھ روم میں چلا گیا ــــ اور جب ناشتے سے فارغ ہو کر گاڑی گیراج سے باہر نکال رہا تھا تو آٹھ بجنے میں چھ سات منٹ باقی تھے، وہ گرمیوں میں آٹھ بجے کلینک پہنچ جاتا تھا۔

اس روز مریضوں کا ہجوم کچھ زیادہ تھا، وہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ اس نے کمپونڈر کو ہدایت دے رکھی تھی کہ اس کے پاس ایک مرد اور اس کے بعد ایک عورت کو بھیجے۔ کوئی مریضہ اس کے سامنے سٹول پر بیٹھتی تھی تو وہ بے اختیار اس کی طرف دیکھتا تھا اور پھر جیسے ــــ اس سے مرض کی کیفیت پوچھنے لگتا تھا۔

ایک بجنے میں دس منٹ باقی تھے جب کلینک مریضوں سے خالی ہو گیا تھا۔

"بس جناب!" کمپونڈر کی آواز آئی۔

"دیکھو کوئی آیا ہے؟"

"جی کوئی نہیں۔"

وہ کلینک سے نکل کر عقبی حصے کی طرف جانے لگا جہاں وہ گاڑی کھڑی کیا کرتا تھا۔ اس نے موڑ پر جا کر کلینک کی طرف دیکھا۔ کمپونڈر بیرونی دروازے پر تالا لگا رہا تھا۔

کھانے کی میز پر ایک بوجھل خاموشی طاری رہی۔ اس کی امی ہر روز کوئی نہ کوئی نئی ڈش بناتی تھی اور اصرار کرکے بیٹے کو کھلاتی تھی۔ مگر اس روز اس نے کوئی نئی ڈش نہ دیکھی۔

"امی! آپ کی طبیعت ٹھیک ہے نا؟" اس نے پوچھا۔

"اللہ کا فضل ہے ۔۔۔ ٹھیک ہے ۔۔۔ آج میرا تجربہ ناکام ہو گیا ہے ڈش خراب ہو گئی۔

"تو آپ کی بجائے ڈش کی صحت خراب ہوئی" وہ ہنس پڑا۔ ماں مسکرانے لگی۔

"راشد بیٹا! تمہیں مرض اور صحت کے سوا اور کچھ نہیں سوجھتا"

راشد سمجھ گیا کہ امی کیا کہنا چاہتی ہے۔ اس نے انجانے پن سے کہا:

"امی! آپ نے مجھے ڈاکٹر جو بنا دیا ہے ۔۔۔ اس لئے میرا تعلق انہی دو چیزوں سے ہے۔"

ہاں بیٹا! ڈاکٹر کو دنیا میں کسی اور چیز سے واسطہ نہیں رکھنا چاہیئے۔ درست کہتے ہو"

امی کے لہجے میں ایک چھپا چھپا طنز تھا جسے راشد نے محسوس کر لیا تھا۔

کھانا کھانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اب چار بجے تک وہ فارغ تھا۔ پونے دو بج چکے تھے۔ دوبارہ کلینک میں جانے سے پہلے آرام کرنا ضروری تھا۔ وہ پلنگ پر لیٹ گیا۔ سو کر اٹھا۔ نہا دھو کر چائے پی تو کلینک میں جانے کا وقت ہو چکا تھا۔

"امی! جا رہا ہوں" اس نے معمول کے مطابق ماں کو اطلاع دی اور اس کی ڈھیر ساری دعاؤں کے سائے میں باہر نکلا۔ کلینک جاتے وقت اسے مریضوں ہی کا خیال ہوتا تھا۔ فیروز کی حالت زیادہ خراب تو ہو گئی ہو گی۔ فاطمہ نے شوہر کو باقاعدگی سے دوا دی ہے یا نہیں۔ ایسی ہی باتیں اس کے ذہن میں ابھرتی اور دوڑتی رہتی تھیں۔ مگر اس دن صرف اس مریضہ کے بارے میں سوچ رہا تھا جسے گذشتہ رات اس نے پرانی انارکلی کے ایک مکان میں دیکھا تھا۔

اسے اپنے ہر مریض سے ہمدردی ہو جاتی تھی۔ یہ اس کا شروع ہی سے رویہ تھا۔ اسے اس نئی مریضہ سے بھی ہمدردی تھی لیکن اس ہمدردی میں ایک ایسا جذبہ بھی شامل ہو گیا تھا جو ابھی تک اس کے لئے غیر مبہم تھا ۔۔۔ جسے وہ سمجھ نہیں سکتا تھا۔

اس شام بھی اس نے اس مریضہ کا انتظار کیا ۔۔۔ وہ نہ آئی۔

آٹھ بج چکے تھے۔ کلینک مریضوں سے خالی ہو گیا تھا۔ گھر جانا چاہیئے، امی منتظر ہوں گی ــــــ "اور یہی فیصلہ کر کے وہ گاڑی میں بیٹھا لیکن یہ دیکھ کر اسے حیرت ہوئی کہ اس کی گاڑی پرانی انارکلی کے اندر داخل ہو رہی تھی۔

تین بار ہارن دینے کے باوجود کھڑکی میں سے نہ کوئی چہرہ جھانکا اور نہ کوئی نیچے آیا۔ چوتھی بار ہارن دیا تو وہی شخص نیچے آیا جو اُسے اس گھر میں لے کر آیا تھا۔

"ڈاکٹر صاحب!" اس کے لہجے سے بڑی حیرت کا اظہار ہو رہا تھا۔

"میں نے سوچا آپ نے مریضہ کی حالت نہیں بتائی، زیادہ خراب نہ ہو گئی ہو۔"

"بڑی تکلیف کی ڈاکٹر صاحب! آپ نے۔"

سیڑھیاں طے کرتے ہوئے راشد نے پوچھا:

"دوا پلائی تھی؟"

"میری بیوی نے پلائی ہوگی، میں بازار سے لے آیا تھا۔"

مریضہ کی بڑی بہن نے خیر مقدم کیا۔

"میں نہیں گیا تو ڈاکٹر صاحب خود ناخرہ کو دیکھنے کے لئے آگئے ہیں۔"

ڈاکٹر صاحب! آپ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ نے بڑی تکلیف فرمائی، تشریف رکھیے۔ خاتون نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ راشد بیٹھ گیا اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔

"وہ نظر نہیں آ رہی۔"

"جی وہ اُوپر ہے اپنے کمرے میں۔ وہاں اس نے ایک لائبریری بنا رکھی ہے۔ زیادہ وقت وہیں گزارتی ہے۔ بلاتی ہوں۔"

خاتون دائیں طرف پردے کے پیچھے چلی گئی۔

"ابھی نہیں۔" راشد نے اسے واپس بلاتے ہوئے کہا۔

"دیکھیے مجھے کچھ پوچھنا ہے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو مجھے اپنی بہن کی کیس ہسٹری بتائیے۔

میرا مطلب ہے یہ بتایئے کہ کب سے اس کی ایسی حالت ہو گئی ہے۔ اس کا مرض شاید نفسیاتی ہے۔ بظاہر تندرست معلوم ہوتی ہے۔"

راشد نے دیکھا کہ خاتون کے چہرے پر ایسے تاثرات پھیل گئے ہیں جو اس کے دبے ہوئے کرب کی نشاندہی کر رہے ہیں۔ مرد جو راشد کے پاس کھڑا تھا دروازے کی طرف جانے لگا۔

"ڈاکٹر صاحب! آپ اس کے مرض کی تشخیص نہیں کر سکے۔"

"میں جسمانی مرض کی تشخیص کر سکتا ہوں۔"

"کیا اس کا مرض جسمانی نہیں ــــ! نہیں ہوگا ــــ آپ بہتر جانتے ہیں۔"

وہ دوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے کے کرب ناک اثرات شاید گہرے ہو گئے تھے یا راشد نے ایسا محسوس کیا تھا۔

"کل رات جب آپ کو زحمت دی اس کی حالت بڑی خراب ہو گئی تھی۔ آہستہ آہستہ سانس لینے لگی تھی چھت کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگی تھی، میں ڈر گئی۔ آپ نے جو دوا دی اس سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ اس کی بے چینی کم ہو گئی۔"

"کیا ممکن ہے کرب بے چینی عود کر آئے؟" راشد نے پوچھا۔

وہ خاموش رہی۔

ڈاکٹر صاحب! آپ نے درست کہا ہے اس کی زندگی میں ایک ایسا حادثہ ہو چکا ہے جس سے وہ نفسیاتی مریضہ بن گئی ہے۔"

"کیا ہے وہ حادثہ؟"

وہ سر جھکا کر کرسی کے بازو پہ ہاتھ پھیرنے لگی۔ راشد اس کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ شاید وہ اپنی بہن کے بارے میں کچھ کہتے ہوئے متذبذب ہے اس نے دو چار لمحے انتظار کیا، پھر بولا:

"میں ڈاکٹر ہوں، آپ کی بہن کا علاج کرنا چاہتا ہوں۔"

"میں سمجھتی ہوں۔ مگر ناخرہ کو یہ بات بالکل پسند نہیں کہ اس کی روداد کسی کو سنائی جانے وہ اوپر ہے، مجھے خدشہ ہے کہ جلدی نیچے نہ آ جائے۔ بڑبڑائے گی۔ اور کچھ نہیں کرے گی۔ تو زاروقطار رونا ہی شروع کر دے گی۔ ایسا دو مرتبہ ہو چکا ہے ہمارے ایک عزیز حکیم صاحب ہیں وہ آیا کرتے تھے، دو سال ہوئے کراچی جا چکے ہیں۔"

"وہ کچھ نہیں کر سکے؟" راشد نے پوچھا

"جی نہیں — کچھ نہیں — بہرحال آپ سنیئے، ہم دو بہنیں ہیں، بھائی کوئی نہیں۔ میرا نام ناصرہ ہے اور اس کا نام تو آپ سن ہی چکے ہیں۔ میری عمر چودہ برس اور ناخرہ کی سات برس کی تھی کہ جب ہمارے آبا جی دنیا سے چلے گئے تھے۔ آبا جی کے انتقال کے چھ سال بعد امی بھی رخصت ہو گئیں۔ میری منگنی امی اپنی زندگی میں کر چکی تھیں۔ ان کے چلے جانے کے ایک برس بعد میری شادی مسعود سے ہو گئی جو ہمارا دور کا رشتہ دار ہے اسکے سارے رشتہ دار عزیز کراچی میں ہیں اور میں ناخرہ کو کسی کے حوالے کر کے جا نہیں سکتی تھی اور ناخرہ اپنا گھر چھوڑنے پر رضامند نہیں تھی، اس لئے مسعود یہیں رہنے لگا۔"

ناصرہ کے ہونٹ آہستہ آہستہ حرکت کر رہے تھے اور اس کی آواز اس قدر دھیمی تھی کہ اسے سننے کے لئے راشد کو اس کی طرف جھکنا پڑا تھا۔

"مجھے اپنی بہن سے بےحد محبت ہے۔ شروع شروع میں مسعود اسے پسند نہیں کرتا تھا بلکہ عموماً اس سے شاکی رہتا تھا کیونکہ ناخرہ بہت اچھے اخلاق کی لڑکی ہے مگر کبھی کبھی ضدی بھی ہو جاتی ہے۔ اس وقت کسی کی نہیں سنتی۔ جب وہ حادثہ ہوا تو مسعود کا رویّہ بدل گیا اور وہ اس سے اچھا سلوک کرنے لگا۔"

"ناخرہ کا گھر بسانا ہمارا فرض تھا۔ ریاض مسعود کا دوست تھا اور اس کے دفتر میں ہی کام کرتا تھا۔ اس کے ماں باپ سے رشتے کی بات چیت ہونے لگی۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ ناخرہ ریاض کی دُلہن بن گئی اور اپنے نئے گھر میں چلی گئی۔"

"میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ذمے داری پوری ہو گئی۔ دونوں میاں بیوی میں ذہنی مطابقت پیدا ہو گئی تھی، اور یہ خوشگوار زندگی کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ مگر ابھی دو سال بھی نہیں گزرے تھے کہ فاخرہ اور اس کے شوہر میں کش مکش سی رہنے لگی۔

"میں سمجھتی تھی یہ کش مکش معمولی قسم کی ہے دور ہو جائے گی خاص طور پر اس حالت میں کہ فاخرہ ماں بننے والی تھی۔ لیکن میرا خیال درست نہ نکلا۔ ایک روز میں اس کے یہاں گئی تو وہ اپنے کمرے میں بری طرح ہانپ رہی تھی، مجھے دیکھتے ہی برس پڑی "باجی! آپ انہیں سمجھاتی کیوں نہیں، ہر وقت دوستوں میں گھرے رہتے ہیں، گھر کی ذرا پروا نہیں کرتے۔ میرا کوئی خیال نہیں کرتے۔"

میں نے کہا "فاخرہ! بات کیا ہے؟"

ریاض وہیں قالین پر بیٹھا تھا، بولا "آپا، میں بتاتا ہوں بات کیا ہے، یہ چاہتی ہے کہ میں ہر وقت گھر میں بیٹھا رہوں، ایک منٹ کے لئے بھی باہر نہ جاؤں۔ میں نے شادی کی ہے اپنے پاؤں میں زنجیر تو نہیں ڈلوائی۔"

فاخرہ کہتی تھی کہ وہ آدھی آدھی رات تک دوستوں کے پاس رہتا ہے اور ریاض گھر سے باہر رہنے میں خود کو حق بجانب سمجھتا تھا۔

میں نے بہن کو سمجھایا کہ بچہ ہو جائے گا تو تمہارے شوہر کی گھر سے دلچسپی خود بخود بڑھنے لگے گی، صبر سے کام لو۔ آنے والے وقت کا انتظار کرو۔

یہ اسی بڑی کش مکش کی ابتدا تھی جس نے دونوں کی زندگیوں میں زہر گھول دیا اور وہ ایک دوسرے سے بیزار رہنے لگے۔

"بچہ ہوا اور یوں لگا جیسے حالات سدھر جائیں گے اور ایک دوسرے کے خلاف شکایتوں کا طوفان ختم ہو جائے گا ـــ بظاہر میری توقع پوری ہو رہی تھی ـــ سلیم نے اپنے ماں باپ کو ایک بار پھر ایک دوجے کے قریب کر دیا تھا ـــ مگر طوفان جسے میں سمجھتی تھی کہ ختم ہو گیا ہے۔

ختم نہیں ہوا تھا صرف تھم گیا تھا:"

ناصرہ کہتے کہتے خاموش ہو گئی وہ سامنے پردے کو دیکھ رہی تھی جس کے پیچھے اوپر جانے کے لئے سیڑھیاں تھیں۔ پردے کو شاید جنبش ہوئی تھی یا ناصرہ نے ایسا محسوس کیا وہ کہنے لگی۔

"سلیم ایک سال کا ہو گیا تھا۔ دونوں کو اپنے بچے سے بے پناہ محبت تھی۔ دونوں اسے دیکھ دیکھ کر جیتے تھے۔ مگر ناصرہ یہ بات برداشت کرنے کے لئے ہرگز تیار نہ تھی کہ اس کا شوہر تین چار گھنٹے اپنے دوستوں میں گزارے اور کبھی کبھی رات کو بھی دیر سے آئے ـــــ دوسری طرف ریاض بھی اپنی برسوں کی عادت چھوڑنے کے لئے آمادہ نہیں تھا۔

"ایک رات وہ بڑی دیر سے آیا، ناصرہ نے کمرے کا دروازہ کھولنے سے انکار کر دیا۔ اچھا خاصا ہنگامہ برپا ہو گیا۔"

دروازہ کھلا تو ان میں سخت لڑائی ہوئی۔ ناصرہ نے کہہ دیا کہ اگر وہ اپنی عادت نہیں چھوڑتا تو وہ اس کے گھر میں نہیں رہے گی۔ اور ریاض کی انا بھی کسی طرح شکست ماننے کے لئے تیار نہ تھی۔

ریاض کے گھر والوں نے دونوں کو سمجھانے کی کوشش کی مگر یہ کوشش بے سود ثابت ہوئی ناصرہ صبح ہوتے ہی اپنی طرف سے شوہر کا گھر ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر ہمارے یہاں آگئی۔

ناصرہ اٹھی، سیڑھیوں والے پردے کی طرف گئی اور دوسرے لمحے واپس آگئی۔

"معاف کیجئے۔ میں اپنی بہن کے مزاج سے اچھی طرح واقف ہوں نا۔ میں یہ کہہ رہی تھی کہ ناصرہ بچے کو لے کر ادھر آگئی۔ حالات اس قدر ناخوشگوار اور تلخ ہو گئے تھے کہ وہ ریاض کا نام سننا بھی گوارا نہیں کرتی تھی۔ میں اس سے کہتی تھی دیکھو ناصرہ! یہ تمہاری بہن کا گھر ہے۔ تمہارا گھر وہی ہے جہاں تمہارا شوہر رہتا ہے۔ آخر تمہیں وہیں جانا ہے۔ کل کی بجائے آج ہی کیوں نہ چلی جاؤ! مگر وہ میری بات سن کر جھنجھلا جاتی تھی اور کہنے لگتی تھی" باجی! اگر تمہیں میرا یہاں رہنا ناگوار ہے تو میں کہیں اور چلی جاتی ہوں۔ کوئی نہ کوئی چھت مجھے پناہ دے ہی دے گی۔" میں

اس سے لپٹ جاتی۔" ایسا مت کہو ناظرہ! یہ چھت تمہارے ہی گھر کی چھت ہے جس کے سائے میں تم پلی بڑھی ہو۔ لیکن میری بہن! شادی کے بعد لڑکی کا گھر میکے کا نہیں سسرال کا گھر ہوتا ہے۔"

ناظرہ نے ایک لمبی آہ بھری۔ میری بہن نے اپنی ضد نہ چھوڑی اور ریاض نے اپنی انا کی چار دیواری سے باہر نکلنا پسند نہ کیا۔ دن گزرتے گئے۔ ننھا سلیم بیمار ہو گیا۔ میں نے بہن سے بہ منت کہا، جس طرح سلیم تمہارا بیٹا ہے ریاض کا بھی ہے۔"

" تو میں کیا کروں؟" وہ تلخ لہجے میں بولی۔

" اسے معلوم ہونا چاہیئے کہ اس کا بچہ بیمار ہے۔"

" تو کیا میں بیمار بچے کو گود میں لے کر بے غیرت بن کر اس کے دروازے پہ دستک دوں کہ اس کا علاج کراؤ۔ میں کچھ نہیں کر سکتی۔ میرے لئے دوا دارو کا انتظام کرنا مشکل ہے — باجی! کہیے آپ کی کیا یہی منشا ہے؟"

"نہیں، میری یہ منشا نہیں ہے۔"

"آپ کی جو منشا ہو، مجھے اس سے کوئی تعلق نہیں ہے، میں وہاں ہرگز نہیں جاؤں گی، میں اپنی ساری چیزیں بیچ دوں گی، اپنے بچے کا علاج کرواؤں گی۔"

میں نے سمجھ لیا کہ اس موضوع پہ گفتگو سے تلخی بڑھ جائے گی، خاموش ہو گئی۔

ریاض کو بچے کی علالت کی خبر مل گئی۔ وہ آیا۔ مجھے توقع تھی کہ اس موقع پر دونوں کے دل صاف ہو جائیں گے۔ وہ بچے کو اپنے گھر لے جانا چاہتا تھا تاکہ اس کا باقاعدہ علاج ہو سکے۔ مگر ناظرہ اس کے لئے تیار نہیں تھی۔

دونوں میں تلخ کلامی ہوئی۔ ریاض ذرا نرم پڑ جاتا، اگر ناظرہ ذرا تحمل سے کام لیتی۔ لیکن وہ تحمل کے اظہار سے باز ہی رہی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ریاض ایک ڈاکٹر کو لے آیا۔ اس نے نسخہ لکھا۔ ریاض دوائیں خرید کر لے آیا۔ وہ اس وقت بھی کہتا تھا کہ یہاں بچے کو باقاعدگی کے ساتھ دوا دینا ممکن نہیں ہو گا۔ مگر ناظرہ نے اس کی ایک نہ سنی۔ چنانچہ وہ سخت ناراض ہو کر

چلا گیا اور جاتے ہوئے کہہ گیا کہ وہ آئندہ اس گھر میں نہیں آئے گا۔

"میرے لئے یہ صورت حال بڑی اذیت ناک تھی۔ مگر کیا کر سکتی تھی۔ بے بس تھی۔ میں دیکھ رہی تھی کہ بچے کی حالت خراب ہوتی چلی جا رہی ہے۔ ناخرہ اس کے لئے وہ سب کچھ کرتی تھی جو ماں اپنے بچے کے لئے کر سکتی تھی۔ لیکن اس کی صحت گرتی ہی گئی۔"

سلیم ان دنوں خاموش رہا تھا۔ لگتا تھا اس کا بخار اتر گیا ہے اور وہ شام آ گئی جس نے میری بہن سے ساری خوشیاں چھین لیں۔ یہ شام عام شاموں سے مختلف تھی تیز و تند ہوا کے جھونکے چل رہے تھے۔ اندھیرا تیزی سے فضاؤں میں گھلنے لگا تھا ناخرہ اوپر اپنے کمرے میں تھی یکایک اس کی بھرائی ہوئی آواز "باجی" کہتے ہوئے سنائی دی۔

میں اوپر گئی۔ ناخرہ فرش پہ بے ہوش پڑی تھی۔ اس کے سر سے لہو بہہ رہا تھا اور سلیم پلنگ پر بے حس و حرکت پڑا تھا۔

بچے کو مرتے دیکھ کر، گھبرا کر وہ نیچے آنا چاہتی تھی کہ دروازے سے ٹکرا کر گر پڑی تھی اور اس کا سر پھٹ گیا تھا۔ میں نے اور میرے شوہر نے ناخرہ کو سنبھالا۔ اس کے سر کے زخم پر پٹی باندھی لیکن اس کے دل پر جو زخم لگ چکا تھا اس پر پٹی باندھنا ہمارے بس سے باہر تھا۔

ریاض آیا اور بچے کو دفناتے ہی چلا گیا۔ نہ بچے کی زندگی ان دونوں کو قریب لا سکی نہ موت۔ میری بہن اس حادثے کے بعد کھوئی کھوئی رہتی تھی جس طرف دیکھتی تھی دیکھتی ہی چلی جاتی تھی۔

اگر معاملہ یہیں تک رہتا تو حالات زیادہ نہیں بگڑ سکتے تھے۔ ریاض کینیا چلا گیا اور اس نے وہاں جاتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا کہ ناخرہ کو طلاق کا کاغذ بھیج دیا۔ رہی سہی اُمید بھی ختم ہو گئی۔

ڈاکٹر صاحب! میری بہن کچھ ابنارمل ہو گئی ہے ـــــ اس کے شب و روز کا صرف ایک ہی مصرف ہے اور وہ ہے کتابوں کا مطالعہ ـــــ نئی نئی کتابیں خرید کر لاتی رہتی ہے اور

اوپر بیٹھ کر مطالعہ کرتی رہتی ہے ۔

زندگی کے معمولات ٹھیک طور پر نہ سہی ـــــ بہرصورت پورے کرلیتی ہے ـــــ

شام کے وقت اس کی حالت خراب ہو جاتی ہے خاص طور پر ایسی شام کو جو طوفانی ہو

ـــــ کل ایسی ہی شام تھی ۔ وہ اوپر تھی ـــــ میں ایسے ماحول میں اسے تنہا نہیں چھوڑتی تھی۔

کل ایک ضروری کام کرتے ہوئے جلدی اوپر نہ جا سکی ۔ اوپر گئی تو وہ پلنگ پر لیٹی ہوئے

ہولے سانس لے رہی تھی ـــــ آنکھیں بند تھیں ۔

○

ناصرہ خاموش ہو گئی ۔ اب اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا ۔ راشد نے آنکھوں

سے عینک اتاری ، جیب سے رومال نکال کر اس کے شیشے صاف کرنے لگا ۔ یکایک ناصرہ

اٹھ بیٹھی ۔ سیڑھیوں والے پردے کی طرف گئی ۔ راشد نے رومال تہہ کر کے جیب میں ڈال لیا ۔

عینک آنکھوں پر لگا ہی رہا تھا کہ ناصرہ کی آواز آنے لگی :

" ناخرہ ، ناخرہ ! نہ بہن ، نہ بہن ! دیکھو ناخرہ ! "

راشد اُدھر جانے لگا ۔ اس نے پردہ ہٹایا ۔ ناخرہ دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھے اپنی سسکیاں

دبانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی ۔

" ناخرہ ! " راشد نے اپنے لہجے میں ممکن حد تک ملائمت پیدا کرتے ہوئے اسے مخاطب کیا ۔

ناخرہ تیزی سے سیڑھیاں طے کرنے لگی اور اوپر سے زور کے ساتھ دروازہ بند کرنے کی آواز آئی ۔

" دیکھا آپ نے ! " ناصرہ نے رندھے ہوئے گلے سے کہا ۔

" پریشان ہونے کی بات نہیں ، ابنارمل کیس ہے ۔ "

" نہ جانے کب سے یہاں کھڑی تھی ۔ اپنے متعلق کچھ بھی کہنا سننا نہیں چاہتی ۔ "

" بعض ابنارمل لوگوں کا یہی رویہ ہوتا ہے شاید اس نے دروازہ بند کر لیا ہے ۔ "

" جی ہاں ! مشکل ہی سے کھولے گی ۔ "

راشد کا ذہن متذبذب ہو گیا تھا اور جا کر اسے دروازہ کھولنے کے لئے کہے یا اس حرکت

سے باز رہے۔ ناصرہ نے اس کے چہرے سے دلی کیفیت کا اندازہ لگا لیا۔

"ڈاکٹر صاحب! آئیے بیٹھ جائیے۔ آپ کا وقت ضائع ہو رہا ہے۔ بہت قیمتی وقت ہے آپ کا۔" اور ناصرہ واپس آنے لگی۔ راشد بھی آہستہ آہستہ قدم اٹھانے لگا۔ دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

"میرا ایک دوست ہے، دماغی امراض کا معالج، میرا خیال ہے ___"

راشد فقرہ مکمل نہ کر سکا۔ ناصرہ نفی میں اپنا سر ہلانے لگی۔

"انسان کو ہر طرح کوشش کرنی چاہیئے ___"

"مگر یہ جائے گی نہیں ڈاکٹر صاحب!" ناصرہ کا حتمی جواب تھا

"میں ڈاکٹر سے وقت مقرر کر لوں گا، اس وقت آؤں گا ___"

"ڈاکٹر صاحب! آپ بڑی تکلیف کر رہے ہیں ___ آپ ___" ناصرہ کی سمجھ میں نہ آیا کہ اپنے جذبات کا کس طرح اظہار کرے!

"ناصرہ! اگر میرے تکلیف کرنے سے کسی کی حالت سدھر جائے تو میں اسے تکلیف نہیں کہوں گا۔"

راشد نیچے اتر گیا۔

وہ کبھی دیر سے گھر آتا تھا تو ماں اس سے تاخیر کی وجہ نہیں پوچھتی تھی صرف یہ پوچھ لیتی تھی: "راشد بیٹا! مریض کی حالت اچھی ہے؟" وہ سمجھتی تھی کہ اس کا بیٹا ضرور کسی مریض کے گھر سے آ رہا ہے۔ اس نے یہی سوال کیا۔

"نفسیاتی بیماری ہے اسے۔"

"کیوں؟"

"اس کی زندگی میں ایک حادثہ ہوا ہے ___ بلکہ دو حادثے ہوئے ہیں ___ بائیس تئیس برس کی لڑکی ہے۔"

"اللہ رحم کرے ــــ" اور وہ کھانا لانے کے لئے باورچی خانے کی طرف جانے لگی۔

سونے سے پہلے اس نے ماں کو فاخرہ کی ساری روداد سنا دی اور وہ اس کی صحت کے لئے دعا کر کے سونے کے لئے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

راشد کے دماغ میں دو تین بار یہ سوال اُبھرا "اگر وہ جانے کے لئے آمادہ نہ ہوئی تو ــ" اس سے وہ پریشان ہو جاتا تھا ــــ مگر دوسرے روز کلینک میں جا کر اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ ڈاکٹر لطیف کو رنگ کیا اور اس سے تین بجے کا وقت مقرر کر لیا۔

کلینک سے فارغ ہوا تو لوٹنا ایک بج چکا تھا۔ سوا دو بجے وہ کپڑے پہن کر تیار ہو گیا تو ماں نے پوچھا:

"خیر تو ہے بیٹا؟"

"امی! میں نے آپ کو بتایا نہیں تھا کہ اس لڑکی کو ڈاکٹر لطیف کے ہاں لے جانا ہے؟"

وہ اثبات میں سر ہلانے لگی "بتایا تھا۔"

مسعود اُن کی پہلی آواز پر ہی نیچے آ گیا۔

راشد گاڑی سے نکلنے لگا۔

"ڈاکٹر صاحب! وہ نہیں جائے گی۔ بڑی ضدی لڑکی ہے۔ بہن نے بات کی تھی تو وہ زور زور سے رونے لگی تھی۔"

"چلئے تو سہی، دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے!"

راشد مسعود کے ساتھ اُوپر آ گیا، نامرہ دروازے پر کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ مایوس دکھائی دیتا تھا۔ اس مایوسی کے عالم میں وہ راشد کا خیر مقدم بھی نہ کر سکی۔ وہیں کھڑی رہی۔

"کہاں ہے؟" راشد نے پوچھا۔

نامرہ نے سر کے اشارے سے کہہ دیا: "اوپر ہے۔"

"نیچے نہیں آئے گی؟"

"اس نے تو آج کھانا بھی نہیں کھایا۔ میں نے صرف یہ کہہ دیا تھا کہ ڈاکٹر کے پاس جانا ہے بس بگڑ گئی۔ اور کہنے لگی میرے ساتھ یہ مذاق کرنا چھوڑ دیں"

"کوئی بات نہیں، میں اوپر چلتا ہوں"

راشد پردے کی طرف چلنے لگا۔ مسعود نے تیزی سے جا کر پردہ ہٹا دیا۔ چند سیڑھیوں کے بعد راشد اور ناصرہ فاخرہ کے کمرے میں تھے۔

کمرہ مختصر تھا فرنیچر بھی مختصر تھا۔ مگر صاف ستھرا معلوم ہوتا تھا کہ فاخرہ نے سامان رکھنے اور کتابوں کو ترتیب کے ساتھ سجانے میں بڑے اچھے اور صاف ستھرے ذوق کا ثبوت دیا ہے کہیں بھی پراگندگی اور انتشار کا احساس نہیں ہوتا تھا۔

جب راشد اور ناصرہ کمرے میں پہنچے تو وہ کرسی میں دھنسی کسی کتاب کا مطالعہ کر رہی تھی۔ راشد کو اپنے کمرے میں دیکھ کر حیران رہ گئی۔ کرسی سے اٹھ بیٹھی۔ راشد اس سے مخاطب ہو کر کہنے لگا:

"معاف کیجئے، آپ کے مطالعے میں مداخلت کی ہے۔ معاف کر دیا ہے نا آپ نے؟"

فاخرہ دو تین لمحے خاموش رہنے کے بعد بولی:

"فرمایئے!"

"فرمانا وانا کیا ہے فاخرہ! تمہارے پاس اس امید کے ساتھ آیا ہوں کہ تم میری مدد کرو گی۔"

فاخرہ نے اسے گھور کر دیکھا اور پھر جلدی سے آنکھیں جھکا لیں۔

"معاملہ یہ ہے کہ ایک بہت اچھی لڑکی ہے، ذرا بے وقوف ہے"

راشد مسکرانے لگا۔

"یہ لڑکی اپنی برائی اور بھلائی سے بے نیاز ہے۔ میں چاہتا ہوں تم میری مدد کرو"

ناصرہ بڑی سنجیدہ تھی مگر راشد کے یہ الفاظ سن کے مسکرا اٹھی۔

"مدیوں کہ اسے ذرا! میرے جانا ہے ڈاکٹر کے پاس۔ اس میں اس کی اپنی بھلائی ہے

فاخرہ! کیا تم میری مدد نہیں کرو گی ــــ مجھے مایوس کرو گی؟"

فاخرہ کا سر جھکا ہوا تھا۔ راشد اور ناصرہ ــــ دونوں اس کے جواب کا انتظار کر رہے تھے۔ اس نے سر ذرا اٹھایا اور کرب ناک لہجے میں بولی:

"یہ سب فضول ہے ــــ بے سود ہے ــــ کچھ نہیں ہو گا ــــ کچھ نہیں ہو سکتا۔"

راشد اس کے اور قریب ہو گیا۔

"تم درست کہتی ہو ــــ مگر مستقبل کے متعلق کوئی شخص کوئی بات بھی وثوق سے نہیں کہہ سکتا ــــ انسان کو ہر حال بہتری کی توقع رکھنی چاہیئے۔ میں نے درست کہا ہے نا؟"

فاخرہ نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اب ٹکٹکی باندھ کتابوں کے ایک ریک کو دیکھ رہی تھی۔

"چلو فاخرہ!"

"چلیے، آتی ہوں۔"

ناصرہ کو یہ الفاظ سن کر اتنی حیرت ہوئی کہ وہ راشد کے لئے دروازے کا پردہ بھی نہ ہٹا سکی یہ کام راشد نے خود کیا۔

راشد کو گاڑی میں بیٹھے چھ سات منٹ گزرے ہوں گے کہ دونوں بہنیں آ گئیں۔ فاخرہ نے لباس بدل لیا تھا۔

"شکریہ! مجھے یہی امید تھی۔" یہ کہہ کر راشد نے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول دیا۔ دونوں بہنیں اندر بیٹھ گئیں۔ راستے میں خاموشی رہی یہاں تک کہ گاڑی ڈیوس روڈ کی ایک کوٹھی کے پورچ میں جا رکی۔

راشد نے گاڑی کا دروازہ کھول دیا، پھر کال بیل پر انگلی رکھ دی۔ ملازم نے انہیں ایک کمرے میں بٹھا دیا۔ ڈاکٹر لطیف آیا۔ سن پچاس سے اوپر۔ چہرے پر ملائمت۔ آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک۔

تینوں کھڑے ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر لطیف نے پہلی ہی نظر میں بھانپ لیا کہ مریضہ کون ہے۔
وہ فاخرہ سے مخاطب ہوا۔
"بیٹی! آپ کا نام فاخرہ ہے شاید"
فاخرہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
"تو آپ آیئے ذرا میرے ساتھ"
فاخرہ سوالیہ نظروں سے بہن کو دیکھنے لگی۔
ناصرہ کے ذہن میں کوئی بات نہ آئی جب دو تین لمحے گزر گئے تو راشد نے فاخرہ سے مخاطب ہو کر کہا:
"یہ ڈاکٹر ہیں ـــ اور بڑے ہمدرد انسان ہیں"
فاخرہ اٹھ بیٹھی اور ڈاکٹر لطیف کے ساتھ کمرے سے نکل گئی۔
"ڈاکٹر صاحب کیا پوچھیں گے" ناصرہ نے سوال کیا۔
"جو مناسب سمجھیں گے پوچھیں گے جو کچھ ہو گا بہتر ہو گا۔"
ناصرہ مطمئن نظر نہیں آتی تھی، تاہم وہ خاموش ہو گئی مگر ہر ایک آدھ منٹ کے بعد دروازے کی طرف دیکھ لیتی تھی۔
ڈاکٹر لطیف کا نوکر چائے کی ٹرالی لے کر آ گیا اور ٹرالی ان کے قریب روک کر چائے بنانے لگا۔ جب چائے پی گئی، ڈاکٹر لطیف اور فاخرہ آ گئے۔
"ڈاکٹر راشد صاحب! فاخرہ بہت ہی اچھی لڑکی ہے ـــ ماشاء اللہ بڑی ذہین، عقلمند" ڈاکٹر لطیف نے فاخرہ کو بہن کے ساتھ صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
راشد نے مسکرا کر جواب دیا۔
"میں آپ کی تائید کرتا ہوں ڈاکٹر صاحب!"
فاخرہ بڑی طرح جھینپ رہی تھی۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا ورنہ بہن کے پیچھے چھپ جاتی۔

"چائے؟" ڈاکٹر لطیف نے فاخرہ سے پوچھا۔

"جی نہیں، میں چائے نہیں پیوں گی۔"

"نہیں جی چاہتا تو نہ سہی۔ ہاں ڈاکٹر صاحب! فاخرہ کو ابھی لانا ہوگا — آج کا کام ختم۔"

"بہتر۔" راشد نے کہا۔

فاخرہ گاڑی میں اس طرح بیٹھی تھی جیسے وہ اپنے دل پر ایک بوجھ سا محسوس کر رہی ہے۔ سارا راستہ وہ اسی طرح گم سم بیٹھی رہی۔

دوسرے روز بھی راشد، ناصرہ اور فاخرہ ڈاکٹر لطیف کے ہاں وقتِ مقررہ پر پہنچ گئے۔ یہ نشست پندرہ منٹ تک رہی۔ تیسرے روز بھی فاخرہ کو جانا تھا۔ ناصرہ تیار ہو رہی تھی کہ گھر میں مہمان آ گئے۔

"ڈاکٹر صاحب! کل جائیں گے آج نہیں —" ناصرہ نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

"ناغہ تو نہیں ہونا چاہیئے۔"

"پھر؟"

"میں لے جاؤں گا۔"

"اتنی تکلیف کریں گے!"

"روز کرو نہیں رہا۔"

راشد نے فاخرہ کو گاڑی میں بٹھایا اور ڈاکٹر لطیف کے ہاں لے گیا۔ وہ کمرے میں بیٹھا چائے پی رہا تھا کہ ڈاکٹر لطیف آ گیا۔

"ڈاکٹر صاحب!"

"کہیے۔"

"یہ لڑکی فاخرہ آپ کی کوئی عزیزہ تو نہیں، جیسا کہ آپ نے ٹیلیفون پر بتایا تھا۔ بہرحال آپ اسے اپنے ساتھ لائے ہیں، میں اس سے جو کچھ پوچھ سکا ہوں اس سے میں ایک نتیجے پر

پہنچ گیا ہوں ـــــ یہ لڑکی محزونی کا بڑی طرح شکار ہو چکی ہے۔ یہ محزونی دور ہونی چاہیئے۔"

"کس طرح ڈاکٹر لطیف صاحب؟"

"اس کی گود میں بچہ ہونا چاہیئے ـــــ یہی اس کا نفسیاتی علاج ہے۔"

راشد سوچ میں پڑ گیا۔

"بدقسمتی سے اسے طلاق مل چکی ہے ـــــ ہمارے معاشرے میں مطلقہ عورت کی شادی ایک بہت بڑا مسئلہ بن جاتی ہے۔" راشد نے اس معاملے کی پیچیدگی واضح کرتے ہوئے کہا۔

"علاج بس یہی ہے۔" ڈاکٹر لطیف نے حتمی طور پر کہہ دیا۔

"اچھا ڈاکٹر صاحب! میں ذاتی طور سے آپ کا بیحد ممنون ہوں۔" راشد نے ممنونیت سے لبریز لہجے میں کہا۔

"چھوڑیئے ڈاکٹر صاحب! اس FORMALITY کی کیا ضرورت ہے ـــــ"

فاخرہ دروازے سے اندر داخل ہو چکی تھی۔

"چلو فاخرہ!" راشد اس کی طرف جانے لگا۔

وہ اس کے پہلو میں سر جھکائے بیٹھی تھی۔ گاڑی کدھر جا رہی تھی، یہ بات فاخرہ کو معلوم نہیں تھی، جب وہ رُکی تو اس نے سر اٹھایا۔ اس کے سامنے دُور، دُور تک درخت کھڑے تھے پھولوں کے پودے تھے اور کوئی مکان دکھائی نہیں دیتا تھا۔

"یہ کہاں لے آئے ہیں ڈاکٹر صاحب!" یہ سوال فاخرہ کے ہونٹوں پر آتے آتے رُک گیا۔

راشد نے اپنی جگہ سے اتر کر دوسری طرف جا کر گاڑی کا دروازہ کھولا، فاخرہ نیچے اتر گئی۔

"شاید تم حیران ہو کہ میں تمہیں گھر میں پہنچانے کے بجائے باغ جناح میں کیوں لے آیا ہوں"

"شاید نہیں یقیناً۔"

"میری مراد یقیناً ہی سے تھی۔" راشد نے مسکرا کر کہا "آؤ ذرا ادھر چلیں۔" اور راشد فاخرہ کو ایک شاداب جگہ پر لے آیا اور بیٹھ گیا، فاخرہ کھڑی رہی۔ "بیٹھ جاؤ" اور وہ بیٹھ گئی ـــــ بنچ پر ـــــ

اس سے کچھ دُور۔

"فاخرہ! میں ایک سوال کرنا چاہتا تھا۔"

"جی۔"

"ذرا یہ بتاؤ تمہارے خیال میں میں کیسا آدمی ہوں؟"

اس عجیب سوال پر فاخرہ نے چونک کر راشد کو دیکھا۔

"جواب دو۔"

"آپ ــــ ڈاکٹر صاحب بہت اچھے ــــ یعنی فرشتہ ہیں۔"

"نہیں بھئی نہیں، میں تم سے متفق نہیں ہوں۔ میں فرشتہ نہیں انسان ہوں اور انسان ہی رہنا چاہتا ہوں، تم مجھے انسان یا زیادہ سے زیادہ ایک اچھا انسان کہہ سکتی ہو ــــ اگر پسند کرو تو ــــ کیا یہ پسند کرتی ہو؟"

"ہوں۔"

"گویا میں ایک اچھا انسان ہوں ــــ فاخرہ! کیا تم اس اچھے انسان کا ساتھ دو گی؟"

"جی؟" فاخرہ کے چہرے پر حیرت و استعجاب کا تاثر پھیل گیا اور پھر یہ تاثر شرم و حیا کی سرخی میں ڈوب گیا۔

"اسی سوال کا جواب سننے کے لیے میں تمہیں یہاں لایا ہوں۔"

فاخرہ کو یہ آواز دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اسے لگا جیسے یہ آواز ہوا کے ایک تیز جھونکے میں لپٹی ہوئی آئی ہے اور دوسرے ہی لمحے میں جھونکا کہیں دور نکل گیا ہے۔ وہ سامنے ایک پودے کو دیکھ رہی تھی جس کی پھولوں بھری شاخیں لہلہا رہی تھیں۔

"مجھے جواب دو فاخرہ!" راشد کی آواز اس کے کانوں میں گونجی۔ اچانک اس کی نظریں پودے سے ہٹ کر اس پر پڑیں۔ وہ بڑے غور سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

"آپ نے ایسا کیوں سوچا؟"

"اس لئے سوچا کہ تمہیں میں بہت پسند کرتا ہوں۔"

"آپ جانتے ہیں کہ ـــــ" فاخرہ فقرہ مکمل نہ کر سکی۔

"میں سب کچھ جانتا ہوں فاخرہ! اور یہ بھی جانتا ہوں کہ ہماری زندگی پُرمسرت ہوگی۔ ہم خوش رہیں گے۔"

"ڈاکٹر صاحب" فاخرہ کچھ مضطرب ہوگئی تھی "باجی پریشان ہوں گی۔"

"یہاں سے سیدھا گھر جائیں گے ـــــ مگر میں چاہتا ہوں کہ جانے سے پیشتر میں نے جو بات سوچی ہے اس کے بارے میں تمہاری رائے معلوم کروں۔"

"میں ـــــ کیا ـــــ کیا ـــــ کہوں؟"

"ٹھیک ہی تم نے جواب دے دیا ہے ـــــ" راشد کے چہرے پر مسکراہٹ کی لہریں پھیل گئی تھیں۔ چائے کی میز پر راشد کی امی فارغ ہوگئی تھی۔ مگر راشد ایک گھونٹ کے بعد دو تین لمحے توقف کرتا تھا پھر پیالی دوبارہ ہونٹوں تک لے جاتا تھا۔ ماں تین چار بار کنکھیوں سے اسے دیکھ چکی تھی بیٹے کا یہ انداز اس کے لئے خلافِ معمول تھا۔

پیالی شاید نصف کے قریب ہی خالی ہوئی تھی کہ راشد نے اسے میز کے اُوپر رکھ دیا۔ نیپکن سے منہ پونچھا، ماں اس وقت بھی اسے کنکھیوں سے دیکھ رہی تھی۔

"راشد بیٹا!"

"کہیے امی!"

"کیا ہوا تمہارے اس کیس کا، وہ نا ـــــ نفسیاتی کیس؟"

راشد بے خیالی میں دوبارہ منہ پونچھنے لگا۔

"وہ ـــــ ٹھیک ہے، ڈاکٹر لطیف نے اپنا مشورہ دے دیا ہے ـــــ"

وہ اپنی کرسی سے اٹھ بیٹھا۔ ماں اس سے پہلے اٹھ بیٹھتی تھی مگر اس روز بیٹھی رہی۔

"امی!"

"کہو۔"

"مجھے کچھ ـــــ آپ سے کہنا ہے۔"

"میں جانتی تھی آج میرے بیٹے کو مجھ سے کوئی بات کہنی ہے، انتظار کر رہی تھی۔"

"آپ کو کیسے معلوم ہو گیا؟"

"بیٹا! بعض باتیں بغیر کسی خاص وجہ کے معلوم ہو جاتی ہیں۔ بیٹھ جاؤ۔ اطمینان سے کہو۔"

راشد بیٹھ گیا۔

"امی! میں اس لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

امی نے کرسی پر پہلو بدلا۔

"کس لڑکی سے بیٹا؟"

"فاخرہ سے۔"

"فاخرہ ـــــ یہ وہی لڑکی تو نہیں جو نفسیاتی ـــــ"

"جی امی!"

امی اپنا دایاں ہاتھ پیشانی پر پھیرنے لگی۔

"امی! اس کے لئے میرے پاس صرف ایک ہی دلیل ہے ـــــ اور وہ دلیل یہ ہے کہ میں ایسا چاہتا ہوں، اس میں میری خوشی ہے ـــــ"

بوڑھی آنکھیں جو زندگی کے بے شمار رنگ دیکھ چکی تھیں اپنے بیٹے کا ایک ایسا رنگ دیکھ رہی تھیں جو اس کی توقع کے خلاف تھا لیکن اس کا کہن سالہ تجربہ بتا رہا تھا کہ بیٹے کے اس رنگ کے پیچھے اس کے دل کا عزم اور قوی ارادہ کارفرما ہے۔ بولی:

"تو تم نے اپنی رفیقۂ حیات کا انتخاب کر لیا ہے!"

"جی امی!"

"میں یہ نہیں پوچھوں گی کہ تم نے اس لڑکی میں جو بقول تمہارے اپنے ایک نفسیاتی مریضہ

ہے کیا خوبیاں دیکھی ہیں ۔۔۔ تم کیوں اس کی ذات سے متاثر ہو گئے ہو۔ ماشاء اللہ عقلمند ہو۔ اپنی بھلائی برائی خوب سمجھ سکتے ہو۔ فقط ایک سوال کروں گی۔ میں کوکب کی ماں کو کیا جواب دوں گی؟"

"ماں نے وہی سوال پوچھ لیا تھا جس کا اسے اندیشہ تھا۔ اس نے دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

"یہ نہیں امی! کہ میں نے اس پر غور نہ کیا ہو۔۔۔ غور کیا ہے ۔۔۔ مگر دیکھئے نا کوکب کا بڑا خوشحال گھرانا ہے شادی ایسے گھرانے میں کوئی پرابلم نہیں بن سکتی۔"

"کچھ جذباتی باتیں بھی ہوتی ہیں بیٹا! دولت ہر مسئلہ حل نہیں کر سکتی۔"

"جذباتی باتیں تو ۔۔۔ امی! جذباتی باتیں کیا ہوں گی ۔۔۔" اس نے اپنی طرف سے ناراں بننے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"میں جانتی ہوں تم نے ان پر غور نہیں کیا ہو گا ۔۔۔ بہرحال میرے لئے یہی دلیل کافی ہے کہ اس میں میرے بیٹے کی خوشی ہے۔ اللہ بہتر کرے گا ۔۔۔ ٹھیک ہے۔"

راشد کی نظر دیواری کلاک پر پڑی۔ پونے نو ہو چکے تھے۔ ابھی اسے لباس بدلنا ہے۔ وہ اوپر جانے لگا۔ ماں وہیں بیٹھی رہی۔ پانچ چھ منٹ کے بعد نیچے آیا اور بولا۔

"امی! آپ بات کریں گی وہاں ۔۔۔ یعنی ۔۔۔ فاخرہ کے گھر جا کر۔"

"یہ بات بھی تمہیں کہنا چاہیئے تھی؟"

راشد کچھ محجوب ہو گیا۔

"میں جانتا ہوں میری امی بہت ہی پیاری امی ہے۔" اور وہ بے اختیار ماں سے لپٹ گیا۔

○

ساڑھے نو بج چکے تھے۔ کلینک کو معمول کے مطابق آدھ گھنٹہ پہلے بند ہو جانا چاہیئے تھا مگر اس شام مریضوں کا رش کچھ زیادہ تھا۔ راشد تھک چکا تھا۔ اس نے اپنے کمپونڈر کو آواز دی:

"فاگن! کوئی ہے؟"

فیاض اندر آ گیا۔

"مسر! ایک خاتون بیٹھی ہے۔"

"بھیج دو اسے۔"

فیاض ڈسپنسری میں واپس چلا گیا۔

راشد پیشانی دائیں ہاتھ سے لگائے اور بائیں کہنی میز پر ٹکائے مضمحل انداز میں بیٹھا تھا کہ اسے کپڑوں کی سرسراہٹ کا احساس ہوا۔

"فرمایئے کیا تکلیف ہے؟" اس نے مریضہ کی طرف آنکھ اٹھائے بغیر کہا۔

"بہت تکلیف ہے ڈاکٹر صاحب!"

یہ آواز سنتے ہی راشد نے بے اختیاری کے عالم میں اپنے سامنے دیکھا۔ کوکب مریضوں کے سٹول پر بیٹھی تھی ـــــ ایک خوبرو، دراز قد، قیمتی ساڑھی میں ملبوس، نیلی آنکھیں جن میں بڑی گہرائی تھی۔

"کوکب ـــــ تم! یہ کیا مذاق ہے آخر۔ اس طرح آنے کی ضرورت کیا تھی؟"

"مریض اسی طرح ہی تو ڈاکٹر کے پاس آتا ہے، بتایئے اور کس طرح آتا ہے؟"

راشد نے اپنے ہاتھ کے اشارے سے کوکب کو خاموش رہنے کے لئے کہا اور کمپونڈر کو بلا کر کہا کہ وہ تالے چابیاں میز پر رکھ کر چلا جائے ـــــ وہ یہ حکم سن کر چلا گیا۔

"آج آپ کی امی آئی تھیں ـــــ اور انہوں نے وہ کچھ بتا دیا تھا جس کی کبھی توقع نہیں کی جا سکتی تھی" کوکب نے اپنی مترنم آواز میں یہ الفاظ کہہ کر ایک خاص توقع کے ساتھ راشد کو دیکھا۔

"کوکب! کیوں آخر اس کی توقع کیوں نہیں کی جا سکتی تھی؟"

"اس لئے نہیں کی جا سکتی تھی کہ آپ ڈاکٹر ہیں۔ ڈاکٹر کا کام مریض کا علاج کرنا ہے ـــ"

"کوکب! میں اس کا علاج ہی کر رہا ہوں۔"

"کیا اس طرح بھی علاج ہوتا ہے؟"

"کوکب! یہ مریض کے مرض پر منحصر ہے کہ اس کا علاج کس طرح ہو ـــ تم نے درست کہا ہے کہ یہ خلافِ توقع علاج ہے ـــ مگر بعض مرض بڑے ہی پیچیدہ ہوتے ہیں ـــ ان مریضوں کی شفایابی کے لئے دوا دارو کی نہیں انسانی محبت کی ضرورت ہوتی ہے۔" راشد نے غیر جذباتی لہجے میں کہا۔

کوکب یہ الفاظ سن کر بے چین سی ہوگئی۔

"اور اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ کسی کے ساتھ غیر انسانی سلوک کیا جائے!"

"غیر انسانی سلوک کس کے ساتھ کیا ہے میں نے؟" راشد نے فوراً استفسار کیا۔

"مثلاً ـــ میرے ساتھ۔"

"غلط ـــ میں نے کبھی تم سے شادی کا عہد و پیمان نہیں کیا ـــ میں یہ پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں۔"

"راشد صاحب!" کوکب نے اب اسے اس کے نام سے مخاطب کیا "عہد و پیمان صرف لفظوں ہی سے نہیں اشاروں کنایوں اور رویوں سے بھی باندھے جا سکتے ہیں۔"

"یہ بھی نہیں ہوا۔"

"ہوا ہے ـــ راشد! ایسا ایک بار نہیں کئی بار ہوا ہے۔ یاد ہے آپا لندن سے آ رہی تھی اور ہم لوگ اسے ریسیو کرنے ایئرپورٹ پہ جا رہے تھے، میں تمہاری گاڑی میں بیٹھی تھی اور تم گاڑی بڑی تیزی سے چلا رہے تھے، میں نے کہا تھا آہستہ چلایئے، ایکسیڈنٹ ہو جائے گا۔ اور تم نے کہا تھا تمہارے ساتھ مرنا بھی خوش قسمتی ہے ـــ اور جب تم نے ایم بی بی ایس کا آخری پرچہ دیا تھا تو میرے پاس آئے تھے اور کہا تھا: کوکب! دعا کرو میں کامیاب ہو جاؤں۔ میں نے کہا تھا! میری دعا سے بھلا کیا ہوگا۔ تم نے جواباً کہا تھا، میرے لئے تم جو بھی دعا کرو گی قبول ہو جائے گی ـــ یاد ہیں یہ باتیں؟"

"یاد ہیں۔" راشد نے کہا

"اور تمہیں یہ بھی یاد ہوگا کہ ایک بار میں اور تم آؤٹنگ کر کے گھر آئے تھے تو تمہاری امی نے کہا تھا: راشد بڑے خوش نظر آتے ہو۔ اور تم نے کہا تھا: آج میں بیحد خوش ہوں۔ تم مسکرانے لگے تھے اور میں بھاگ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی تھی۔" کوکب دو لمحے رُک کر بولی: "راشد! یہ سب کچھ کیا تھا، کیا تم نے سمجھ رکھا تھا کہ مجھ پر ان چیزوں کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔ میرے اندر احساس کی کوئی قوت نہیں ہے ــــ میں احساسات سے بے بہرہ ہوں ــــ میں توقع نہیں باندھ سکتی ــــ میں خواب نہیں دیکھ سکتی؟"

راشد نے کوکب کی جذباتی بات بڑے تحمل سے سُنی اور بولا:

"کوکب!"

کوکب نے اس کی طرف نظریں اٹھائیں۔

"یہ سب کچھ یک طرفہ ہوا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"کوکب! میں نے تم سے کوئی امید باندھنے، کوئی خواب دیکھنے کے لئے نہیں کہا تھا۔ یہ تمہارا اپنا معاملہ ہے میرا اس میں کوئی دخل نہیں"

"گویا یہ میری غلط فہمی تھی؟" کوکب نے پوچھا

"میں یہ بھی نہیں کہتا ــــ فقط یہ کہتا ہوں کہ میرا اس معاملے میں کوئی دخل نہیں ہے۔"

کوکب نے ان آنکھوں سے اسے دیکھا جن میں آنسو آنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ جلدی سے اٹھی اور "خدا حافظ" کہہ کر چلی گئی۔

راشد نے اپنے دونوں ہاتھ رخساروں پر رکھ لئے اور تنہا بیٹھا رہا ــــ دیر تک بیٹھا رہا۔

O

شادی کی تقریب ایک مقامی ہوٹل میں انجام پائی۔ راشد کے کچھ ڈاکٹر دوستوں نے شرکت کی اور دُلہن کی طرف سے اس کے چند عزیز آئے اور جب دُلہن نے پہلی مرتبہ راشد کے مکان

کی دہلیز پر قدم رکھا تو اس کی ساس نے اسے اپنے بازوؤں کی گرفت میں لے لیا۔ فاخرہ کو ان بازوؤں میں ایک عجیب سی کیفیت محسوس ہوئی۔ یہ کیفیت وہ ان لمحوں میں محسوس کرتی تھی جب بچپن میں اس کی ماں اسے گود میں اٹھالیتی تھی۔

فاخرہ کی حالت میں ایک واضح طور پر تغیر آرہا تھا۔ پہلے اس کا صبح و شام کا کام یہ ہوتا تھا کہ اوپر اپنے کمرے میں جا کر چار دیواری میں خود کو مقید کر لے اور کتابوں کا مطالعہ کرتی رہے۔ گھر کے کاموں میں وہ بہت کم دلچسپی لیتی تھی ــــ تفریحی مشاغل سے تو اسے کوئی واسطہ ہی نہ تھا لیکن اب وہ بڑے شوق سے اپنی ساس کا ہاتھ بٹاتی تھی اور اپنے شوہر کے ساتھ باہر جا کر بھی گھوم پھر آتی تھی۔

اور پھر وہ وقت آگیا جب اس نے اپنے اندر کوئی چیز حرکت کرتی ہوئی محسوس کی۔ راشد اپنے کمرے میں پہنچا تو وہ کھڑکی میں سے ادھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ وہ شوہر کو آتے دیکھ کر جھینپ گئی تھی۔

راشد اس کے پہلو میں آکر کھڑا ہو گیا۔

"کیا دیکھ رہی ہو فاخرہ؟"

"کچھ نہیں" وہ محجوب ہوئی جا رہی تھی۔

"شاید چاند کو دیکھ رہی ہو ــــ عورت کی اپنی گود میں جب چاند آنے والا ہوتا ہے تو اسے آسمانی چاند سے بڑی دلچسپی ہو جاتی ہے۔"

فاخرہ کھڑکی سے ہٹ گئی۔

وقتِ مقررہ پر فاخرہ کی گود ایک بڑی پیاری اور خوب صورت بچی سے بھر گئی۔ اس ننھے وجود نے گھر کی رونق کو بہت بڑھا دیا تھا۔ فاخرہ کا ماضی محض ایک خواب بن کر رہ گیا تھا اور راشد بڑا خوش تھا کہ اس کا ایثار رائیگاں نہیں گیا۔ اس نے اپنی قربانی سے ایک ایسی لڑکی کی اداسیوں کو دور کر دیا ہے جو زندگی کی ساری خوشیوں سے مایوس ہو چکی تھی۔ اور

جو اپنی زندگی کو زندگی کی سزا تصور کر رہی تھی۔

جیسے جیسے فاخرہ اور راشد کی بچی ثمینہ کی عمر میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا اس کی خوبصورتی بھی بڑھتی جا رہی تھی، وہ جب اپنی توتلی زبان میں کوئی بات کہنے کی کوشش کرتی تھی تو اس کی ماں کا چہرہ وفورِ مسرت سے گلنار ہو جاتا تھا۔ دن پر دن گزرتے جا رہے تھے یوں چار سال کی مدت بیت گئی۔

ثمینہ خاصی صحت مند بچی تھی۔ کبھی کبھی اسے بچوں کی عام تکلیف ہو جاتی تھی اور ماں باپ کی توجہ سے تھوڑی دیر بعد دور ہو جاتی تھی۔ اور اس شام جب فاخرہ نے اس کا بدن ذرا گرم دیکھا تو وہ گھبرا گئی کیونکہ اس کے پہلے بچے کا جسم بھی اسی طرح گرم ہو گیا تھا۔ اس نے کلینک میں راشد کو فون پر اپنی بچی کی کیفیت بتائی اور اسے باصرار جلد آنے کیلئے کہا۔

راشد نے اسے تسلی دی۔

"فکر مت کرو فاخرہ! موسم بدل رہا ہے۔ یہاں بھی بہت سے بخار میں مبتلا لوگ آئے ہیں۔"

مگر فاخرہ نہ جانے دل میں کیسا خوف محسوس کر رہی تھی کہ اسے ثمینہ کے پاس بیٹھے ہوئے چین ہی نہیں آتا تھا۔ اس کی ساس نے بھی ہر چند تسلی دی لیکن وہ مُصر تھی کہ راشد کو فوراً آ جانا چاہیئے، ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کرنی چاہیئے اور ادھر راشد ہیوی کے بار بار ٹیلیفون آنے پر صرف یہی کہے جا رہا تھا،

"فاخرہ! اتنے مریض چھوڑ کر میں کیسے آ سکتا ہوں اور پھر کوئی فکر کی بات ہو جب نا۔"

نو بجے راشد آیا۔ کھانا کھانے سے پہلے اُوپر کمرے میں گیا۔ فاخرہ ثمینہ کو گود میں لیے کمرے کے اندر ٹہل رہی تھی۔ اس نے بچی کی پیشانی پر ہاتھ رکھا، پیشانی گرم تھی۔

"جلدی کیوں نہیں آئے؟" فاخرہ کا لہجہ تلخ تھا۔

راشد نے تحمل سے کام لیا۔

"تم تو خواہ مخواہ پریشان ہو جاتی ہو——"

"خواہ مخواہ پریشان ہو گئی ہوں ـــــ بدن کوئلے کی طرح نہیں جل رہا ـــــ مریض چھوڑ کر نہیں آ سکتے تھے ـــــ انہیں دوسرے روز نہیں دیکھ سکتے تھے ـــــ میری بچی کی حالت ـــــ میں نے بتایا نہیں تھا کہ بیمار ہو گئی ہے ـــــ تمہیں اپنے مریضوں کی پڑی رہی ـــــ اس سے بے پروا ہو گئے ـــــ"

"نہیں ایسی بات نہیں فاخرہ"! راشد نے بچی کو بیوی کی گود سے اٹھا کر اپنے سینے سے لگا لیا۔

"شام سے نہ مسکراتی ہے نہ کھلونوں سے کھیلتی ہے" فاخرہ نے مضطربانہ کہا۔

"بس یہی بات ہے ـــــ؟ کمال کرتی ہو۔ بچوں کی طبیعت نرم گرم ہوتی رہتی ہے۔ ابھی مسکرائے گی، کھلونے مانگے گی، ہنسے گی، قہقہے لگائے گی، دیکھتی جاؤ میری گڑیا، ٹھیک کہہ رہا ہوں نا!"

راشد ثمینہ کو "گڑیا" کہا کرتا تھا۔ اور جب وہ یہ الفاظ کہہ رہا تھا تو اسے توقع تھی کہ ثمینہ ضرور کچھ نہ کچھ کہے گی، مگر وہ چپ چاپ باپ کے کندھے سے اپنا سر لگائے نیم وا آنکھوں سے سامنے دیوار کو دیکھتی رہی۔

راشد نے اسے دوا پلائی۔ دوا کے بعد لگتا تھا کہ اس کی پہلی سی حالت عود کر آئی ہے ـــــ لیکن وہ پھر ویسی کی ویسی ہو گئی۔

فاخرہ نے اسے بار بار بلایا۔ اور وہ خوب صورت گڑیا اس کے پاس پلنگ کے اوپر رکھ دی جسے وہ چند روز پیشتر اس کے لئے خرید کر لائی تھی اور جسے اس نے بےحد پسند کیا تھا۔

ثمینہ نے گڑیا کو آغوش میں لیا اور پھر اسے اپنے ساتھ لٹا لیا۔

گیارہ بجے کے قریب اسے قے آ گئی اور جسم ٹھنڈا پڑ گیا۔ راشد نے اسے انجکشن لگایا تھوڑی دیر بعد ایک اور قے آ گئی۔

فاخرہ کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا اور وہ مسلسل کانپے جا رہی تھی۔ راشد کی سمجھ میں یہ معاملہ نہیں

آرہا تھا۔ اس کی امّی بھی اُوپر آ گئی تھی۔ بچّی کی حالت لمحہ بہ لمحہ خراب ہوتی جا رہی تھی۔ راشد نیچے گیا۔ اس نے اپنے ڈاکٹر دوستوں کو فون پر جلد آنے کی تاکید کی اور دو ڈاکٹر آ گئے۔

وہ جو کچھ کر سکتے تھے انہوں نے کیا ــــ مگر صبح چار بجے ثمینہ کا جسم ہمیشہ کے لئے بے حس اور حرکت ہو چکا تھا۔

فاخرہ کی حالت ایسی تھی کہ فرطِ مایوسی سے وہ ایک لفظ بھی نہ کہہ سکی جیسے قوتِ گویائی سے محروم ہو گئی ہے وہ دیوار سے لگ کر کھڑی تھی۔

راشد نے آہستہ سے ماں کے کان میں کہا:

"امّی! اسے نیچے لے جاؤ۔"

ماں فاخرہ کی طرف بڑھی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر بولی:

"آؤ بیٹی!"

فاخرہ چلنے لگی۔ یکایک وہ رُک گئی۔ ثمینہ کے پلنگ کی طرف آئی اور اس کا ہاتھ آہستہ آہستہ گڑیا کی طرف حرکت کرنے لگا۔ اس نے گڑیا اٹھالی اور سب کو حیران و پریشان چھوڑ کر خود بخود سیڑھیوں سے اُترنے لگی۔ اس کی ساس پیچھے پیچھے جانے لگی۔ فاخرہ ایک کمرے میں جا کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ ساس چند منٹ دروازے پر رُک کر اُسے دیکھتی رہی۔ فاخرہ نے کوئی حرکت نہ کی تو وہ اُوپر آ گئی۔

تجہیز و تکفین کا کام بڑی خاموشی کے عالم میں ہو گیا۔

ثمینہ کو گئے ہوئے کئی گھنٹے گزر چکے تھے اور فاخرہ کی آنکھ سے ایک آنسو تک نہیں گرا تھا اور یہ صورتِ حال خطرناک تھی۔

سارے گھر میں ایک گہرا سنّاٹا چھایا ہوا تھا۔ فاخرہ ابھی تک اسی حالت میں بیٹھی تھی۔ گڑیا اس کی گود میں تھی۔ راشد دو تین بار اپنی ماں سے کہہ چکا تھا "امّی! اسے رُلاؤ" ماں نے جب آخری بار بیٹے سے یہ لفظ سُنے تو فاخرہ کے پاس آ بیٹھی

"فاخرہ! تمہاری ثمینہ مر گئی ہے۔"

فاخرہ نے ساس کو دیکھا اور سر جھکا لیا۔

"فاخرہ بیٹی! ثمینہ مر گئی ہے ـــــ راشد کی گڑیا مر گئی ہے۔"

اس کا بھی وہی ردِ عمل تھا۔

اس کی ساس کی سمجھ میں اور کچھ نہ آیا۔ اس نے بہو کی گود سے گڑیا لینے کی کوشش کی۔ یکایک فاخرہ تڑپ اٹھی۔ اس نے گڑیا ساس کے ہاتھ سے چھین لی اور "نہ نہ" کہتی ہوئی اسے گلے سے لگا کر زار و قطار رونے لگی۔ اب آنسوؤں کا سیلاب تھا کہ تھمنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔

آٹھ دن گزر گئے۔

فاخرہ معمول کے مطابق ساس کا ہاتھ بٹانے لگی اور جب بھی اسے کاموں سے فرصت ملتی تھی وہ اوپر اپنے کمرے میں چلی جاتی تھی۔ گڑیا کو گلے سے لگا کر کرسی میں بیٹھ جاتی تھی اور دیر تک اسی طرح بیٹھی رہتی تھی ـــــ خیالوں میں گم سم ـــــ کھوئی کھوئی سی۔

ساس نے موقع پا کر گڑیا چھپا دی تو وہ آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ اس کے پاس آ گئی۔

"اماں! وہ تو نہ چھینیں ـــــ"

"وہ کیا فاخرہ بیٹی؟"

"وہ ـــــ میری گڑیا۔"

اماں نے اسے گڑیا دے دی۔

اماں کو پوتے کی بڑی آرزو تھی اور ایک روز وہ اپنے بیٹے کو بتائے بغیر بہو کو ہسپتال میں لے گئی۔ لیڈی ڈاکٹر نے چیک کیا اور اسے یہ اذیت ناک خبر سنا دی کہ خالہ جان! آپ کی بہو کے اندر کچھ ایسی خرابی اور پیچیدگی پیدا ہو گئی ہے کہ اگر آئندہ بچہ ہوا تو اس کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔ اماں نے یہ خبر بیٹے کو بتائی تو اس کی بھنک فاخرہ کے کانوں میں بھی پڑ گئی اور اس پر گویا سکتے کا عالم طاری ہو گیا۔

اس چھوٹے سے گھر میں اب ایک دوسرے سے الگ الگ اور کافی فاصلے پر دو جزیرے سے آباد ہو گئے تھے۔ فکر و اندیشہ کی لہریں اٹھ اٹھ کر دم بدم ان سے ٹکراتی رہتی تھیں اور ان کے درمیان دُوری کسی صورت بھی کم نہیں ہوتی تھی۔ راشد کے لئے یہ صورت حال بڑی تکلیف دہ تھی۔ وہ اپنی کشتی کبھی ایک جزیرے تک لے جاتا تھا اور کبھی دوسرے جزیرے تک، مگر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ دُوری جو پیدا ہو گئی ہے وہ کسی خاص واقعے کے بغیر ختم نہیں ہو سکتی۔

ماں دبے دبے لفظوں میں بیٹے سے کہہ دیتی تھی کہ گھر کی ویرانی کے تم خود ذمے دار ہو — راشد ماں کا اشارہ سمجھ لیتا تھا لیکن فاخرہ کو وہ اس کے حال پر چھوڑ کر از سر نو اپنا گھر بسانے کے لئے تیار نہیں تھا۔

فاخرہ پہلے سے بھی کم بولتی تھی۔ ایک بار وہ شام کے وقت کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی تو راشد نے بڑی محبت سے پوچھا:

"فاخرہ! تم کیا فضاؤں میں دیکھتی رہتی ہو۔"

وہ اسی انداز میں کھڑی رہی اور کہنے لگی:

"دیکھو راشد! وہ چاندکی بوٹی، وہ بادل، وہ افق کتنی دور ہے — اور انسان کے ہاتھ کتنے چھوٹے ہیں —"

"تمہیں ان سے کیا دلچسپی؟ — پکڑنا چاہتی ہو انہیں؟"

"ہاں۔"

"فاخرہ! پاگل ہو گئی ہو؟" راشد نے اس کا شانہ ہلاتے ہوئے کہا

فاخرہ کی آواز گلوگیر ہو گئی، بولی:

"ہاں، میں پاگل ہو گئی ہوں — میں کہاں، وہ کہاں۔ جو چیز حاصل نہیں ہو سکتی اس کے لئے کوشش پاگل پن نہیں تو اور کیا ہے — مجھے جو کچھ نہیں مل سکتا — وہ نہیں ملے گا — وہ نہیں ملے گا۔"

وہ زار و قطار رونے لگی۔

راشد اسے ہر طرح تسلیاں دیتا رہا اور وہ سسکیاں بھرتی رہی ـــــ ایک اندرونی ہیجان سے متواتر کانپتی رہی ـــــ اور پلنگ پر گر پڑی۔

کوکب کو اتنے برسوں بعد اپنے گھر میں دیکھ کر راشد حیران رہ گیا۔

وہ پہلے جیسی تھی ـــــ خوبرو، رنگ سرخ و سفید، گہری نیلی آنکھیں۔

"راشد صاحب! آپ نے ہمیں اپنی شادی پر بلایا ہی نہیں تھا ـــــ ہم بھی ناراض ہو گئے تھے۔"

اس سے پیشتر کہ راشد کچھ کہے اس کی ماں بولی:

"کوکب بیٹی! اتنی مدت کہاں رہیں؟"

"پشاور میں، خالہ جان! ان کا تبادلہ وہاں ہو گیا تھا۔"

شکوہ شکایت کی باتیں ہونے لگیں۔ کوکب فاخرہ سے مل کر بہت خوش نظر آتی تھی۔ مسکرا مسکرا کر اس سے گفتگو کرتی رہی۔ راشد کلینک چلا گیا اور فاخرہ باورچی خانے میں کھانے وغیرہ تیار کرانے لگی تو اس کی ساس نے کوکب کو سارے حالات سنا دیے۔

"بیٹی! میری دلی تمنا تھی کہ اس گھر میں تو آئے۔ مگر راشد کے سر پہ ایثار کا جنون سوار تھا، میں کیا کرتی۔ اب گھر ویران ہو گیا ہے ـــــ ہر طرف وحشت برستی ہے ـــــ دن رات ایک سناٹا سا طاری رہتا ہے ـــــ میری سمجھ میں نہیں آتا ـــــ یہ ویرانی کیسے دور ہو گی ـــــ یہ قبر کا سا سناٹا کیونکر ختم ہو گا ـــــ یہ زندگی ـــــ زندگی نہیں، موت سے بدتر ہے۔ لگتا ہے ہم کسی اندھے کنویں میں گر پڑے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے اس کی بوڑھی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

کوکب نے ساری باتیں خاموشی سے سنیں اور بولی:

"خالہ جان! مجھے راشد سے کوئی شکایت نہیں ـــــ میری زندگی مطمئن ہے۔"

"مگر ہماری حالت ۔۔۔ بیٹی !"

کوکب کچھ سوچ میں پڑ گئی، چند لمحوں کے بعد بولی :

"ویسے خالہ جان ! آپ کی بہو بڑی پیاری ہے ۔"

"پیاری تو ہے ، پر ۔۔۔"

"خالہ جان ! بعض چیزوں پر انسان کو اختیار نہیں ہے ۔"

دیر تک باتیں ہوتی رہیں اور جب کوکب جانے لگی تو فاخرہ سے کہنے لگی ؛

"اب آپ لوگوں کو ہمارے یہاں آنا ہوگا ۔۔۔ میں راشد سے ٹیلیفون پر دن مقرر کرلوں گی ۔"

O

جمعہ کی شام کو کلینک بند تھا اور یہ شام راشد کی اپنی تھی ۔

وہ اور فاخرہ جب کوکب کے بنگلے پر پہنچے تو اس نے بڑی محبت اور گرمجوشی سے دونوں کا خیر مقدم کیا ۔ خاطر تواضع میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی ۔ فاخرہ کو خوب معلوم تھا کہ کوکب راشد کی کلاس فیلو تھی اور اس کی ذات میں بڑی دلچسپی لیتی رہی تھی ۔ اس کی اور اس کے والدین کی بڑی خواہش تھی کہ وہ راشد کے ہاں دلہن بن کر جائے ۔ مگر ایسا نہ ہو سکا تو فاخرہ کو توقع تھی کہ وہ دل ہی دل میں اس سے شاکی ہوگی لیکن ایسے رویے کا اظہار نہ تو اس نے فاخرہ کے یہاں کیا تھا اور نہ اب اپنے گھر میں کر رہی تھی اور فاخرہ کو اس پر حیرت تھی ۔

ساڑھے دس کا وقت ہو چکا تھا اور کوکب کے مہمان اپنے گھر جانے سے پہلے آخری بار چائے پی رہے تھے ۔ کوکب سارا وقت خوب خوب چہکی تھی اب خاموش تھی ۔

فاخرہ نے خالی پیالی میز کے اوپر رکھ دی اور اٹھنے لگی تو کوکب اس کے پاس آگئی ۔

"فاخرہ ! کیا میں ایک اچھی بہن نہیں ہوں ؟"

فاخرہ اس سوال پر گھبرا گئی ۔

"یہ آپ کیوں پوچھ رہی ہیں ؟" اس نے اپنی طرف سے سوال کر دیا ۔

"میں نے اس کی ضرورت محسوس کی ہے۔"

راشد اپنی بیوی سے مخاطب ہوا۔

"فاخرہ! کوکب نے جو کچھ پوچھا ہے اس کا جواب دے دو۔"

"کیا جواب دوں! ــــ بڑی اچھی ہیں۔"

"بہن کی طرح نا؟"

"کیوں نہیں!"

"تو مجھے اپنی بہن سمجھتی ہو ــــ اور ایک بہن اپنی بہن کو کچھ دے تو بہن خوشی سے قبول کر لیتی ہے ــــ" یہ کہتے ہوئے کوکب کمرے سے نکل گئی اور جب لوٹی تو اس نے اپنے بازوؤں میں اپنی سوئی ہوئی یک سالہ بچی کو سمیٹ رکھا تھا۔

"یہ آج سے تمہاری بچی ہے ــــ"

فاخرہ کوکب کو پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھنے لگی۔ راشد اپنی کرسی سے اُٹھ بیٹھا۔

"میرے شوہر کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ــــ کسی کو بھی کوئی اعتراض نہیں۔"

کوکب فاخرہ کے قریب ہو گئی ــــ اور قریب ہو گئی اور بچی اس کی بانہوں کے حوالے کر دی۔

"کوکب! تمہارا یہ بہت بڑا احسان ہے لیکن ایسا ہو گا کیسے؟" راشد نے پوچھا۔

"کیا میں نے بتا نہیں دیا کہ میرے شوہر اور اس کے عزیزوں کو اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ میرے دو بچے ادھر سو رہے ہیں ــــ میری یہ بچی میرے اپنے گھر میں رہے یا آپ کے گھر میں، اس سے کیا فرق پڑتا ہے ــــ"

"کوکب! صرف یہی نہیں اور بھی کئی باتیں ہیں ــــ"

کوکب دو تین لمحے سوچتی رہی۔ پھر بولی،

"ٹھیک ہے کچھ اور باتیں بھی ہیں ــــ مثلاً بچی ماں سے جدا کیسے ہو سکتی ہے؟ اتفاق یہ

ہے کہ یہ مجھ سے زیادہ مانوس نہیں ہے ـــــ مانوس ہے اپنی آیا سے، جو اس کا بہت خیال رکھتی ہے ـــــ یہ آیا بچی کے ساتھ ہی جائے گی۔"

فاخرہ چادر میں لپٹی ہوئی بچی کو گود میں لئے کھڑی تھی۔

"یہ میرا تحفہ قبول ہے؟" کوکب نے مسکرا کر پوچھا۔

"جی!" فاخرہ کے ہونٹوں سے صرف یہی ایک لفظ نکلا۔

"یہ آج سے آپ کی ہے ـــ میں آیا نہیں کروں گی ـــــ"

"کیوں نہیں آیا کریں گی، یہ آپ کی ہے ـــــ" فاخرہ نے کہا۔

"میری نہیں فاخرہ بہن! آپ کی ـــــ" کوکب نے فاخرہ کی طرف انگلی کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

گاڑی میں بیٹھتے وقت کوکب نے بچی کی پیشانی چوم لی، جس سے وہ جاگ اٹھی اور رونے لگی۔ جلدی سے آیا نے اسے گود میں لے لیا، اور وہ چپ ہو گئی۔

"امی! ہم ایک تحفہ لے کر آئے ہیں۔" راشد نے کمرے میں داخل ہوتے وقت ماں سے مخاطب ہو کر کہا۔

"تحفہ! ـــ کیسا تحفہ؟"

"وہ تحفہ امی! جو فاخرہ کے لئے ہے، میرے لئے اور آپ کے لئے بھی، جس سے اس گھر کی ساری بوریت دور ہو جائے گی، جس سے اس گھر میں رونق آ جائے گی۔"

آیا اندر آ گئی تھی۔

"یہ کیا ہے؟" امی نے پوچھا

"دیکھ لیجئے امی!"

آیا نے بچی امی کی طرف بڑھا دی۔ امی اسے گود میں لے کر حیران نظروں سے بیٹے کو دیکھنے لگی

"امی! یہ آج رات سے پہلے کوکب کی تھی، آج فاخرہ کی ہے۔ یعنی فاخرہ اس کی ماں ہے ـــــ

"میں باپ اور آپ شفیق دادی جان"

راشد نے اسے سارا قصہ سنا دیا۔

"کتنی بڑی قربانی!" امی کے منہ سے بے ساختہ نکلا

"یہ ایک ماں ہی کر سکتی ہے۔"

"بیٹا ——" امی بیٹے سے کہنا چاہتی تھی کہ تم نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا اور اس نے کیا کیا —— مگر وہ خاموش ہو گئی۔

راشد نے بیوی سے کہا کہ بچی کہیں جاگ نہ پڑے اسے اُوپر لے جائے۔ اور فاخرہ اسے گود میں لے کر اوپر جانے لگی۔ جب اس نے آدھی سیڑھیاں طے کی ہوں گی کہ امی بولی:

"راشد! یہ تمہاری بیوی کچھ خوش نظر نہیں آئی۔"

"نہیں امی! ایسی بات نہیں ہے —— آپ اس کے دل کی کیفیت سمجھ نہیں سکیں۔ کبھی کبھی خوشی اتنی بڑھ جاتی ہے کہ انسان اس کا اظہار نہیں کر سکتا۔"

امی مطمئن ہو گئی۔

بچی فاخرہ کے پہلو میں سو رہی تھی اور راشد اپنے پلنگ پر لیٹ چکا تھا۔

"فاخرہ!"

"جی۔"

"کیا یہ معجزہ نہیں ہے —— کتنا ایثار ہے یہ ——"

"راشد صاحب! میرا خیال ہے اس وقت آپ کو بہت افسوس ہو رہا ہو گا —— آپ بڑے پشیمان ہوں گے ——"

"کس بات پر فاخرہ!"

"آپ ہنستے کیوں نہیں —— آپ کی امی بھی یہ کہنا چاہتی تھیں کہ تم نے کوکب کو نظرانداز کر دیا اور اس نے —— بات بالکل ٹھیک ہے —— ایک حقیقت ہے ——"

راشد اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"جو ہو چکا سو ہو چکا — مجھے اس پر کوئی افسوس، کوئی شرمندگی نہیں ہے — میں نے خوب سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا تھا — سمجھ لیا —"

"شکریہ"

"اس کی ضرورت نہیں تھی —" یہ کہتے ہوئے راشد کی نگاہ بچی پر پڑی جو اسے بڑی پیاری لگ رہی تھی۔

"کتنی پیاری ہے۔ فاخرہ! معلوم نہیں کوکب نے اس کا کیا نام رکھا ہے — ہم اسے ثمینہ کہیں گے —" فاخرہ خاموش رہی، اس نے اپنی رضامندی یا غیر رضامندی کا اظہار نہ کیا۔

O

راشد دیکھ رہا تھا کہ فاخرہ ثمینہ کی ذات میں بہت کم دلچسپی لے رہی ہے۔ اس کی ماں کو بھی یہی احساس تھا۔ دونوں اُس کے رویے پر پریشان تھے مگر صبر و تحمل کا ثبوت دے رہے تھے۔ امی فاخرہ کی غیر موجودگی میں اپنے بیٹے سے بہو کے بچی کے ساتھ اس غیر ہمدردانہ سلوک پر کُڑھتی تو راشد اسے درگزر کرنے کا مشورہ دیتا بلکہ درخواست کرتا کہ وہ مزید انتظار کریں۔ فاخرہ کا رویہ آہستہ آہستہ درست ہو جائے گا۔

ثمینہ بیشتر وقت آیا ہی کے پاس رہتی، وہی اسے دودھ پلاتی، نہلاتی دھلاتی، کپڑے بدلتی، اپنے ساتھ سلاتی، فاخرہ کبھی اسے گود میں لیتی بھی تو ناگواری کے عالم میں، اور اس کی کوشش یہی ہوتی کہ اسے جلد سے جلد اپنی آغوش سے نکال دے۔

اُس روز امی کسی پڑوسن کے گھر سے واپس آئی تو دیکھا کہ بچی کمرے میں تنہا پڑی زور زور سے رو رہی ہے۔ آیا باورچی خانے میں ہے — اور فاخرہ غائب ہے۔ وہ اوپر پہنچی تو دیکھا فاخرہ آرام کرسی میں بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی ہے اور اس کی گود میں گڑیا پڑی ہے۔

یہ منظر دیکھ اس کے اندر یک لخت غصے کی آگ بھڑک اٹھی۔ وہ چیخ کر بولی:

"ناخرہ! تمہیں معلوم نہیں بچی نیچے بُری طرح رو رہی ہے۔"

"تو اس کی آیا کہاں ہے!"

"اس کا خیال رکھنا صرف آیا ہی کا فرض ہے؟"

"ہاں اماں جان۔ کوکب نے اسے اسی غرض سے ساتھ بھیجا تھا۔" ناخرہ نے جواب دیا۔

"اور تمہارا کوئی فرض نہیں! ــــ کیسی سنگدل ماں ہو! بچی رو رو کر ہلکان ہو رہی ہے اور تم اوپر مزے سے کتاب پڑھ رہی ہو ــــ کیا کوکب نے اپنے جگر کا ٹکڑا اس لئے تمہارے حوالے کیا تھا کہ اُس سے ایسی ظالمانہ بے نیازی برتو ــــ اس نے تو تم پر رحم کھا کر اپنی بچی دی تھی ــــ"

ناخرہ نے کُرسی سے اٹھتے ہوئے کتاب اور گُڑیا تپائی پر رکھ دیں۔

"اماں! میں نے اُس سے رحم کی درخواست نہیں کی تھی۔"

"احسان کا بدلہ یُوں چکایا جاتا ہے!"

"اس نے مجھ پر کوئی احسان نہیں کیا ــــ کیا ہے تو آپ لوگوں پر کیا ہے۔"

"ماں تم ہو اس کی ــــ"

"میں ماں نہیں ہُوں۔" ناخرہ کی آواز بھی بلند ہو گئی تھی۔

امی کا چہرہ اور سُرخ ہو گیا۔

"کیا کہتی ہو؟ ــــ تم ماں نہیں ہو ــــ کوکب نے تمہیں کیا سمجھ کر اپنی بچی دی تھی ــــ؟"

"یہ میں نہیں جانتی ــــ بہرحال میں اس کی ماں نہیں ہوں ــــ اس نے میری کوکھ سے جنم نہیں لیا۔ اس کی رگوں میں میرا لہو نہیں ہے ــــ یہ میرے وجود کا حصّہ نہیں ہے ــــ میں اسے کیسے اپنی بچی سمجھ کر گود میں لے لوں ــــ میں کیا لگتی ہوں اس کی۔ قسمت کو یہ منظور نہیں ہے کہ میری گود میں میرا اپنا بچہ ہو ــــ دونوں بچے اس نے چھین لئے ــــ کیا اب میں غیروں کے آگے بازو پھیلاؤں کہ خدا کے لئے میری گود بھر دو ــــ مجھ پر رحم کھاؤ ــــ اماں! میں اس

کے لیے تیار نہیں ہوں۔"

فاخرہ ان لمحوں میں بھول گئی تھی۔ اس سے مخاطب کون ہے ـــــ جو کچھ دل میں آتا تھا وہ سوچے سمجھے بغیر کہے جا رہی تھی۔

"اور تم اس کے لئے تیار ہو کہ اس بے جان گڑیا کو اپنی گود میں سجائے رکھو۔" امی نے غضب ناک نظروں سے تپائی پر پڑی ہوئی گڑیا کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"ہاں ـــ یہ میری بچی کی تھی ـــ"

"اور وہ زندہ بچی اس کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی ـــ ؟"

"یہی سمجھ لیں۔"

"کیا ؟" امی کے غصے کا پارہ بلندی پہ پہنچ گیا تھا۔ وہ آگے بڑھی، گڑیا کو اٹھایا اور اسے کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔

"اماں ـــ" فاخرہ کا جسم لرزنے لگا۔ وہ دھم سے کرسی کے اوپر گر پڑی۔
آپا بچی کو گود میں اٹھائے اوپر آ گئی تھی۔ فاخرہ کو اس طرح گرتے دیکھ کر آئی اور "بی بی ـــ بی بی" کہنے لگی۔

امی یہ منظر دیکھ کر پریشان ہو گئی تھی۔ اس نے فاخرہ کا ہاتھ پکڑ کر دو تین بار "فاخرہ! فاخرہ!!" کہا۔ فاخرہ بے ہوش ہو چکی تھی۔

امی نے آپا کو وہیں ٹھہرایا ـ ـ سیڑھیوں سے نیچے اتری ـ ـ اور فون پر بیٹے کو صورت حال سے مطلع کر دیا۔

راشد کے آنے تک فاخرہ کے سر سے کافی لہو بہہ چکا تھا۔ راشد نے اس کے سر پہ پٹی باندھی اور اسے پلنگ پر لٹا دیا۔

دو گھنٹے کے بعد اس کی حالت قدرے بہتر ہو گئی۔ مگر اب وہ اصرار کر رہی تھی کہ اسے اس کی بہن کے گھر میں پہنچا دیا جائے وہ یہاں نہیں رہے گی ـــ ایک منٹ کے لئے بھی نہیں

رہے گی۔۔۔ ایک بار وہ پلنگ سے اٹھ کر تیزی کے ساتھ دروازے کی طرف بھی جا چکی تھی۔ اگر راشد بعجلت تمام اسے اپنی گرفت میں نہ لیتا تو وہ سیڑھیوں سے نیچے اتر جاتی۔

امی کا غصہ جو فاخرہ کو بیہوش دیکھ کر وقتی طور پر دب گیا تھا، پھر ابھر آیا تھا۔ وہ بیٹے سے بولی:

"راشد! اسے چھوڑ آؤ اس کے گھر۔"

راشد نے ماں کو صبر سے کام لینے کی تلقین کی تو وہ بپھر گئی۔

"میں کہتی ہوں اسے چھوڑ آؤ۔"

فاخرہ نے ایک لمحہ بھی توقف نہ کیا۔۔۔ دروازے پر چلی گئی۔ راشد نے دوڑ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"دیکھو فاخرہ! عقل سے کام لو۔" راشد نے اسے آخری سیڑھی پر پہنچ کر کہا۔

"نہیں۔۔۔ میں یہاں نہیں رہوں گی۔۔۔ میں دیوار سے سر ٹیک ٹیک کر جان دے دوں گی۔۔۔ کہے دیتی ہوں۔۔۔ میں یہاں نہیں رہوں گی۔۔۔ ایک لمحے کے لئے بھی نہیں رہوں گی۔۔۔"

راشد مجبور ہو گیا، اس نے اسے گاڑی میں بٹھالیا۔ گاڑی روانہ ہو گئی۔

امی اور آپا۔۔۔ دونوں نیچے آگئیں۔

"آپا!" امی نے آپا سے مخاطب ہو کر کہا "لے جاؤ اسے۔"

آپا کھڑی رہی۔

امی کڑک کر بولی:

"لے جاؤ اسے جہاں سے لائی ہو۔"

آپا جانے لگی۔

○

پھر وہی کمرہ، وہی کتابیں، وہی کھڑکی اور وہی کرسی: اس دنیا سے نکل کر وہ جس دنیا

میں گئی تھی وہ اسے ایک خواب محسوس ہونے لگی تھی۔ سب کچھ کتنی جلدی ختم ہو گیا تھا جیسے ایک دم بلندی سے اسے نیچے دھکا دے دیا گیا ہو۔ جیسے وہ کسی اجنبی جزیرے کی سیاحت کے بعد پھر اپنے پرانے ساحل پر اتر گئی ہو۔

اُس کی بڑی بہن ناصرہ اسے دیکھ دیکھ کر کڑھتی رہتی تھی وہ اب اسے ایک طرح وبالِ جان سمجھنے لگی تھی۔ اُسے روتے ہوئے دیکھتی تھی تو کہتی تھی "فاخرہ! تو ہے ہی بدنصیب کوئی تیرے لئے کیا کر سکتا ہے؟ یہ تیری بدنصیبی ہمیں بھی لے ڈوبی ہے۔"

بہن کا یہ سلوک اس کے لئے غیر متوقع تھا تاہم وہ کہیں جا بھی نہیں سکتی تھی۔

یہی حالت تھی جب کوکب اس گھر میں آئی۔ ناصرہ گھر کے کام میں مصروف تھی اور فاخرہ اُوپر اپنے کمرے میں تھی۔

ناصرہ نے کوکب کا نام ضرور سنا تھا مگر اسے دیکھا کبھی نہیں تھا۔ اُسے اپنے یہاں دیکھ کر حیران رہ گئی۔

"آپ مجھے دیکھ کر حیران ہو گئی ہیں ــــ میرا نام کوکب ہے۔ راشد بھائی کی دور کی رشتہ دار ہوں۔"

"آیئے ــــ تشریف رکھئے۔"

کوکب بیٹھ گئی۔ رسمی باتوں کے بعد اس نے فاخرہ کا حال پوچھا۔ ناصرہ گویا پھٹ پڑی "کیا بتاؤں اس کا کیا حال ہے؟ مصیبت میں جان ڈال دی ہے اس نے۔ میرے لڑکے نے دوبئی سے ہم دونوں کے لئے ٹکٹ بھیج دیئے ہیں ــــ کاغذات بھی تیار ہیں ــــ پر اس کا کیا بنے گا؟ پریشان ہیں ــــ بدنصیب سدا کی بدنصیب ہے ــــ"

کوکب اوپر چلی گئی۔

"معاف کیجئے گا۔ اجازت کے بغیر آپ کے کمرے میں آ گئی ہوں۔"

فاخرہ کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ آ گئی اور اس نے اپنے اندر شرمندگی کے احساس کو

سرایت کرتے ہوئے پایا ــــ اور اس احساس کو دبانے کی کوشش کرنے لگی۔

"میں شکر گزار ہوں کہ آپ نے میرا خیر مقدم کیا ہے ــــ" کوکب نے اس کے پاس پلنگ کی پائنتی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ فاخرہ نے اس کے لئے کرسی خالی کر دی لیکن وہ وہیں بیٹھی رہی۔

"فاخرہ ! جو کچھ ہوا ہے میں اس کے بارے میں کچھ بھی نہ سنوں گی، نہ کہوں گی، فقط یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ اب سوچا کیا ہے ؟"

"کیا سوچنا ہے ؟"

"تمہاری بہن اور بہنوئی تو باہر جانے والے ہیں ــــ تمہیں خبر ہے نا !"

"مجھے معلوم ہے "

"پھر ؟"

"پھر کیا ؛ زندگی اپنے سارے دروازے بند کر لے جب بھی ایک دروازہ کھلا رہتا ہے جہاں کوئی روک نہیں ہے "

کوکب نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"اپنی اس بہن کے ہوتے ہوئے تم اس دروازے کی طرف رُخ کرو گی ؟"

"جب کوئی اور راستہ دکھائی نہ دے تو آدمی کیا کرے "

"فاخرہ ! سنو میری بہن ! موت کا صرف ایک دروازہ ہے ــــ مگر زندگی کے بے شمار دروازے ہیں کہیں کہیں دروازے کو بند پاؤ گی "

"سب بند ہیں "

"تم نے کئی دروازوں پر تو ابھی دستک ہی نہیں دی "

فاخرہ کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں ، کوکب اپنی ساڑھی کے پلو سے اس کے آنسو پونچھنے لگی۔ اس وقت اس کے ذہن میں خیال آیا، یہ عورت کون ہے ! ــــ یہ کیوں میرے آنسو پونچھ رہی ہے۔ اسے مجھ سے کیا ہمدردی ہے ــــ کیوں ہے ! وہ اپنا چہرہ پیچھے

بٹانا چاہتی تھی کہ یک لخت اس کے ذہن میں آ جاتا یہ عورت جو بھی ہے سو ہے مگر اس نے اپنی طرف سے مجھے دنیا کی سب سے بڑی اور قیمتی چیز دی تھی ـــ یہ وہی تو ہے ـــ وہی ـــ

"معاف کیجئے۔ آپ ایسا کیوں کرتی ہیں؟" فاخرہ نے اس کا ہاتھ اپنی گرفت میں لیتے ہوئے کہا۔

"میں ایسا کیوں کرتی ہوں؟ اس لئے کرتی ہوں کہ تمہاری بہن ہوں ـــ تم مجھے جو کچھ سمجھنا چاہو سمجھ سکتی ہو ـــ لیکن میں تو تمہیں اپنی بہن ہی سمجھتی ہوں ـــ"

"شکریہ!"

اس روز کوکب شام تک فاخرہ کے پاس بیٹھی رہی اور جب جانے لگی تو وہ فاخرہ کو اپنے ہمراہ اپنے یہاں جانے کے لئے رضامند کر چکی تھی۔

○

فاخرہ نے کوکب کے عالی شان بنگلے میں بڑی گھبراہٹ محسوس کی۔ اس کے شوہر کی کوٹھی بھی اس کے پرانے گھر کے مقابلے میں خاصی شاندار تھی مگر یہ بنگلہ تو کبھی اس کے خواب و خیال میں بھی نہیں آیا تھا۔ اس کے زیادہ گھبرانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ کوکب اور اس کے شوہر کا رویہ اس کے ساتھ ہمدردانہ تھا۔ کوکب اس کے آرام کا خیال رکھتی تھی۔ فاخرہ خود کو ایک طائر نو گرفتار تصور کرنے لگی تھی۔ وہ ہر رات کو اپنے دل سے عہد کرتی کہ صبح اٹھ کر کہیں چلی جائے گی مگر صبح سویرے ہی کوکب اس کے لئے بیڈ ٹی لے کر آ جاتی۔

آیا بچہ گاڑی میں ثمینہ کو بٹھا کر باغ میں جانے لگتی تو کوکب فاخرہ کو بھی ساتھ بھیج دیتی۔ آیا کوکب کی ہدایت کے مطابق باغ میں جا کر کہیں ادھر ادھر ہو جاتی ـــ فاخرہ [illegible] کے پاس تنہا رہ جاتی، بچی روتی تو وہ اسے اٹھا لیتی۔

کوکب بچی کے لئے نئے کپڑے بنوائی تو فاخرہ [illegible] کے لئے کپڑا پسند کر لو۔

آیا تین روز کے لئے چھٹی لے کر چلی گئی تو کوکب نے فاخرہ سے کہا کہ اسے اپنے پاس بُلا لیا کرے۔

ان تین دنوں میں ثمینہ زیادہ فاخرہ ہی کے پاس رہی۔

کوکب کی ان کوششوں سے فاخرہ بچّی سے کسی قدر مانوس ہوگئی۔ بچی بھی اس سے مانوس ہوتی چلی جا رہی تھی۔ وہ جب اپنے ننھے ننھے ہاتھ اس کی گردن میں حمائل کر دیتی تو فاخرہ کو کچھ یوں محسوس ہوتا کہ ماں کا وہ پیار جو مایوسیوں کے ہجوم میں کہیں بھٹک رہا تھا۔ اس کے دل کو سہلانے لگا ہے۔ وہ اپنی کھوئی ہوئی منزل کی طرف تیزی سے رواں دواں تھی۔ اور وہ بچّی سے زیادہ سے زیادہ مانوس ہوتی گئی۔

۵

ثمینہ دو روز سے نظر نہیں آ رہی تھی۔

فاخرہ نے گھر کے ایک نوکر سے پوچھا:

"ثمینہ کہاں ہے؟"

"میں کیا جانوں بی بی! — بڑی بی بی گاڑی میں بٹھا کر لے گئی تھی۔

"کہاں؟"

"خبر نہیں —"

فاخرہ کوکب کے کمرے میں گئی۔

"کوکب بہن! وہ کہاں ہے — ثمینہ؟"

"کیوں پریشان ہوگئی ہو؟" کوکب نے سوال کیا۔

"ہے کہاں؟"

کوکب دو تین لمحے خاموش رہی۔ پھر کہنے لگی:

"فاخرہ! اصل میں معاملہ یہ ہے کہ اسے ایک اندرونی بیماری ہوگئی تھی — چند روز

علاج کے بعد لے آؤں گی اسے۔"

"کیا ہسپتال میں ہے؟"

"وہیں اس کا علاج ہو سکتا ہے؟"

○

وہ ایک طوفانی شام تھی۔

فاخرہ اپنے کمرے میں پلنگ پر لیٹی تھی اور کتاب کا مطالعہ کر رہی تھی۔

بادل زور سے گرجا۔ کتاب اس کے ہاتھ سے گر پڑی۔ اس نے کتاب اٹھانے کیلئے ہاتھ بڑھایا۔۔۔ اس کی نظر سامنے انگیٹھی پر ثمینہ کی تصویر پر پڑی۔ وہ اسے دیکھتی رہی۔ بادل پھر گرجا۔

وہ پلنگ سے اتر گئی۔ تصویر کے قریب گئی ۔۔۔ اور قریب گئی اور ایک جذبہ بے اختیار اس کے رگ و پے میں سرایت کر گیا۔ وہ ضبط نہ کر سکی۔ دروازے میں سے نکلی اور کوکب کے دروازے پر آگئی۔

"کوکب! کوکب!" اس نے دروازے پر زور زور سے دستک دیتے ہوئے کہا۔

کوکب نے دروازہ کھول دیا۔

"وہ ۔۔۔ میری ثمینہ ۔۔۔ وہ بیماری ۔۔۔ وہ ۔۔۔ وہ۔ کوکب خدا کے لئے مجھے اس کے پاس لے چلو ۔۔۔ مجھے لے چلو کوکب!"

کوکب کا شوہر بھی وہاں آگیا۔

"ابھی رات ہے فاخرہ!" کوکب نے کہا

"یہ طوفانی رات ۔۔۔ یہی تو وہ ۔۔۔ مجھے لے چلو ۔۔۔ میں کہتی ہوں ۔۔۔"

"لئے چلتے ہیں۔" کوکب کے شوہر نے کہا

چند منٹ بعد تینوں گاڑی میں بیٹھے تھے۔ فاخرہ نے اپنا سر گاڑی کی دیوار سے لگا دیا تھا۔ اسکے چاروں طرف اندھیرا تھا۔ اسے معلوم ہی نہ ہو سکا کہ کب گاڑی رکی اور کب کوکب اس کا ہاتھ پکڑ کر کہیں لے گئی۔

ایک دم روشنی ہوگئی۔

فاخرہ نے سامنے پلنگ پر ثمینہ کو سوتے ہوئے دیکھا۔

"میری ثمینہ" کہہ کر اس نے بچی کو گود میں اٹھا لیا۔

یکایک اس نے اپنے سامنے ساس کو دیکھا — پھر اپنے شوہر کو — دونوں کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور وہ اپنے مکان کے کمرے میں تھی۔

○

مضامین احادیث نبوی ﷺ

- یہ اللہ تعالیٰ کا احسانِ عظیم ہے کہ ہماری ۸۰۰ صفحات پر مشتمل کتاب "مضامین قرآن حکیم" کی ملک بھر کے دینی و علمی حلقوں میں بڑی پذیرائی ہوئی ہے۔ "مضامین قرآن حکیم" کے بعد اب مطبوعات حکومت کی ایک اور عظیم کتاب "مضامین احادیث نبوی ﷺ" کے نام سے جلد شائع ہو جائے گی۔
- مضامین احادیث نبوی ﷺ اپنی نوعیت کی اولیں اور جامع ترین کتاب ہے۔ اس میں تمام اہم مضامین [illegible] ترتیب حروف تہجی کے اعتبار سے کی گئی ہے۔ اور ایسے مضامین بھی منتخب کئے گئے ہیں جو آج کے سائنسی دور میں معاشرے کے پیچیدہ مسائل پر مشتمل ہیں۔
- احادیث کا انتخاب عام طور پر صحاح ستہ سے اور کہیں کہیں [illegible] مستند کتب احادیث سے کیا گیا ہے، لہٰذا یہ مجموعہ مستند ہے۔

کتاب کو ایسے [illegible] کے ایک بزرگ نے مرتب کیا ہے جو [illegible] حدیث کے علوم میں مہارت کے ساتھ ساتھ آنحضور ﷺ کی ذات کے ساتھ گہری عقیدت و محبت رکھتے ہیں۔

- احادیث کا متن دینے کی بجائے صرف ترجمہ دیا گیا ہے اور یہ ترجمہ [illegible] سادہ زبان میں ہے اس وجہ سے [illegible] تعلیم یافتہ افراد بھی اس سے [illegible] اٹھا سکتے ہیں۔ اس طرح کتاب کی افادی حیثیت میں بے حد اضافہ ہو گیا ہے۔
- اس نایاب مجموعہ مضامین احادیث نبوی ﷺ کی اشاعت کے بعد عام مسلمانوں کو دینی مسائل و معاملات کو سمجھنے میں ان شاء اللہ بڑی آسانی ہو جائے گی۔

یہ کتاب علماء، فقہا، وکلاء اور جج صاحبان کے لئے ایک [illegible] اہم [illegible] ہے۔ [illegible] نہایت آسانی سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ چونکہ اس انداز کی تالیف اس سے پہلے نہیں ہوئی اس لئے یہ ایک منفرد تالیف ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرمت بک کلب

جیسا کہ ملک کے دینی، علمی اور ادبی حلقے بخوبی جانتے ہیں، ادارہ مطبوعات حرمت محض ایک کاروباری ادارہ نہیں ہے۔ اسی لئے ہماری یہ خواہش اور کوشش ہے کہ صرف ایسی کتابیں شائع کی جائیں جن کی وطن عزیز کو واقعی ضرورت ہے۔ ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ بڑھتی ہوئی مہنگائی کے اس دور میں کوئی ایسا طریق کار اختیار کیا جائے جس سے ہمارے باذوق پڑھنے والوں کو ہماری کتابیں بازار سے نسبتاً سستی مل سکیں۔

الحمدللہ اپنی اسی پرخلوص اور مسلسل سوچ بچار کے نتیجے میں ہم نے **حرمت بک کلب** قائم کر دی ہے۔ اس کا واحد مقصد یہ ہے کہ کلب کے اراکین کو ہر کتاب پر بیس فیصد خصوصی رعایت دی جایا کرے۔ مثلاً اگر بازار میں ہماری کوئی کتاب پچاس روپے پر دستیاب ہے تو ہم اپنی کلب کے معزز اراکین کو وہ کتاب صرف چالیس روپے میں دیں گے۔ اس خصوصی رعایت کے حصول کے لئے آپ کو صرف اتنا کرنا ہوگا کہ **حرمت بک کلب** کے رکن بن جائیں اور اپنا نام اور مکمل پتہ ارسال فرما دیں۔ ہم اپنی ہر نئی کتاب کا مختصر سا تعارف آپ کی خدمت میں ارسال کر دیا کریں گے اور ساتھ ہی ایک جوابی خط بھی بھیج دیا کریں گے۔ اگر آپ محسوس کریں کہ مذکورہ کتاب آپ کی ذاتی یا آپ کے دفتر کی لائبریری کی زینت بن سکتی ہے یا تعارف پڑھنے کے بعد آپ محسوس کریں کہ آپ کو اس کتاب میں دلچسپی نہیں ہے تو ہر دو صورتوں میں ہمیں جوابی خط کے ذریعے مطلع فرما دیں۔ اگر آپ کتاب خریدنا چاہیں تو بیس فیصد خصوصی رعایت کے ساتھ کتاب آپ کو بذریعہ وی پی پی بھیج دی جائے گی۔

- حرمت بک کلب کا رکن بننے کے لئے کوئی فیس یا قیمت نہیں۔
- ہر کتاب کا مختصر تعارف آپ کو مفت بھیجا جایا کرے گا۔
- آپ کے جواب کے لئے آپ کو جوابی کارڈ ہم ارسال کیا کریں گے۔
- کتاب کی ترسیل پر آنے والا ڈاک خرچ اور دوسرے اخراجات ہم برداشت کیا کریں گے۔
- ہر کتاب پر بیس فیصد خصوصی رعایت۔

مہنگائی کے اس دور میں ان سہولتوں سے فائدہ اٹھانا آپ کے اپنے مفاد میں ہے۔

انچارج: حرمت بک کلب۔ مطبوعات حرمت۔ بینک روڈ۔ راولپنڈی

ہماری منفرد کتابیں

کتاب	مصنف	قیمت
مضامینِ قرآنِ حکیم	زاہد ملک	۱۵۰ روپے
خلاصہ مطالبِ قرآن	جسٹس ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن	۳۰ روپے
جرم و سزا کا اسلامی فلسفہ	جسٹس ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن	۳۰ روپے
قرآن ایک نظر میں	مولانا محمد میاں صدیقی	۷۰ روپے
قرآن اور ادیب	زاہد ملک	۳۰ روپے
اسلامی حدود و تعزیرات	ڈاکٹر طفیل احمد قریشی	۵۰ روپے
خطباتِ رسولؐ	پروفیسر امتیاز سعید	۷۵ روپے
مکاتیبِ رسولؐ	عزیز ملک	۲۰ روپے
بلالِ حبشیؓ	عزیز ملک	۲۰ روپے
بحضرتِ دوست	مولوی محمد سعید	۳۵ روپے
پطرس۔ ایک مطالعہ	کرنل غلام سرور	۴۰ روپے
مسافرِ حرم	کرنل غلام سرور	۳۵ روپے
حرف حرف روشنی (نعتوں کا مجموعہ)	قمر صدیقی	۲۵ روپے
منتخب نعتیں۔ ۱۹۸۱-۸۷ء	تابش صدیقی	۲۵ روپے
منتخب افسانے۔ ۱۹۸۰ء	فتح محمد ملک، محمد منشا یاد	۳۰ روپے
مشیّتِ تاریخ	زاہد ملک	۲۵ روپے
منتخب غزلیں۔ ۱۹۸۰ء	ناصر زیدی	۲۵ روپے
منتخب افسانے ۱۹۸۱ء	فتح محمد ملک، محمد منشا یاد	۴۰ روپے